’’چہارسُو‘‘

زندگی کے ساتھ ساتھ
ماہنامہ
چہارسو
راولپنڈی
آخرِ شب
تیز ہوا کا شور
آوازیں
میں ایک زندہ عورت ہوں
رب سچّیا ربّ قدیر
رگوں میں اندھیرا
کانچ کا پُل
اک چہرہ یہ بھی ہے
حلقۂ اربابِ ذوق
کلیاتِ ناسخ (تین جلدوں میں)
صحیفۂ اقبال (اقبالیات)
اقبالیات کی مختلف جہتیں(اقبالیات)
دل کا دروازہ کھلا ہے
بہاؤ الدین زکریا
جو ملے تھے راستے میں
رنجش
کالر پہ نیا پھول
ذکر اُس پری وش کا
داستانِ دل
کنجری کا پُل
ستونت سنگھ کا کالا دن

......روضۃ الاقطاب ......

محترم محمد بولاق نے اول اول اس بحرِ غواص سے موتی چننے کی سعی میں سلسلہ چشتیہ کے بزرگوں کے احوال پر مشتمل گہر ریزے اس طور سمیٹے، اس میں تصوف کے نگینوں کی لڑیاں اس طرح پروئیں کہ اس شجرہ عالیہ کا آغاز اگرچہ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ سے کیا ہے۔لیکن اس کے بعد اپنا شجرہ جو رسولؐ خدا سے شروع ہو کر حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ پر منتج ہے، بھی رقم کیا ہے۔انہوں نے یہ تصوف پارہ فارسی زبان میں تالیف کیا، ا۔اس کی اشاعت اول اور دوم فارسی میں تھی، اشاعت اول کے ناشر، لالہ چرنجی لال ہندوستان تھے جبکہ اشاعت دوئم کے ناشر جگن ناتھ مطبع ''محبِّ ہند'' فیض بازار دہلی ہندوستان تھے۔اشاعتِ سوم اردو میں آخری بار 1309 ہجری دہلی میں طبع ہوئی اور آج ہندوستان و پاکستان میں یہ ناپید ہے۔اس کی اشاعت کی بابت جگن ناتھ یوں رقم طراز ہیں۔

''قبل ازیں یہ کتاب دو مرتبہ فارسی زبان میں طباعت ہوئی۔لالہ چرنجی لال مرحوم (مالک چھاپہ خانہ) نے بڑی تحقیق اور تفتیش سے اس کتاب کو حاصلکر کے خصوصی اہتمام سے چھپوایا۔لالہ چرنجی لال (مرحوم) بزرگان دین اور اولیائے کرام سے بڑی عقیدت رکھتے تھے اور انہیں ہمیشہ اولیائے کرام کی کتب دیکھنے، چھاپنے چھپوانے کا شوق رہا ہے۔لالہ چرنجی لال (مرحوم) کے بعد دوسری بار اس کمترین (جگن ناتھ) نے اس کتاب کو دوسری مرتبہ طباعت کروایا،لیکن اس اشاعت کے بعد جلد ہی اندازہ ہوا کہ فارسی زبان کے قارئین مسلسل کم ہو رہے ہیں اور شائقین زبانِ اردو کی تعداد بڑھ رہی ہے۔چنانچہ راقم مجبور ہوا کہ اس کتاب کو اردو میں ترجمہ کروا کے چھپوائے۔اس طرح اس دُرِ نایاب کا بامحارہ اردو ترجمہ کروا کر اس پر نظر ثانی کی گئی اور پھر تیسری بار یہ کتاب اردو زبان میں شائع ہوئی تا کہ ہر خاص و عام اور اردو دان طبقہ بھی اس سے مستفید ہو سکے۔''

......ایم۔زیڈ۔کنول

اشاعت:۲۰۱۵ء، قیمت:۵۰۰ روپے، دستیابی: تہذیب انٹرنیشنل پبلی کیشنز، لاہور۔

...... وقت کی تلاش ......

مسعود مفتی پاکستان کی افسر شاہی کی نیک نامی کو چندِ آفتاب اور چندِ ماہتاب کرنے والی ایسی شخصیت کا نام ہے جن کا ذکر آتے ہی محسوسات میں تازگی آ جاتی ہے۔آپ نے اردو ادب میں بے جا زباں دانی کے جوہر دکھلانے کے بجائے اپنے گرد و پیش کو کچھ اس انداز میں پیش کیا ہے کہ وہ ادبِ عالیہ ہو کر بھی ہمیں اپنی تاریخ کے سنہرے اوراق نظر آتے ہیں۔''وقت کی تلاش'' مفتی صاحب کی چودہ منتخب کہانیوں کا افسانوی مجموعہ ہے جو اردو ادب کے ہر سنجیدہ قاری اور ناقد کو اس لیے اپنی جانب متوجہ کر رہا ہے کہ اُس کا مرکز پاکستان کا عام آدمی اور اُس کے مسائل ہیں جو یقیناً پڑھنے والے کو وہ سب کچھ بتاتے ہیں جو ہم پر گزر گئی یا گزر رہی ہے یا خدا نا خواستہ گزرنے والی ہے۔کام مشکل مگر مسعود مفتی صاحب کے نباض قلم نے نہایت سادگی اور پُرکاری سے اسے انجام دیا ہے۔ ...... عطیہ سکندر علی

اشاعت:۲۰۱۵ء، قیمت:۲۸۰ روپے، دستیابی: دوست پبلی کیشنز، اسلام آباد۔

...... عالمی اردو ادب ......

اردو ادب میں کچھ لوگ ماہ و سال سے بے پروا علم و ادب کی خدمت میں کچھ اس طرح مصروف ہیں کہ لفظ دیوانگی بھی اُن کی خدمات کو درست طور پر آشکار نہیں کرتی۔عالمی اردو ادب کے مدیر جناب نند کشور وکرم اپنی دُھن میں مگن اردو ادب کے دامن کو اس قدر وسعت اور ہمہ رنگی سے سجا رہے ہیں کہ دیکھ کر حیرت بھی ہوتی ہے اور رشک بھی آتا ہے۔عالمی اردو ادب کا تازہ شمارہ مقبولِ عام ادب نمبر ہے جس میں وکرم صاحب نے اُن تمام نامور اور گمنام لوگوں کی کھوج لگا کر جو اپنے وقت میں شہرت و ناموری کے ساتھ فروخت کے حوالے سے بھی بلند مقام رکھتے تھے۔خواہش کے باوجود ہم یہاں اُن بلند قامت اہلِ قلم کے اسمائے گرامی درج نہیں کر رہے کہ آپ کا اشتیاق باقی رہے اور عالمی اردو ادب کی جستجو کے لیے زیادہ لگن اور تڑپ آپ کے دل میں موجزن ہو جائے۔ ......انوار شریف

اشاعت:۲۰۱۵ء، قیمت مجلد:۴۰۰ روپے، دستیابی: F-14/21-D کرشن نگر، دہلی۔

متاعِ چہارسو

☆

قرطاسِ اعزاز
ڈاکٹر یونس جاوید
کے نام

نوائے طرب

محمد انعام الحق

(راولپنڈی)

نام: ڈاکٹر یونس جاوید
پتہ: ۹۰۳، زیڈ بلاک، فیز تھری، ڈی ایچ اے، لاہور
موبائل: ۰۳۳۳_۴۲۸۶۶۴۷
ای میل: yj@younusjavaid.com
ویب گاہ: www.younusjavaid.com

تعلیم:
۱۔ پی۔ایچ۔ڈی (پنجاب یونیورسٹی)
۲۔ ایم اے اردو ادب (پنجاب یونیورسٹی)

عملی تجربہ:

ٹی وی ڈرامے

نمبرشمار	نام	اقساط	ٹی وی چینل	نوعیت	دورانیہ
۱۔	اندھیرا اُجالا	۶۵	پی ٹی وی	ڈرامہ سیریل	--
۲۔	پت جھڑ	۱۳	پی ٹی وی	ڈرامہ سیریل	--
۳۔	رنجش	۱۳	پی ٹی وی	ڈرامہ سیریل	--
۴۔	خواب عذاب	۱۳	پی ٹی وی	ڈرامہ سیریل	--
۵۔	مٹھی بھر آسمان	۱۴	پی ٹی وی	ڈرامہ سیریل	--
۶۔	کانٹے	۸	پی ٹی وی	ڈرامہ سیریل	--
۷۔	تاحدِ نگاہ	۳	پی ٹی وی	ڈرامہ سیریل	--
۸۔	سِل	۳۰	اے ٹی وی	ڈرامہ سیریل	--
۹۔	شہرِ مُراد	۱۴	پی ٹی وی	ڈرامہ سیریل	--

ٹیلی فلم:
۱۔ نامہربان لمحہ

طویل دورانیے کے کھیل:

نمبرشمار	نام	اقساط	ٹی وی چینل	دورانیہ
۱۔	کانچ کا پُل	۱	پی ٹی وی	۱۲۴منٹ
۲۔	دھوپ دیوار	۱	پی ٹی وی	۱۲۰منٹ
۳۔	ساون دھوپ	۱	پی ٹی وی	۱۰۰منٹ
۴۔	وادیٔ پُرخار	۱	پی ٹی وی	۹۰منٹ
۵۔	پھولوں والا راستہ	۱	پی ٹی وی	۹۰منٹ
۶۔	رنگوں میں اندھیرا	۱	پی ٹی وی	۹۰منٹ
۷۔	سٹیٹس	۱	پی ٹی وی	۹۰منٹ
۸۔	تکمیل	۱	پی ٹی وی	۹۰منٹ
۹۔	ایک محبت کی کہانی	۱	پی ٹی وی	۹۰منٹ
۱۰۔	عشق سے تیرا وجود	۱	پی ٹی وی	۱۰۰منٹ
۱۱۔	زادِ راہ	۱	پی ٹی وی	۹۰منٹ
۱۲۔	صبحِ جمال	۱	پی ٹی وی	۹۰منٹ
۱۳۔	اپنا آسمان	۲	پی ٹی وی	۱۰۰منٹ
۱۴۔	عہدِ وفا	۱	پی ٹی وی	۷۰منٹ
۱۵۔	دیارِ عشق	۱	پی ٹی وی	۷۰منٹ

مختصر کھیل:

نمبرشمار	نام	اقساط	ٹی وی چینل
۱۔	دستک	۱	پی ٹی وی
۲۔	اک چہرہ یہ بھی ہے	۲	پی ٹی وی

پنجابی کھیل:

نمبرشمار	نام	اقساط	ٹی وی چینل
۱۔	کیہہ جاناں میں کون (منو بھائی کے ساتھ)	۳۹	پی ٹی وی
۲۔	اگ تے نروان		پی ٹی وی
۳۔	ماسیاں		پی ٹی وی
۴۔	گلابو نِکّا جیا		پی ٹی وی
۵۔	ماے (انگلو)		

تصانیف:

نمبرشمار	کتاب کا نام	نوعیت
۱۔	آخرِ شب	ناول
۲۔	تیز ہوا کا شور	افسانے
۳۔	آوازیں	افسانے
۴۔	میں ایک زندہ عورت ہوں	افسانے
۵۔	رب سچیا ربّ قدیر	افسانے
۶۔	رگوں میں اندھیرا	داستان
۷۔	کانچ کا پُل	داستان
۸۔	اک چہرہ یہ بھی ہے	آپ بیتی
۹۔	حلقۂ اربابِ ذوق	تحقیق وتنقید
۱۰۔	کلیاتِ ناسخ (تین جلدوں میں)	ترتیب، حواشی
۱۱۔	صحیفۂ اقبال (اقبالیات)	بیاض
۱۲۔	اقبالیات کی مختلف جہتیں (اقبالیات)	بیاض
۱۳۔	دل کا دروازہ کھلا ہے	ناولٹ

۱۴۔	بہاؤالدین زکریا	تصوف
۱۵۔	جو ملے تھے راستے میں	تدوین
۱۶۔	رنجش	سیریل
۱۷۔	کالر پہ نیا پھول	شاعری
۱۸۔	ذکر اُس پری وش کا	خاکے
۱۹۔	داستانِ دل	ناولٹ
۲۰۔	کنجری کا پُل	ناول
۲۱۔	ستونت سنگھ کا کالا دن	ناول

فلمیں:

نمبر شمار	نام	زبان
۱۔	بے نظیر	اردو
۲۔	جوڑا	پنجابی
۳۔	ڈائریکٹ حوالدار	اردو

انعامات واعزازات:

نمبر شمار	اعزاز	ایوارڈ دینے کا مجاز ادارہ	تعداد
۱۔	نیشنل فلم ایوارڈ (ڈائریکٹ حوالدار)	حکومتِ پاکستان	۱
۲۔	پی ٹی وی ایوارڈ (''رگوں میں اندھیرا'' اور ''اندھیر اُجالا'')	حکومت پاکستان اور پی ٹی وی	۲
۳۔	پی ٹی وی سلور جوبلی گولڈ میڈل	پی ٹی وی	۱
۴۔	گریجویٹ ایوارڈ (اندھیرا اجالا، رگوں میں اندھیرا اور دن)	گریجویٹ اکیڈمی	۴
۵۔	ایشین بین الاقوامی ایوارڈ	ایشین بین الاقوامی	۳
۶۔	بلھے شاہ ایوارڈ	بلھے شاہ اکیڈمی، قصور	۱
۷۔	کاروانِ شفقت گولڈ میڈل	کاروانِ شفقت، لاہور	۱
۸۔	فروغِ شفقت ایوارڈ ملتان	فروغِ شفقت ملتان	۱
۹۔	فیملی ڈاکٹرز ایسوسی ایشن ایوارڈ	فیملی ڈاکٹرز ایسوسی ایشن، لاہور	۱
۱۰۔	سدا بہار ایوارڈ	سدا بہار ایسوسی ایشن، لاہور	۱
۱۱۔	روٹیری کلب ایوارڈ	بین الاقوامی روٹیری کلب	۱
۱۲۔	پریس کلب ایوارڈ گجرات	پریس کلب، گجرات	۱
۱۳۔	روزنامہ جنگ مہارت ایوارڈ	روزنامہ جنگ، لاہور	۱
۱۴۔	سیالکوٹ قومی ایوارڈ	سیالکوٹ گروپ	۱
۱۵۔	انجمن شہریاں لاہور ایوارڈ	انجمن شہریاں، لاہور	۱
۱۶۔	مون لائٹ ایوارڈ	مون لائٹ (لاہور اور فیصل آباد)	۲
۱۷۔	پشاور گروپ ایوارڈ	پشاور تاجر گروپ	۱
۱۸۔	پلے فیئر ایوارڈ	بین الاقوامی پلے فیئر	۳
۱۹۔	تمغہ حسن کارکردگی برائے ادب		۱

پیشہ ورانہ خدمات:

۱۔ رکن مطالعہ بورڈ، جی سی یونیورسٹی، لاہور

۲۔ وزیٹنگ پروفیسر برائے شعبہ فلم اور ٹی وی، لاہور (جون ۲۰۰۵ تا جون ۲۰۰۸ء)

۳۔ ڈائریکٹر مجلس ترقیِ ادب، لاہور (جولائی ۲۰۰۴ء تا ستمبر ۲۰۰۴ء)

۴۔ ایڈیٹر ''صحیفہ'' مجلس ترقیِ ادب، لاہور

تحقیق اور مقالہ جات:

۱۔ تحقیق وتنقید ''حلقہ اربابِ ذوق'' مقالہ برائے پی ایچ ڈی

مختلف سکالرز کے میرے اوپر لکھے گئے مقالہ جات:

تحقیقی مقالہ برائے ایم اے

۱۔ جاوید چوہدری (معروف میزبان اور کالم نگار برائے ایکسپریس نیوز)، اسلامیہ یونیورسٹی، بہاولپور

۲۔ سمرینہ سعید، اسلامیہ یونیورسٹی، بہاولپور

۳۔ ثانیہ اقبال، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، لاہور

تحقیقی مقالہ برائے ایم فل

۱۔ پروفیسر احمد بخش، ملتان یونیورسٹی، ملتان

''بوتل کا جن''

یونس جاوید کے بارے میں کوئی مجھ سے بات کرتا ہے تو میں سُنی اَن سنی کر دیتا ہوں۔ ایک انسان دوسرے انسان کے بارے میں تو رائے قائم کر سکتا ہے مگر کسی جن کے بارے میں اُس وقت تک کوئی رائے نہیں دے سکتا جب تک وہ جن اس نے بوتل میں بند نہ کیا ہو۔ جبکہ یونس جاوید ایسا جن ہے جو خود بوتل میں بند ہونے کے بجائے قاری اور ناظر کو کچھ اس طرح بوتل میں بند کرتا ہے کہ آدمی خود کو بونا سمجھنے لگتا ہے۔ اب آپ کی مرضی ہے آپ اِسے یونس جاوید کی اچھائی کے زمرے میں شمار کریں یا بُرائی کے کھاتے میں ڈالیں۔

شوکت صدیقی

جوگی

ڈاکٹر یونس جاوید

ممتاز مفتی نے لکھا ہے"احمد بشیر کی شخصیت کے شالا مار کے کسی پوشیدہ حجرے میں ایک سور رہتا ہے۔" مفتی صاحب نے یہ بات تقریباً پینتیس سال پہلے لکھی تھی اس وقت کے احمد بشیر اور آج کے احمد بشیر میں دریا اور سمندر کا فرق ہے۔ میں نے پوشیدہ حجرے کے سور کا پیچھا نہیں کیا۔ اس لیے کہ مجھے ایک معصوم بچے، ایک تجسس بھرے نوجوان اور مضطرب مدبر کے ہوتے ہوئے کسی سور کی ضرورت نہیں تھی۔ یہ مضطرب مدبر، متجسس نوجوان اور معصوم بچہ، خود کبھی تحیر کا شکار نہیں ہوتا۔ دوسروں کو کرتا ہے، البتہ حقیقت کی پرتیں اتارنے کے لیے وہ خوشاب کے ایڈووکیٹ کے توسط سے مسجد میں دیا جلانے والے بزرگ تک پہنچتا ہے اور پھر ان کی ہدایت پر بورے والا کے موچی محلّہ کے آغا تک بھی جاتا ہے اور ہار نہیں مانتا۔۔۔ہار نہ ماننا ہی اس کا اصل پیشہ ہے۔

مفتی صاحب کے بقول احمد بشیر کی شخصیت خواب آلودہ ہے۔ درست! مگر ایسا خواب جس کی تعبیر بشارت بن کر اس کی شخصیت کا احاطہ کیے رہتی ہے۔۔۔اور وہ لمحہ لمحہ بدلتا رہتا ہے۔ کبھی کندن، کبھی تابنا، کبھی بھٹی سے نکلا ہوا سرخ انگارہ لوہا۔ وہ جو کچھ بھی ہے، سامنے ہے، کھرا ہے۔

اس کی ذات میں نہ تو مختلف منکے ہیں نہ وہ آستین میں رومال ڈال کر پانی نکالتا ہے لہٰذا ہم اس کی شخصیت کو شالا مار کے حجرے کی پراسراریت سے بریکٹ نہیں کر سکتے۔ پراسرار تو وہ ہے ہی نہیں۔ وہ تو بنوٹ کا کھلاڑی ہے۔ پورے داؤ پیچ کے ساتھ۔ تبھی تو اس کی آواز میں بناوٹ کا ضعف نہیں، اعتماد کی کھنک ہے۔ یہ کھنک اسے سچائی اور اس علم نے دے رکھی ہے۔ جس نے اسے اعتبار بخشا ہے۔ وہ کھوٹے کو جانتا ہے اور کھرے کو پہچانتا ہے۔ اس لیے کبھی اس کے ہاتھ میں جسارت کا ڈنڈا ہوتا ہے کبھی جرأت کا پتھر۔ بھلے سے، سر پھٹے، شریانیں ٹوٹیں، جگر خون ہو۔ یا دوسرا الیر ولیر۔ اسے پروا نام کی کسی چڑیا سے واسطہ نہیں۔ ہاں البتہ خوابوں سے اس کی جھولی کبھی خالی نہیں ہوئی۔ مارشل لاء کے لگ بھگ گیارہ سال اس نے ٹی ہاؤس کی میز پر ہمیں ایک سے ایک بڑھیا خواب ہی تو دکھایا اور گرمایا ہے۔ وہ ہر شام، جلد صبح ہونے کی نوید سے سب کے دلوں کو مسرت و انبساط سے ہمکنار کرتا تھا۔ نئی سے نئی دلیل کے ساتھ کہ حوصلہ نہ ٹوٹے۔ ہر شام یہی لگتا تھا کہ دوسری صبح، جبر اس وطن ہی سے کیا۔ پوری دنیا سے اٹھ جائے گا اور جنت کے جس خواب کو ہر سوچنے والا بنتا رہتا ہے۔ صبح ہونے سے پہلے ہی اسے دیکھ لے گا۔ مگر ایسا کبھی نہ ہوا۔ شرابی کی صبح کی توبہ۔ شام کو ٹوٹتی ہے۔ ہمارے شام کے خواب صبح تک بکھر جاتے تھے۔ دوسرے دن پھر سے نیا تجزیہ۔

ایک مرتبہ تو احمد بشیر نے تیسری عالمی جنگ کی خبر، خوبصورت نوید کی صورت میں ڈھال دی اور کہا"میں جنگ سے نہیں ڈرتا۔ ڈرنے والی کوئی بات ہی نہیں۔ ڈرنا ہو تو قحط سے ڈرو کہ اس سے مجھے بھی خوف آتا ہے مگر تیسری عالمی جنگ ہمارے لیے نجات کا راستہ ہے۔" اس نے تاریخ تک دے دی۔ اس کا آغاز ایشیا سے کیا۔ ہم سب جو بیزاری کے اس دور میں کسی بھی عالمی جنگ کے نقصانات سے لاپروا اور بے خوف تھے اس جنگ کے حامی ہو گئے کہ چلو کوئی تبدیلی ، کوئی انقلاب، کوئی چھان پھٹک تو ہو گی، ہم ہوں نہ ہوں مگر ہمارے بعد آنے والوں کو ہی شاید یہ جنگ آکاس بیل سے چھڑا دے۔ لہٰذا آنے والی نسل کے لیے یہ ہمارا اجتماعی خواب تھا۔ سو ہر کوئی دن گننے لگا۔ خدا خدا کر کے وہ دن آیا۔ اور خاموشی سے گذر گیا اور دور تک جنگ کے آثار تو کیا دلوں میں وہم تک نہ اترا۔ اس شام ہر کسی نے بے قراری سے احمد بشیر کا انتظار کیا۔ اور اس کے داخل ہوتے ہی سب اس پر پل پڑے۔ سوالات کی بوچھاڑ میں وہ نہا گیا۔ مگر وہ سکون سے بیٹھا رہا۔ اطمینان سے سانس لیا پانی کا گلاس اٹھایا غٹ سے پی گیا اور بولا"میں نے عالمی فوجیں تو آمنے سامنے کھڑی کروا دی ہیں اب اگر وہ نہیں لڑتے۔ تو ان کی حرام زدگی ہے میں کیا کروں؟"

احمد بشیر ایمن آباد کا پہلا شخص ہے جس نے دولت جمع کرنے کے جنون کو کھرچ کر اپنی ذات سے الگ کر دیا۔ کیونکہ سچ پر پردہ ڈالنے کا گر اسے آتا نہیں۔ سچ میں ملاوٹ تو اسے زہر لگتی ہے اسی واسطے اس کا سچ دوہرا کڑوا ہوتا ہے اور وہ خود پردے پھاڑ کر اپنی تکمیل کرتا ہے۔ کسی سچ کو لکھتے ہوئے یا سب کے سامنے میز پر انڈیلتے ہوئے احمد بشیر کا سینہ تفاخر سے پھول جاتا ہے اور وہ کسی ہنر مند کی طرح بنوٹ کے کرتب دکھاتا ہوا مخاطب کو زیر اور خود کو زبر کرتا چلا جاتا ہے اور اس پر، سب کی داد بھی نہیں چاہتا۔ صرف یہ چاہتا ہے کہ اسے سنا جائے، سمجھا جائے۔ مخاطب کے دل میں اٹھنے والے ہر سوال کا جواب اس کے پاس پہلے سے موجود ہوتا ہے۔ ہاں مگر یاد آیا یہ تو بہت پہلے کی بات تھی۔ اب تو وہ بنوٹ کھیلتے کھیلتے زیر بھی ہو جاتا ہے۔ میں نے اسے الطاف قریشی اور سلیم شاہد جیسے اپنے جونیئرز جنہوں نے احمد بشیر کی گفتگو سن کر سیکھا بھی ہے اور سمجھا بھی، سے اتفاق کرتے ہی نہیں دیکھا۔ بلکہ پاؤں سمیٹ کر اپنے خول میں واپس آتے بھی دیکھا ہے۔ شاید وہ تھک جاتا ہے یا شاید دلیل، دلیل سے نہیں کٹ رہی ہوتی۔ اور سلیم شاہد کی ضد تو دلیل کے باپ سے بھی نہیں کٹتی۔ ضد کا پس منظر، برسوں کے ٹوٹتے خواب سہی مگر ضد تو ضد ہے۔ جسے کوئی دلیل نہیں کاٹ سکتی۔ اسی باعث جب ایسا لمحہ آئے تو احمد بشیر بحث سے گریز چاہتا ہے یا پھر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ سمجھتا ہو اس کے علاوہ کسی کا انٹینا ہی درست نہیں اگر تصویر دھندلی یا ڈراؤنی دکھائی دے تو وہ کیا کرے۔

جیسا کہ پہلے ذکر کر چکا ہوں احمد بشیر کو میں نے کسی سے ڈرتے نہیں دیکھا۔مگر قحط سے وہ ڈرتا ہی نہیں سب کو ڈراتا بھی ہے۔اس کا کہنا ہے کہ جنگ ہمارا تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتی، قحط تمہاری تاریخ، تمہارا جغرافیہ، تمہارا اندر باہر سب کچھ بدل سکتا ہے اس سے ڈرو اس کے خلاف جہاد کرو، علم سے، عمل سے، خبر سے، لوگوں کو ایجوکیٹ کر کے، برابری پیدا کر کے اور آبادی کے دباؤ کو روکنے کے لیے احساس ذمہ داری کو پھیلا کر۔اور صدیوں سے خون چوسنے والے ان خونیوں سے چھٹکارا پا کر جواب جنونیوں کی صف میں شامل ہو چکے ہیں۔مگر ہم سب کی طرح اس کا بھی یہ بس خواب ہی ہے۔

اس طرح کے سب خواب یعنی تبدیلی کے خواب، آسودگی کے خواب، انقلاب کے خواب دکھا دکھا کر اس نے سب کو نڈھال کر رکھا ہے مگر اس کی رائے انقلاب کی طرح گزشتہ کئی برسوں سے شاہدرہ موڑ سے آگے نہیں بڑھی۔ اب تو مجھے یقین ہو چکا ہے کہ اس خوبصورت صبح کا خواب اس کی زندگی میں تعبیر دے گا نہ میری زندگی میں نہ میرے بچوں کی زندگی میں۔

یہیں مفتی صاحب کی یہ بات درست دکھائی دینے لگتی ہے کہ آج کا احمد بشیر اجنبی لگتا ہے۔حالانکہ ممتاز مفتی اس احمد بشیر کو یاد کر رہا ہے جس کی بوٹی بوٹی تھرکتی تھی۔لہو ہر پل ابلتا تھا۔اور جو کبھی لڑنے میں ہی اس کی زندگی تھی۔مگر مفتی صاحب نے تو ۱۹۶۰ء کے احمد بشیر کو بوسیدہ مرقد کہہ دیا تھا۔اس اضافے کے ساتھ کہ ابھی مدہم سی لو موجود ہے۔اس لو کو مفتی صاحب نے احمد بشیر کی کنجی کہا تھا۔آج ۱۹۹۵ء ہے میں نے احمد بشیر کو بوسیدہ مرقد کے روپ میں نہیں دیکھا۔وہ اب بھی بھڑک بھڑک اٹھتا اور ابل ابل پڑتا ہے۔اس میں لو ہی نہیں شعلہ بھی ہے مگر آنچ ذرا سی مدھم ہے، ہو سکتا ہے اس نے اپنے خصوصی طاقچے مقفل کر کے چابی کو گلے کا لاکٹ بنا لیا ہو۔مگر یہ اٹل ہے کہ جب کوئی اس چابی کو چھو لیتا ہے تو احمد بشیر کوئی دوسرا احمد بشیر ہوتا ہے جو اپنے تمام طاقچے اور ان کے سارے دروازے کھولتا ہی نہیں۔خود کھولتا ہے اور پورے طنطنے سے سب کچھ الٹ پلٹ کرتا ہوا اپنی بے ترتیب عالمانہ شہادتوں کو ایک ایک کر کے چن چن کر پہلے میز پر ترتیب سے سجا دیتا ہے۔اور جب کوئی معقول انٹینا نہیں ملتا تو ٹھوکر مار کر ساری ترتیب کو رلا ملا دیتا ہے مجھے اس وقت احمد بشیر اس معصوم بچے کی طرح لگتا ہے جو گھروندے بنا چکنے کے بعد لات مار کر بکھیر دیتا ہے۔

احمد بشیر مکان اور گھروندے کے سلسلے میں انگریزی کے اس مقولے پر ہمیشہ سے عمل کر رہا ہے کہ مکان بنانے والا یعنی مالک بے وقوف اور اس میں رہنے والا (یعنی کرائے دار) عقل مند ہے۔اپنی عقل مندی کو ثابت کرنے کے لیے عمر اس نے کرایہ دار کی حیثیت سے گزار دی ہے مکان کا جھنجٹ اس نے پالا ہی نہیں۔وہ تو بھلا ہو ڈاکٹر صفدر محمود کا کہ انہوں نے ''محبت'' کی خاطر پلاٹ کے کاغذات اس کے گھر پر چھوڑ دیئے مگر احمد بشیر نے تب بھی مکان نہ بنایا۔سنتے ہیں اس نے اسے بیچ کر بیٹے کی شادی کر دی۔حیرت تو یہ ہے کہ شادی کے لیے پلاٹ بیچنے کی ضرورت کیا تھی۔جب کہ اس کے بیٹے کی شادی کا کل خرچ ۴۵۰ روپے تھا جس میں دو سو مولوی صاحب نے لیے تھے اسی طرح بشریٰ انصاری کی شادی پر کل چھ ہزار خرچ آیا تھا۔نیلم احمد بشیر کے لیے انہوں نے دفتر سے کچھ رقم ایڈوانس لی تھی البتہ قلزم کی شادی بیس ہزار روپے میں اور سنبل کی پچاس ہزار میں مکمل ہوئی تھی۔مگر یہ پچاس ہزار بھی یوں ہوئے کہ احمد بشیر نے اپنے محکمے کے لیے کوئی فلم بنائی تھی۔یہ محکمہ چونکہ قدرت اللہ شہاب ہی کے ماتحت تھا انہوں نے بشیر صاحب کو پچیس ہزار بونس دلوایا یا یوں کہیے کہ شہاب صاحب نے سرخ فیتے سے احمد بشیر کے بونس کو بچا لیا اور یوں یہ رقم ان کے حصے میں آ گئی۔

ان سب شادیوں پر احمد بشیر خوش اور مطمئن ہے ان کا اپنا کہنا ہے کہ اتنا کم خرچ کرنے اور کم لوگوں کو مدعو کرنے کے باوجود رشتہ دار ناراض نہیں ہوئے جو ان کی شرافت اور نیکی کی دلیل ہے اور دوسری قابل اطمینان بات یہ ہے کہ دامادوں نے مجھے یا اپنی بیویوں کو طعنہ نہیں دیا البتہ بیٹے کی شادی کے لیے رقم اس قدر کم تھی کہ اس کا ولیمہ نہ ہو سکا تھا۔ظاہر ہے کیسے ہو سکتا تھا۔

مگر احمد بشیر نے اس بات کا افسوس نہیں کیا۔شاید ایسا کر کے احمد بشیر نے نیلا پربت سے ہونے والے گھاٹے کو پورا کرنے کی کوشش کی ہو مگر نیلا پربت کا گھاٹا پورا نہ ہوا۔

ہر چند کہ نیلا پربت گھاٹے کا سودا نہیں تھا۔اب بھی بڑے بڑے جغادریوں کو میں نے اس کا ویڈیو چلا کر دیکھتے اور سیکھتے دیکھا ہے۔فلم انڈسٹری میں وہ جس طمطراق سے داخل ہوا تھا اسی طنطنے سے واپس نکل آیا۔کہ ساری فلم انڈسٹری کسی نئے خیال، کسی نئے جذبے یا کسی نئی تکنیک کی متحمل نہیں ہو سکتی۔اس میں منٹو صاحب سے، احمد ندیم قاسمی صاحب تک اور اشفاق احمد صاحب سے احمد بشیر تک سبھی ناکام ہوئے یا ناکام قرار دیئے گئے یا ان لوگوں نے فلم انڈسٹری کو مسترد کر دیا کہ کم دنوں میں، خواہ اس کے لیے وی سی آر کا سہارا ہی کیوں نہ لیا گیا ہو۔فلم کا بزنس ہی اس کا معیار ٹھہرا ہے۔پرافٹ کی رقم اتنی زیادہ ہونی چاہیے کہ فلمساز۔۔۔سٹوڈیو اونر بن جائے۔۔۔یا اس قابل ہو جائے۔

یہ وہ معیار ہے کہ اس پر احمد بشیر ہی کیا آرٹ کا ہر ہنرمند، ذہین، باریک بیں اور نکتہ سنج ناکام ونامراد ٹھہر سکتا ہے۔بلاشبہ میری نظر میں احمد بشیر ٹلہ جوگیاں (ا) کا کوئی ایسا جوگی ہے جو جوگی سے یوگی ہونے کے درمیانی سفر میں اپنے ساتھیوں سے بچھڑ گیا تھا۔اور آج تک بچھڑا ہوا ہے۔

اسے جن نئی دنیاؤں کی تلاش تھی۔تب سے اب تک وہ تلاش جاری ہے بقول اپنے وہ مقامی مہاجر ہے۔جس کی وضاحت اس نے خود کی ہے یعنی ازل سے مہاجر۔وہ ابھی تک کسی مدینے کی تلاش میں ہے، بمبئے، کلکتہ، دہلی، الہ آباد، پٹنہ، بنارس اور آسام کی ترائیوں میں بھٹکنے کے باوجود وہ ابھی تک راستے میں ہے۔اس نے درست لکھا ہے کہ ''راستے میں سبھی کو رہنا پڑتا ہے کوئی کہیں بھی نہیں پہنچتا'' اس لیے اسے ایک سدا بہار آوارہ گرد کہا جا سکتا ہے اسی آوارہ گردی کے دروازے سے داخل ہو کر وہ صحافی بنا اور ایسا بنا کہ پھر اس راج دھانی کی فصیل

سے باہر نہ نکل سکا۔ وہ نڈر، بے باک، بے خوف اور کسی حد تک پھکّڑ بھی ہے۔ دیکھنے کو اس کا گھر بار بھی ہے، پروگرامز بھی ہیں۔ اور زندگی گزارنے کا دہقانی انداز بھی ہے جو اسے پسند ہے۔ میں نے اس کا یہ انداز اس وقت دیکھا تھا جب میں نیا نیا غالباً دوسری مرتبہ ٹی ہاؤس میں ادیبوں کو دیکھنے ان کی گفتگو سننے اور انہیں سمجھنے کے لیے داخل ہوا تھا میں نے دیکھا سامنے کی دیوار جہاں قائداعظم کی تصویر لگی ہے اس کے بالکل نیچے ایک شخص۔۔۔ ایک ٹھیک ٹھاک اور مدبر ادیب کی دھجیاں بکھیر رہا ہے وہ شخص جس پیڈسٹل سے بول رہا تھا وہ بہت اونچا تھا۔ مگر اس کے پاس دلائل تھے۔ جوابات تھے بولنے کی تیزی تھی کہ دوسرا جواب کیا دے۔ سانس بھی نہ لے سکے۔ لیکن اگر دلائل تھے تو پھر اتنا اکھڑ پن کیوں تھا؟ دھونس کیوں تھی۔ ماں باپ کی ایسی تیسی کرنے کی ضرورت کیا تھی؟ میں پریشان ہو گیا ظاہر ہے میں نیا نیا ٹی ہاؤس میں داخل ہوا تھا۔ ہر ادیب میرے لیے ماڈل اور آئیڈیل تھا اور ٹی ہاؤس کو میں نے ایسا جزیرہ سمجھ رکھا تھا جس میں آلودہ ہوا، تاریکی، زبان کی غلاظت اور غیبتوں کا زہر نہ تھا (حالانکہ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ اجناس تو بہ افراط یہاں ملتی ہیں۔)

بہر حال وہ اجنبی شخص کسی تواتر اور طنطنے سے میرے شیشے کے جھروکوں کو چکنا چور کرتا چلا گیا اور دل میں اس کے علم اور اس کے ڈنڈ پٹ کا کچھ ایسا رعب اور دبدبہ پیدا ہوا کہ میں منمنا بھی نہ سکا۔ اس نے دس پندرہ منٹ چومکھی تلوار چلا کر سب کو ڈھیر کر دیا تھا۔ لگتا یہ تھا کہ ہر اعتراض اور ہر دلیل کا گھڑا گھڑایا جواب اس کے اندر سے تیار شدہ مال کی طرح کھٹاک سے دوسرے کے منہ پر آ لگتا ہے اور احمد بشیر تو صرف ہونٹ ہلاتا ہے۔ اس کی باتوں میں انکشاف کے درجے کی خبر تھی۔ موضوعات پر اس کے یقین کی گرفت بے حد مضبوط تھی۔ لہجے سے چہرے تک زہر بھری طنزیہ مسکراہٹ جھلکتی تھی۔ کٹا کٹ وہ مختلف موضوعات پر بغیر کیس جھجک اور بناوٹ کے کشتوں کے پشتے لگا رہا تھا۔ یہ سب اس کے باعلم ہونے کا ثبوت سہی پر مجھے احمد بشیر اپنے پھکّڑ پن اور صاف گوئی کی بدولت ذرا اچھا نہ لگا۔ عجیب بات تو یہ ہے کہ اسے اس کی پروا بھی نہیں تھی۔ اس نے کسی دوسرے کی طرف دیکھا بھی نہیں تھا۔ وہ تو اپنے سامنے بیٹھے ادیب کو چاروں شانے چت گرانے میں ہی مصروف رہا اور ایسا کر کے فاتحانہ انداز میں کچھ ایسے مسکرایا کہ گردن فخر سے تن گئی اور پھر بے تکلفی سے کھل اٹھا کہ لگا اس کے دل میں تو ملال ہے ہی نہیں۔ پھر وہ یک لخت اٹھا اور چلا گیا۔

کمال آدمی ہے۔ میں نے یہی سوچا تھا۔ مگر میں نے یہ بھی سوچا تھا کہ ملال یا نفرت نہیں تھی تو پھر کف کیوں اڑ رہے تھے؟ ماں بہن ایک کیوں کی جا رہی تھی؟ یلغار کیسی تھی۔۔۔ اور زبان ہر لحہ کمان پہ کیوں چڑھی رہی؟ اس کے جانے کے بعد پانچ سات منٹ خاموشی رہی، پھر دیر بعد ہر شخص نے جیسے اپنے آپ سے سرگوشی کی۔ ''واہیات'' کم از کم سر جھٹک کر بے آواز سی سرگوشی میں یہی لفظ فٹ ہوتا تھا۔ جو صرف میں نے سنی۔ اور میں دیر تک۔۔۔ اور پھر دنوں تک اس عجیب شخص کے بارے میں سوچتا رہا اور پھر اسے بھول گیا۔

پھر یوں ہوا۔۔۔ کہ طویل دورانیے کے کھیلوں کا آغاز میرے مشہور ڈرامے ''کانچ کاپُل'' سے ہوا یہ ستمبر ۸۱ء تھا ڈرامہ چلنے کے ہفتہ عشرہ بعد احمد بشیر ٹی ہاؤس میں وارد ہوا۔ میں دروازے کے ساتھ والی میز پر دوستوں کے ساتھ بیٹھا تھا اس نے آتے ہی میری طرف رخ باندھا۔ اور تقریباً گرجا۔

''کانچ کاپُل'' کھڑے ہو جاؤ۔

میں سُن ہو گیا۔

''اٹھو'' اس نے دھاڑ کر کہا۔ میں اُٹھا تو اس نے میرا ماتھا چوم کر گلے لگا لیا۔ مجھے خود بھی یقین نہ آیا کہ میں کانپ رہا ہوں۔ جب اس نے کہا۔ ''تم نے بہترین کھیل لکھا ہے۔'' اس نے پانچ چھ تعریفی کلمات کہنے کے بعد کسی انگریزی کالمسٹ کو بے نقط سنائیں۔ بعد میں معلوم ہوا کہ اس ذہین ترین کالمسٹ نے ڈرامے کی بے حد تعریف کی تھی۔ مگر رائٹر کا نام نہ لکھا تھا۔

احمد بشیر بولا۔ ''میں خود اس کے پاس جاؤں گا اور اس سے لڑوں گا۔''

(بعد میں معلوم ہوا کہ احمد بشیر اس کالمسٹ سے ملا تھا اور بس۔۔۔ کچھ کہنے کی کیا ضرورت ہے)

پھر احمد بشیر سے ہم سب بھیگتے چلے گئے کہ وہ روزانہ ہی ہماری میز پر بیٹھنے لگا تھا۔ اس دوران میں اس نے مجھے اپنی فلم ''نیلا پربت'' کی کہانی اور ہدایت کاری کی تفصیلات سنائیں تو مجھے وہ ذہین ترین معصوم بچہ دکھائی دینے لگا۔ افسوس کہ میں اس فلم کو ابھی تک نہیں دیکھ سکا۔ مگر مجھے اس کی کہی ہوئی ہر بات کی صداقت پر یقین ہے کیونکہ میں نے اسے۔۔۔ چند سالوں کی رفاقت میں، جو ٹی ہاؤس تک محدود تھی، دانستہ جھوٹ بولتے نہیں سنا۔ اور یہی بات اکثر اس کے حالات زیر زبر بھی کرتی رہی ہے مگر وہ بزرگی میں بھی کھلنڈرا اور لاپروا ہے۔ اسے کسی کا لحاظ کرنا نہیں آتا۔ جو سچ ہے وہ ہے۔ اولاد جس سے اسے بے پناہ محبت ہے، بیوی جسے اس نے ہمیشہ توقیر سے یاد کیا ہے۔ بہن، دوست، سنگھی، ساتھی، بڑے چھوٹے یا اس کی اپنی ذات، میں نے اسے ترازو ہاتھ میں لیتے اور تولتے دیکھا ہے۔۔۔ ڈنڈی مارتے نہیں دیکھا۔ وہ کھری کھری لکھتا بھی ہے کہتا بھی ہے۔ اس لیے میں نے سوچا کہ اس کی تھوڑی سی کھری باتوں کو جمع کر دوں۔۔۔ یہ خیال آرزو بنا اور تنبو کی طرح دل میں تن گیا اور بہت دن بیت گئے۔ اب ٹھیک طرح سے یاد نہیں کہ ذکر کس نے کیا تھا مگر یہ ذکر انتظار حسین کے اس کالم کا تھا جس کا کبھی بڑا چرچا تھا۔ سنا ہے ان دنوں ٹی ہاؤس کی ہر میز پر اسی کالم کا ذکر ہوتا تھا جو اس تقریب کے بارے میں تھا جو کشور ناہید کے متعلق تھی اور جس میں احمد بشیر نے کشور پر ایک خاکہ پڑھا تھا۔

تقریب راستے میں رہ گئی مگر کالم موضوع بحث کچھ اس طرح سے بن گیا کہ یوسف کامران کوشش کے باوجود خود پر قابو نہ رکھ سکا (اللہ اس کی روح کو

آسودہ کرے) انتظار حسین سے لڑنے تک کے لیے تیار ہو گیا۔ وہ یوسف جو اختلاف کو روشن لکیر سمجھتا تھا وہ بھی۔۔۔! یوسف بے حد پیارا، صلح جو۔۔۔ بڑوں سے محبت کرنے والا۔۔۔ چھوٹوں سے شفقت کرنے والا، شاہ خرچ، کھانوں کا رسیا، باتوں کو الجھانے اور پھر سلجھانے کا چسکولا، وہ تو شہزادہ تھا۔ اس نے بعض ادیبوں کے کڑکی کے زمانے میں ان کی بہت حوصلہ افزائی، مدد اور پذیرائی کی۔ کھانے سے شراب تک جو اس کے پاس ہوتا وہ پیش کر دیتا۔ میں شرابی تھا نہ ہوں۔۔۔ اس لیے میں نے ان محفلوں کو ہوش میں دیکھ لیا ہے اسی لیے یاد بھی رکھا ہے۔ شرابی ہوتا تو بھول چکا ہوتا۔

ہاں یہ بھی یاد ہے۔۔۔ کہ یوسف بچوں کی طرح معصوم اور شرارتی تھا اس نے شرارت کی تو مزاح کے لیے، مخول کے لیے، مزے کے لیے، کسی پر استہزا نہیں کیا۔ وہ کمتر سے کمترین بلکہ کمینے شخص تک کی بھی عزت کرتا ہوا دیکھا گیا اس لیے جی چاہا تھا کہ اس کا ذکر کیے بغیر یہاں سے نہ گزروں۔

میری آنکھیں آج بھی اس کے لیے نم ہیں۔۔۔

آج اردگرد کی بے مروتی، منافقت، تعصب، جہالت اور برتری کی لڑائیوں اور غیبتوں کو دیکھتا ہوں تو وہ زیادہ یاد آتا ہے۔ ایسا شخص کتنا ضروری اور کس قدر ضروری دکھائی دیتا ہے جو ان چھوٹی، سطحی اور دلوں کو دیمک کی طرح چاٹ جانے والی برائیوں کے خلاف حتی الامکان جہاد کرے۔۔۔ ہاتھ سے۔۔۔ زبان سے اور کبھی کبھی صرف دل ہی میں جہالت سے نفرت کر کے۔

بہرحال میں یہ جاننے کو تیار نہ تھا کہ یوسف کامران جیسا متحمل اتنی سنجیدگی سے لڑنے (بقول شخصے لڑنے مرنے) پر آمادہ ہو سکتا ہے۔ لیکن واقعہ یہی تھا۔ ایک روز لوگوں نے اسے سخت غصے میں ہوا میں گالیاں اچھالتے سنا تو انہیں یقین آ گیا کہ وہ کشور سے بے پناہ محبت کرتا ہے اس غیر معمولی غصے کی وجہ، وہی کشور کا خاکہ تھا جس پر انتظار حسین نے کالم باندھا تھا۔ سب کے لیے حیرت کا باعث یہ تھا کہ اس ساری لڑائی میں خاکہ نگار کا ذکر کم کم تھا سارا ملبہ کالم نگار پہ ڈالا گیا تھا۔ بعد میں یوسف کے بقول کھلا کہ خاکہ تو سو دو سو نے سنا تھا کالم رات بھر میں ہزاروں تک پہنچ گیا اور وہ کچھ غارت کر گیا جو شاید خاکہ بھی نہ کر سکا تھا۔

بس۔۔۔ اسی دن سے جستجو تھی کہ پہلے کالم پھر خاکہ پڑھوں کالم تو جوں توں حاصل ہو گیا۔۔۔ پڑھ بھی لیا۔۔۔ مگر خاکہ دستیاب ہوا نہ کہیں چھپا۔ میں بھی اس قصے کو بھول چکا تھا کہ احمد بشیر کا دوسرا جنم ہو گیا۔ وہ مسلسل اور مستقل مزاجی سے ٹی ہاؤس میں آنے لگے اور دروازے کے ساتھ والی میز پر ہمارے ساتھ بیٹھنے لگے۔۔۔ یا یوں کہیے کہ ضیاء مارشل لاء پہ ان کے تجزیے نے ہمیں ان کے اردگرد جمع کر دیا تھا۔ (۲)

احمد بشیر ہر روز کوئی نہ کوئی پیش گوئی کر کے ہمارے دلوں میں تسکین اتارنے لگا۔۔۔ پیش گوئی تو ان کے کسی کرم فرما کی ہوتی تھی جو علم جعفر کے ماہر تھے اور ملتان میں تھے۔ مگر علم جعفر کے ماہر کے کسی جملے کو معنی احمد بشیر ہی پہناتا تھا اور اس کے بعد اس کا تبصرہ ہمارے دلوں میں روشن مہتابی چھوڑ دیتا۔ پھر ہمارے اندر جڑیں پکڑتی ہوئی مایوسی دم توڑنے لگتی۔ مارشل لاء کے گیارہ برسوں میں شاید ہی کوئی دن ایسا گزرا ہو جب اس نے ہمیں یقین سے مالا مال کر کے گھر نہ بھیجا ہو۔ کہ بس دوسرا دن مارشل لاء کے خاتمے کا دن ہے۔ جمہوریت کا سورج طلوع ہو گا۔ زندگی لوٹ کر آئے گی اور جب ایسا نہ ہوتا نظر نہ آیا۔۔۔ تو انہوں نے تھرڈ ورلڈ وار کا چکر چلا دیا۔۔۔ (پیچھے کہیں ذکر کر چکا ہوں)

اور اس طرح ہماری زندگیوں کا بہترین حصہ امید، ناامیدی، انتظار، تجسس اور تجزیوں کی نذر ہو گیا۔ ہم ہر روز دیوار چاٹتے تھے۔۔۔ اور دوسرے دن وہیں، ویسی کی ویسی ہوتی تھی۔ لیکن احمد بشیر کا دم کتنا غنیمت تھا کہ اس نے اتنا عرصہ ہمیں مفلوج ہونے سے بچائے رکھا۔ وہ مارشل لاء سے زیادہ ان لوگوں پر بھی تنقید کرتا تھا جو مارشل لاء کے لیے جواز فراہم کرتے تھے۔۔۔ یا کر رہے تھے۔ ان لوگوں میں ایسے لوگوں پر وہ زیادہ برستا تھا جنہیں وہ اپنے قبیلے کے منحرف لوگ کہتا تھا اور وہ یہ بھی کہتا تھا کہ میرا قبیلہ سچ بولنے والوں کا ہے جو ایسا نہیں کرتا نہ وہ میرے ساتھ ہے۔۔۔ نہ میں اس کے ساتھ ہوں نہ ہی وہ میرے قبیلے سے ہے اور نہ ہی آنے والا کل اس کے ساتھ ہو گا۔ اس کی باتیں، تجزیے، کالم اور زندگی آمیز تسلیاں ہی مجھے رسم و راہ سے بہت آگے کی دنیا میں لے آئیں۔۔۔ جس کی ایک وجہ میرا بہتر سامع ہونا بھی تھا۔ پھر ان سے اکیلے بھی مکالمہ ہونے لگا۔۔۔ اور قربت اتنی بڑھی کہ میں نے کشور کا خاکہ کسی طریقے سے حاصل کر لیا۔ گویا میں نے اپنے کام کی بنیادی اینٹ حاصل کر لی تھی۔ یہ خاکہ یقیناً اس ٹائپ مشین پر ٹائپ کیا گیا تھا جو پہلے پہل اردو ٹائپ کے لیے ایجاد کی گئی ہو گی، مگر نامکمل اور ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں بدخط ٹائپ کا مجھے یہ فائدہ ہوا کہ میں نے ہر ہر حرف غور سے پڑھا۔ اور ہر ہر لفظ کو مکمل بھی کیا اور محفوظ بھی ہوا۔ پھر اسے نئے سرے سے ٹائپ کروا کر سنبھال لیا۔

اس خاکے کی عجیب شہرت تھی کہ ہر کوئی اسے حاصل کرنا چاہتا تھا۔ لندن سے لاہور تک اکثر اہل دل نے مجھ سے رابطہ کیا اور ایک مرتبہ تو حمید اختر صاحب جو لندن سے لوٹے تھے افتخار عارف کا پیغام بھی مجھے دے گئے کہ اس خاکے کی کاپی لندن بھجوائی جائے مگر ایسا نہ کر کے میں نے اس خاکے کو ضائع ہونے سے بچائے رکھا۔ میں چاہتا تھا کہ احمد بشیر کے باقی کام کو جمع کر کے کچھ کیا جائے۔ سو میں اس کام کے لیے جو بعد میں ایک مشکل کام ثابت ہوا، ایسی ایسی لائبریریوں کے بند شیلفوں میں جھانکا جن میں قدم رکھنے کا ارادہ تھا نہ مقدر۔۔۔ شروع میں ناکامی ہوئی کیونکہ بشیر صاحب کو تاریخیں اور سن درست یاد نہ تھے۔۔۔ بہرحال جب کامیابی ہوئی تو ہوتی چلی گئی۔ حتیٰ کہ احمد بشیر کی اپنی ذات بھی اپنے قابو میں ہوتی چلی گئی اور پھر اس نے بھی اس کام کو سنجیدگی سے لے لیا۔ وہ یوں کہ مجھے شاباش دینے کے ساتھ مدد بھی کی۔ شروع میں میرا خیال تھا کہ جب میں انہیں مطلع کروں گا تو وہ ناراض ہو جائے گا مگر حیرت ہے کہ ناراض

ہونے کے بجائے وہ خوش ہوا۔لگتا تھا پتھر دل حقیقت نگار، موم ہو چکا ہے کہ اس نے کشور ناہید کے خاکے کے حواشی لکھنے کا وعدہ کر کے مجھے مستعد کر دیا حتیٰ کہ لکھ بھی دیا۔سب خاکوں کی طرح یہ حواشی بھی قلم برداشتہ لکھے گئے تھے اور کمال فن تو یہی ہے کہ جن باتوں اور باریکیوں کے بغیر خاکہ مکمل نہیں ہوتا احمد بشیر نے انہیں کس سلیقے سے جمع کر دیا تھا۔کہ ہر خاکہ ماہر مصور کے بنائے ہوئے پورٹریٹ کی مانند تھا۔ہر چند احمد بشیر نے زبان دانی کا دعویٰ نہیں کیا مگر احمد بشیر نے زبان دانی کی داد اور سند چراغ حسن حسرت جیسی شخصیت سے لے رکھی ہے۔

وہ کٹّر پنجابی ہے۔انگریزی میں سوچتا ہے پنجابی بولتا۔۔۔اور اردو میں لکھتا ہے جب کبھی میں پنجابی میں بات کرتے کرتے اردو بولنے لگتا ہوں تو وہ بار بار ایسا کرنے پر مجھے ڈانٹ دیتا ہے۔ایک مرتبہ اس نے تھپڑ تو نہیں مارا۔۔۔ مگر کہہ دیا کہ اب پنجابی بولتے بولتے اردو میں آئے تو وہ تھپڑ مار دے گا۔

وہ ماں بولی کا سنجیدگی سے احترام کرتا ہے۔اس کا کہنا ہے۔لکھو بے شک جس زبان میں، بولو۔۔۔تو اپنی زبان۔۔۔مگر اسے تینوں زبانوں پر کمانڈ حاصل ہے اس نے تینوں زبانوں میں لکھا ہے اور خوب لکھا ہے لکھنا اس کا رزق ہے۔۔۔اس کا شوق بھی ہے اور یہی شوق اس کا جنون بھی ہے۔

ان سب سے ہٹ کر اس نے تقریباً تین ہزار صفحات پر پھیلا ہوا ناول بھی لکھ رکھا ہے جس پر وہ مزید کام کر کے اس کے ہزار صفحات کم کرنا چاہتا ہے (میرے بے حد اصرار پر اس نے یہ وعدہ بھی کر لیا ہے کہ وہ بھٹو پر لکھی جانے والی کتاب کے بعد اس ناول پر کام شروع کر دے گا) خدا کرے وہ اسے جلد مکمل کر لے وہ ناول شائع ہو اور میں۔۔۔آپ، سب اسے پڑھیں اس کی تکمیل کریں۔

ایک مرتبہ حمید بلوچ نامی کسی نوجوان کو مارشل لاء کورٹ نے سزائے موت سنائی مگر ابھی عدالتوں کے اختیارات سلب نہ ہوئے تھے میں نے احمد بشیر صاحب سے اس معاملے میں پوچھا۔بشیر صاحب نے کہا ''میں نے قانون میں صرف ایک بات پڑھی ہے کہ ننانوے قاتل اگر غلطی سے بری ہو جائیں تو وہ اتنا بڑا گناہ نہیں جس قدر بڑا گناہ۔۔۔کسی بے گناہ کو موت دینا ہے۔''اس کے بعد بشیر صاحب نے اس نوجوان کی زندگی کے لیے دعا مانگی مگر پھر فوراً ہی کہا۔''مجھے یقین نہیں آتا کہ سزائے موت سنانے والے اسے چھوڑ سکتے ہیں۔''انہوں نے یہ بات اپنے تجربے اور یقین سے کچھ اس انداز میں کہی کہ سب دکھی ہو گئے۔ان دنوں یہ سوچے بغیر کہ سزا پانے والا کون ہے کس سیاست اور کس نظریے کا علمبردار ہے ہر شخص اس قسم کی سزاؤں کے خلاف مزاحمت کرتا تھا مگر احمد بشیر بار بار پورے وثوق سے دوسروں کی نیتوں کا حال بیان کر رہا تھا۔۔۔جو حوصلہ افزا نہیں تھا۔

پھر ایک روز وہ ٹی ہاؤس میں کسی خبر کی فائل اٹھا کر داخل ہوا اور بتایا کہ اس نے متعلقہ خبر، اپنے اخبار کو بھجوا دی ہے اور خبر یہ ہے کہ ''حمید بلوچ کو پھانسی دے دی گئی۔'' سب کو احمد بشیر کی معصومیت پر ہنسی آئی کیونکہ ہم صبح کے اخبار میں پڑھ چکے تھے کہ ہائی کورٹ نے تقریباً سولہ سترہ گھنٹے پہلے حمید بلوچ کو سٹے آرڈر دے دیا ہے۔ہم نے اسے بتایا کہ وہ تو زندہ ہے اور اخبار پیش کیا۔احمد بشیر غلط خبر پوسٹ کر دینے پر نادم نہ تھا وہ تو مصر تھا کہ یہ ممکن نہیں کہ وہ بچے۔ہر چند اس نے فوراً ٹی ہاؤس کے کاؤنٹر سے فون کر کے مذکورہ اخبار کو وضاحت کر دی مگر اس کے چہرے پر حمید بلوچ کے زندہ بچ جانے کے باوجود خوشی کی کوئی جھلک نہ تھی۔بلکہ ایک ملال تھا جو گہرا ہوتا جا رہا تھا۔وہ لحہ بھر سکون سے کرسی پر بیٹھا رہا پھر بولا''یہ بچے گا نہیں۔۔۔تم نوٹ کر لو۔۔۔وہ اسے مار دیں گے'' ہمارا مزاج ہے کہ ہم ایسی باتوں کو مجذوب کی بڑ ہی سمجھتے ہیں مگر آپ کو شاید یاد ہو گا۔عبوری آئین کے نفاذ کے بعد سب سے پہلی پھانسی اسے ہی دی گئی۔

ان خاکوں کو تلاش کرتے اور ترتیب دیتے وقت میں نے کئی مرتبہ سوچا ہے کہ کس کو شامل کروں کسے چھوڑوں۔میرے اندر بہت سوال جواب ہوئے۔

''وارث میر کو چھوڑ سکتے ہو؟''میں نے خود سے پوچھا

''نہیں''اندر سے جیسے کچھ پھٹ پڑا ہو۔

''چراغ حسن حسرت کو؟''۔

''یہ کیسے ہو سکتا ہے۔''

''احسان دانش کو؟''

''ناممکن''

''میجر اسحاق کو؟''

''خواہ مخواہ۔۔۔خاکہ پڑھنے کے بعد وہی تو ایک سچا انقلابی لگا ہے مجھے۔''

''خورشید انور؟''

''سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔۔۔ایسے سُر سمراٹ کو تو آنکھوں پر بٹھانا چاہیے۔''

تو پھر؟''میراجی؟''

''نہیں''

''ظہیر کاشمیری؟''

''نو''

''حسرت موہانی''

''نا بھئی نا''

''کشور ناہید؟''

''حد ہو گئی۔۔۔اس خاکے کے باعث تو میں نے سب کو یکجا کیا ہے۔''

''اور شہاب؟''

''ارے صاحب سنو، قدرت اللہ شہاب کا خاکہ، خاکہ نہیں۔۔۔ خاکوں کا خاکہ ہے۔۔۔یہ تو اشفاق احمد اور ممتاز مفتی کے علاوہ پردے میں چھپے گرد لوگوں کا امانت دار ہے، جو کبھی تحیر سے آشنا کرتے ہیں کبھی تجسس سے۔

باقی صفحہ ۵۴ پر ملاحظہ کیجیے

براہِ راست

کچھ لوگ اپنی زندگی میں ایسے کارہائے نمایاں انجام دے جاتے ہیں جو نہ صرف رہتی دنیا تک یاد رکھے جاتے ہیں بلکہ اُن کی شناخت بھی بن جاتے ہیں۔ اس طرح کے نابغہ روزگار لوگوں کی تعریف اور تحسین میں کبھی الفاظ کی فضول خرچی نہیں کی جاتی کہ وہ بجائے خود اپنا تعارف آپ ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر یونس جاوید اردو ادب کا ایسا روشن اور تابندہ نام ہے کہ اس کے بعد کسی قسم کے کلماتِ تحسین اضافی تصور کیے جائیں گے۔ ڈاکٹر صاحب کا کام ہی اُن کا تعارف ہے سو آج کی نشست میں اس تعارف کو باقاعدہ تعلق میں تبدیل کرنے کی کوشش کی جارہی ہے اس اُمید اور یقین کے ساتھ کہ ہمیشہ کی مانند اس بار بھی ہماری کوشش کامگار ٹھہرے گی۔

گلزار جاوید

☆ ہمارا اشتیاق بجا طور پر اُس گاؤں کے روز وشب سے باخبری کا ہے جس کا ذکر آپ کی تخلیقات میں جا بہ جا نمایاں ہے؟

☆☆ سکیاں پُل اس گاؤں کے نام پر ہے۔ یہ گاؤں لاہور سے قریب اور دریائے راوی کے پار جیتا جاگتا تھا۔ جہاں چپٹے آڑو اور دیسی سنگتروں کے باغات تھے یہ دونوں اب نایاب ہیں۔ یہ ایک طرح سے میرا ننھیال تھا ان دنوں راوی پل پل رنگ بدلتا تھا پھر اس نے بپھر کر راستہ بدلا اور ہر روز لگ بھگ دس فٹ باغ اپنے اندر سمیٹ لے جاتا۔ ہمارے جگت چاچا، چاچا برکت باقاعدہ روئے اور پھر ایک ایک کر کے انہوں نے خود اپنے ہاتھ سے وہ درخت کاٹنا شروع کر دیے جن کی آبیاری میں عمر گنوائی تھی۔ کبھی کبھار اب بھی وہاں جانا ہوتا ہے مگر وہ بات کہاں، شہر کی تمام آلائشیں اور پولوشن علاوہ بجلی اور پکّے مکانوں کی بھرمار نے اس کا حُسن اور کشش کو گُم کر دیا ہے۔ مگر میرے خیالات میں تروتازہ ہے۔

☆ حافظِ قرآن محمد یونس کے ڈاکٹر یونس جاوید بننے کی کہانی دلچسپی سے پُر ہونی چاہیے؟

☆☆ انگلش سکول میں دوسری کلاس کا بچہ نیکر پہن کر اچھلتا پھرتا تھا اچانک سکول سے واپس بلوا کر اباجی نے ایک قاری صاحب (قاری مقبول) کے حوالے کر دیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ مقبول صاحب قاری فضل کریم صاحب کا پیغام لائے تھے کہ آپ نے اپنا بچہ راہِ خدا کے لیے وقف کر رکھا ہے اسے مدرسہ میں بھجوایئے تاکہ اسے قرآن پاک حفظ کرایا جا سکے۔ والد اُن کاروباری لوگوں میں سے تھے جو لاہور کے اُس وقت کے ماڈرن بازار انارکلی میں کاروبار کرتے تھے بقول ان کے طلوع پاکستان سے پہلے پانچ یا چھ مسلمان تھے جو انارکلی میں کاروبار کرتے تھے۔ باقی ہندو سکھ ہی تھے۔ (۱) بمبئے کلاتھ ہاؤس، (۲) کرنال شاپ (۳) شیخ عنایت اللہ اینڈ سنز (بہت چھوٹی سی دکان میں) (۴) چائنا مارٹ (۵) شیخ اللہ بخش اینڈ سنز (۶) اے حمید اینڈ سنز سٹیشنرز۔ آخری دکان والد صاحب کی تھی جو میری پیدائش سے بہت پہلے قائم ہوئی تھی۔ والد صاحب اعلیٰ ترین قلموں کے امپورٹرز تھے۔ مونٹ بلینک، پیلی کن، شیفرز، پارکر 51، پارکر 61، سوان، بلیک برڈ اور بہت سے دوسرے۔ تھوڑا بڑا ہوا تو معلوم ہوا اہلِ فن یا اساتذہ ان قلموں کو بے حد شوق سے خریدتے اور استعمال کرتے ہیں۔ بالکل اپنے بچوں کی نگہبانی کی طرح لہٰذا اہل قلم حضرات سے میرا تعارف (گو بہت بعد میں) اسی دکان پر ہوا یہ فیض ہیں۔ یہ ڈاکٹر سید عبداللہ ہیں یہ سید عابد علی عابد، احسان دانش، ڈاکٹر عنایت اللہ مگر مجھے اُن کے بارے میں خاک بھی معلوم نہ تھا۔ اسی اثناء میں قاری مقبول صاحب کو یہ باور کرانے کے لیے کہ اُنہیں اپنا وعدہ یاد ہے والد صاحب نے خاندانی حجّام ماسٹر صدیق کو بلوایا۔ میرے ریشمیں بالوں کو استرے سے مونڈ دیا گیا۔ میں بول سکتا تھا نہ ہی اس کی اجازت تھی۔ میرے آنسو خود بخود کٹتے بالوں میں جذب ہوتے رہے۔۔۔ ان بالوں کو تلوایا گیا تین تولے کچھ ماشے بالوں کے برابر سونا منگوایا گیا جو اس زمانے میں اٹھانوے روپے تولہ کے حساب سے ملا تھا۔ یہ سونا صدیق حجّام کی نذر کر دیا گیا اور دوسرے دن والد صاحب بہ نفس نفیس مجھے اندرون موچی دروازہ مسجد چینیا نوالی کے مدرسہ تجوید القرآن میں جا کر چھوڑ آئے۔

ظاہر ہے مجھے یہ سب اچھا تو نہیں لگا۔۔۔ ہر چند کہ مٹھائی کے ٹوکرے بانٹے گئے لیکن میں ایک حبس زدہ ماحول میں آ چکا تھا میرے اندر اس عمر میں بھی بہت ٹوٹ پھوٹ ہوئی تھی مگر مجھے کچھ کہنے کی اجازت نہیں تھی۔ اندر غبار جمع ہوتا گیا سوالات اندر ہی اندر سر اٹھانے لگے۔۔۔ احتجاج طوفان بننے لگا میں کچھ لکھنے کے قابل تو نہ تھا مگر جو احتجاج زبان پر آ کر چپک جاتے میں نے اپنی موٹی کاپی پر انہیں لکھنا شروع کر دیا۔ ٹوٹا پھوٹا۔ شاید یہی لکھنے کی ابتدا تھی۔

ان حالات کی میرے نانا حکیم محمد شفیق نے مخالفت کی تھی میری ماں نے جھڑکیاں بھی برداشت کیں سب کا خیال تھا کہ بچہ کمزور ہے۔۔۔ اکلوتا ہے دن بھر گھر اور ماں سے اتنی دور رہنا مناسب نہ ہوگا۔ لیکن والد نے کہا میں اسے جامع از ہر مصر بھجوانے والا تھا اگر تم لوگ ضد نہ کرو گے تو پھر اسے مصر بھجوانا پڑے گا تاکہ عالم و فاضل بن سکے۔ اس پر ماں اور نانا نے والد صاحب کی بات مان لی کہ مصر سے لاہور بہتر ہے۔ مگر میرے لیے یہ ماحول اجنبی تو تھا ہی، تحیّر آمیز بھی تھا۔ میں نے کبھی بچوں کو اس سفّاک طریقے سے پٹتے نہیں دیکھا تھا اسے دیکھ کر ہی میں نے فیصلہ کر لیا کہ یہ سب مجھے کرنا ہوگا۔ دوسری حیران کرنے والی بات یہ تھی کہ جو بھی شخص بچہ داخل کرانے آتا قاری فضل کریم (جو نابینا تھے) کے سامنے اپنا بچہ پیش کر کے یہ ضرور کہتا تھا ’’حضرت صاحب گوشت آپ کا ہڈیاں ہماری‘‘ مجھے اس بات کی خاک بھی سمجھ نہ تھی۔ پھر ایک روز ’’لال کھوہ‘‘ کے علاقے سے ایک شخص اپنا

بچہ داخل کرانے آیا تو اس نے اپنے خوبصورت سے بچے کو پیش کر کے جب کہا ''حضرت جی۔۔۔گوشت تہاڈا، ہڈیاں ساڈیاں'' تو میرے ساتھی یعقوب نے مجھے بتایا ''یہ چاچا بسّا ہے لال کھوہ کے پاس جہاں کی برفی مشہور ہے اس کی گوشت کی دکان ہے یہ قصائی ہے۔'' میں یہی سمجھا کہ چاچا بسّا اپنے گوشت کے بارے میں کچھ سمجھا رہا ہے۔مگر وہ اپنے بچے جس کا نام متین تھا کہہ رہا تھا۔۔۔چاچا بسّا تو قاری صاحب کو لڈو دے کر چلا گیا تب مجھے اس گھٹن زدہ ماحول سے باہر نکلنے کا ایک ہی طریقہ سمجھ میں آیا تھا کہ جلد سے جلد اپنا کام ختم کیا جائے اور چپ چاپ قرآن پاک حفظ کیا جائے۔سو میں دن رات اسی میں جُت گیا مگر متین مجھ ایسا نہ تھا۔۔۔ایک ہفتہ بعد ہی وہ مدرسہ سے بھاگ نکلا۔۔۔دو دن بعد چاچا بسّا اسے چھترول کرتا ہوا قاری صاحب کے پاس لایا اور انہیں بھی کہا کہ اس کے ''چب'' اچھی طرح نکال دیں۔اب سمجھ میں آیا ہے کہ ہم لوگ کس قدر سفّاک ہیں ہم اپنی مرضی، پسند اور خواہش اپنے پھول جیسے بچوں پر مسلّط کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ یہی درست ہے۔۔۔ہم اپنے بچوں کو ملکیت تصور کرتے ہیں ہم نے کبھی اپنے بچوں سے یہ پوچھا ہی نہیں کہ تم گٹار بجاؤ گے، کاروبار کرو گے یا کون سا سبجیکٹ تمہیں پسند ہے۔۔۔ڈاکٹر، انجینئر یا سی ایس ایس یا آرمی۔۔۔ہمارے پیش نظر بچے کا مقدر انہیں چند راستوں میں بویا ہوا ہے مگر بغاوت کرنا ہر کسی کے بس میں ہے نہ اختیار میں۔تاہم متین نے کئی دنوں تک مار کھانے کے بعد دوبارہ مدرسے سے دوڑ لگا دی۔۔۔اب کی مرتبہ وہ گھر بھی نہیں گیا۔۔۔دو راتوں اور دو دنوں کے بعد وہ ایک رات لاہور ریلوے اسٹیشن کے پلیٹ فارم نمبر ٦ کے ایک بنچ پر سویا ہوا مل گیا۔ پہلے باپ نے اس کو سزا دی۔۔۔ پھر مدرسہ کے ہر استاد نے کان پکڑائے، پنسل انگلیوں کے درمیان پھنسا کر اس کا نازک ہاتھ دبایا کہ لہو رسنے لگا۔ اس کے دوسرے ہی دن چاچا بسّا بیس بائیس فٹ لمبی زنجیر لے کر قاری صاحب کی خدمت میں فخر سے حاضر ہوا اور عرض کی ''حضرت جی۔۔۔زنجیر کا ایک سرا متین کی کلائی میں لاک ہوگا دوسرا سرا اس ستون سے تالا بند کر کے باندھا جائے گا تاکہ یہ سبق بھی پڑھ لے۔۔۔واش روم بھی جا سکے، اور رات کو ادھر ہی پڑ کر سو جائے۔''

چاچا بسّا مطمئن ہو کر خوشی خوشی چلا گیا تھا اس نے قاری صاحب کو چاندی کے بیس روپے دیے تھے۔۔۔جنہیں ٹھپے کہا جاتا تھا۔

آٹھ روز خاموشی اور سکون سے گزر گئے۔ ہر چند میں گھر سے بہت دور آتا تھا اور چلا جاتا تھا مگر متین کو دن رات اِدھر ہی رہنا اور سونا تھا۔مشکل سے اس نے نو دن گزارے اور پھر نو اور دس کی رات کو زنجیر کاٹ کر وہ نکل گیا اور اس کے بعد اس کا خاندان اور چاچا بسّا، دنوں، مہینوں، سالوں اسے تلاش کرتے پھرے مگر متین ملنا تھا نہ ملا۔اور اس کے بعد میں نے جو چھ برس وہاں گزارے اس دوران میں مَنّتیں ماننے اور چڑھاوے چڑھانے کے باوجود متین نہ لوٹا۔

میں اب سمجھتا ہوں۔۔۔آج جو طالبان کی کھیتیاں ہر سطح پر لہلہا رہی ہیں۔۔۔ان کا بیج میرے ہی زمانے میں بویا جاتا رہا۔

☆ اردو ادب سے آپ کی مڈبھیڑ کب، کہاں اور کیسے ہوئی؟

☆☆ میں صبح مدرسہ میں چھوڑ دیا جاتا۔گیارہ بجے درمیانی وقفے کی چھٹی ہوتی۔۔۔سب بچے گیارہ بجے سے دو بجے تک گھر چلے جاتے میں اکیلا، تنہا کرب سے گھٹ کر مسجد کے فرش کو تکا کرتا۔ایسے میں ایک روز باہر نکلا تو ''تکیہ سادھواں'' کے پاس ایک بورڈ لگا تھا ''آمنہ لائبریری'' ایک آنہ روز پر ہر کتاب مل سکتی ہے۔'' میں نے نام پتہ لکھوایا۔۔۔اور ایک آنہ نکال کر سامنے کیا۔انچارج بولا۔۔۔''بیٹا جی پیسے بعد میں'' اس نے رجسٹر میں میرا نام اور مدرسہ تجوید القرآن لکھ کر پوچھا ''کیسی کتاب چاہیے گرم یا ٹھنڈی'' ''اچھی سی'' میں نے کہا اس نے ایک کتاب میرے سامنے رکھ دی۔نام تھا۔۔۔''صحرانورد کے خطوط'' میں نے بے دلی سے کتاب اٹھالی۔۔۔مسجد مین لا کر پہلے اس پر کاغذ چڑھایا کہ میرے گھر کی طرح یہاں بھی کتاب پڑھنے کی ممانعت تھی۔۔۔ پھر کتاب کھول کر دیکھا۔۔۔''میرزا ادیب'' عجیب سا نام تھا۔ پڑھنا شروع کیا۔سارا وقت گزر گیا کچھ پلے پڑا کچھ سر سے گزر گیا۔لیکن ایک حیران کن اثر نے مجھے گھیر لیا تھا میں نے دوسرے دن ایک آنہ دے کر دوبارہ اس کتاب کو ایشو کرا لیا۔۔۔اور جہاں تک ممکن ہو سکا لفظ لفظ کر کے اسے پڑھا۔۔۔پھر تیسرے دن بھی یہی ہوا۔۔۔ انچارج لائبریری مجھے ایم اسلم، نسیم حجازی اور رشید اختر ندوی کی کتابیں سامنے رکھتا رہا مگر میں نے ''صحرانورد کے خطوط'' ہی کو پسند کیا اور اس کو بار بار پڑھا۔اس ایک کتاب نے میرے اندر تجسس پیدا کیا اور میں نے پہلی مرتبہ سوچا کہ ایسے ماحول سے بچنے والا وقت کتاب پڑھنے میں صرف کیا جا سکتا ہے۔۔۔اور شاید یہی فلاح کی راہ بھی تھی۔سو میں نے دنیا بھر کی اچھی بُری، الٹی سیدھی سب کتابیں پڑھنا شروع کر دیں جس سے مجھے اردو سیکھنے میں بھی مدد مل گئی اور اندر ہی اندر ایک نئی روشنی بھی جھلملانے لگی۔

☆ شاعری، افسانہ، ناول، ڈرامہ، تحقیق، تنقید اور خاکہ نگاری کے مراحل کس سبیل اور ترتیب سے طے پائے؟

☆☆ دنیا کی ہر زبان کی ابتدا شاعری یا شعر نما ادب لطیف سے ہوئی بعینہ ہر لکھاری نے بھی کچھ بھی لکھنے کا آغاز شاعری ہی سے کیا۔مگر مجھے جلد ہی معلوم ہو گیا کہ یہ میرے بس کی بات نہیں۔ میں نے جیسے تیسے دو کہانیاں لکھیں ایک ''لیل و نہار'' او رہفت روزہ کو بھجوا دی اور دوسری ''داستان گو'' کو۔ جو اشفاق احمد اور بانو قدسیہ مل کر چھاپتے تھے دونوں رسائل پہلی مرتبہ فوٹو آفسٹ پر خوبصورت شائع ہوئے تھے۔عجب ہے کہ دونوں کہانیاں قبول کر لی گئیں۔لیل و نہار والی کہانی کا نام تھا ''برش اور تلوار'' (تیز ہوا کا شور میں شامل ہے) اور ''داستان گو'' میں شائع ہونے والی کہانی تھی ''کنارے کنارے'' ہر چند کہ میرزا ادیب کے ساتھ ملنا جلنا ہو چکا تھا مگر انہوں نے کبھی کہانی کے لیے نہیں کہا تھا۔میرزا ادیب صاحب سے ملنا جلنا بھی ایک داستان ہی تھی۔اتفاق سے میرے کسی دوست کو اپنی کسی کزن کا خط میرزا ادیب کو پہنچانا تھا اس نے ''فریش ٹی ہاؤس'' میں بیٹھے

بیٹھے اچانک مجھے کہا ''تم یہ خط میرزا ادیب صاحب کو پہنچا سکتے ہو؟ بڑا احسان ہوگا تمہارا'' مجھے فلم دیکھنے جانا ہے۔

میرزا ادیب کے نام سے میں چونک گیا۔ میں نے فوراً حامی بھرلی۔ میرے لیے یہ عجیب سا ایڈونچر ثابت ہوا۔ جونہی سہ پہر کے بعد میں ادب لطیف کے دفتر پہنچا اندرونی کمرے میں ایک دبلا پتلا شخص ٹیبل لیمپ جلائے کاغذات کے پلندے پر جھکا تھا میں نے سامنے جا کر خط والا لفافہ انہیں پیش کیا۔ معلوم نہیں انہوں نے کیا سمجھا۔۔۔ شاید لکھاری سمجھا ہوگا جو اپنی نظم یا غزل دینے آیا ہوگا انہوں نے بالکل لفٹ نہ کرائی۔ میں واپس مڑا تب انہوں نے کہا۔ ''سنیں سنیں'' میں رک گیا لفافہ چاک کرتے ہی وہ اچھل پڑے تھے تھوڑا سا خط پڑھنے کے بعد انہوں نے پوچھا ''پچھلے دنوں بیمار تھیں ارشاداب کیسی ہیں؟'' ٹھیک ہیں میں نے جان چھڑانے کی کوشش کی۔ مگر میرزا ادیب بے حد ایکسائٹڈ تھے انہوں نے کرسی سے اٹھ کر مجھ سے نہ صرف مصافحہ کیا بلکہ کرسی بیٹھنے کے لیے آفر کی اور بولے ''آپ چائے پیئے بغیر نہیں جا سکتے۔'' میں نے معذرت کرنے کی کوشش کی۔ انہوں نے کہا ''کوئی معذرت نہیں چلے گی اور یہ بھی سن لیں چائے ہم ممتاز ریسٹورنٹ میں جا کر پیئیں گے بس عزیز اثری صاحب آنے والے ہیں اور عبد السلام بھی۔۔۔ سب مل کر چلیں گے۔''

اسی اثناء میں انہوں نے جلد جلد سارا خط پڑھ لیا۔۔۔ بولے ''انہوں نے لکھا ہے میں یہ خط اپنے کزن کے ہاتھ بھجوا رہی ہوں آپ ان کے کزن ہیں؟''

میں کچھ جواب دینے کے بجائے مسکرا دیا کہ اچانک دھم سے عزیز اثری صاحب آ داخل ہوئے اور میرزا ادیب صاحب نے خاتون کا خط بڑی صفائی سے دراز میں رکھ لیا اور بولے ''عزیز اثری صاحب ان سے ملئے۔۔۔ یہ ہیں۔۔۔ پھر بے ساختہ مجھ سے کہنے لگے آپ خود ہی اپنا نام بتا دیں۔'' (انہوں نے اب تک میرا نام پوچھا ہی نہ تھا) ''یونس جاوید'' میں نے کہا۔ عزیز اثری کسی تاثر کا اظہار کرنے کے بجائے میرزا صاحب سے کہنے لگے ''ایک گلاس پانی منگوایئے'' ''پانی اور چائے ممتاز ریسٹورنٹ میں۔۔۔ عبدالسلام بھی آچکا ہوگا'' وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔۔۔ اور ہم لوگ خراماں خراماں انارکلی ایبک روڈ کے بالکل سامنے ممتاز ریسٹورنٹ میں آ پہنچے جس کی خصوصیات میں ایک تو فلمی گانوں کی ریکارڈنگ تھی۔۔۔ دوسری کیبنوں کی ایک لمبی قطار تھی جن کے دروازوں پر رنگ رنگ کے دبیز پردے پڑے تھے۔ ان کیبنز میں کپل بیٹھتے تھے۔ پل پل کوئی جوڑا اٹھکیلیاں کرتا ہوا داخل ہوتا، بیرا انہیں خوش آمدید کہہ اندر بٹھا دیتا اور آرڈر لے لیتا۔ میں نے خاموشی سے چائے پی۔۔۔ بس کچھ اور لوگ بھی میرزا ادیب سے ملنے آ گئے جن میں نمایاں ابن انشاء کے بھائی جو پبلشر تھے۔۔۔ آ بیٹھے۔ یہ محفل برخواست ہونے سے پہلے میرزا صاحب نے گرمجوشی سے میرا ہاتھ پکڑے رکھا اور وعدہ لینے کے بعد میرا ہاتھ آزاد کیا کہ آپ ہفتے میں دو تین مرتبہ ضرور تشریف لائیں گے۔۔۔ مجھ سے ملنے۔''

اندر بوٹی نے مُشک مچا رکھا تھا، غلطی فہمی ہی میں سہی، مگر جو توقیر مجھے میرزا ادیب دے رہے تھے وہ اس لیے اہم کہ میرزا سخت ایڈیٹر سمجھے جاتے تھے اور کسی کو کم ہی خاطر میں لاتے تھے سو یہ راستہ میں نے غنیمت اس لیے بھی سمجھا کہ ان دنوں ادبِ لطیف بڑے قد کا جریدہ تھا دوسرا نقوش اور تیسرا کبھی کبھی شائع ہونے والا سویرا۔

دوسرا واقعہ یوں تھا کہ سال بھر میں میرزا ادیب مجھ پر اتنا اعتماد کرنے لگے کہ جب جولائی کے مہینے میں وہ مری لطیف کاشمیری کی دعوت پر گئے (معلوم ہوا ہر سال ان کا یہی معمول تھا) تو کچھ مسودات مجھے کاتب کے سپرد کرنے کو دے گئے اور یہ بھی کہا کہ میں پرچے کے پروف دیکھ کر اپنے سامنے کاپیاں بھی جڑوالوں۔ دوسرے دن میں ادب لطیف کے ایڈیٹر کی کرسی پر براجمان تھا جو بھی شخصیات آئیں اور وہ سب بڑے لوگ تھے۔ مثلاً پہلے دن آنے والوں میں ظہیر کاشمیری، انیس ناگی، وقار بن الٰہی، ناصر شہزاد اور سلمیٰ حسین نامی ایک خاتون بھی تھیں۔ مجھے نائب مدیر جان کر سب نے مجھ سے بے تکلفی سے باتیں کیں۔ خصوصاً ظہیر صاحب نے۔ میں ہاں ہوں کرتا رہا۔۔۔ اصل میں سب کی باتیں میری عقل اور علم سے بہت بلند تھیں اور میرا انٹینا بھی درست نہ تھا۔ بہر حال۔۔۔ ایک دن میں ہی بہت سے تجربات ہوئے ڈاک دیکھی۔۔۔ بعض لوگوں کو جواب بھی لکھ دیے۔ حتیٰ کہ کاتب کاپیاں جوڑنے سے پہلے پروف دکھانے لایا۔۔۔ میں نے اطمینان اور توجہ سے پروف پڑھے۔ اسی دن مجھ پر یہ راز بھی کھُلا کہ غزل کے اشعار میں توازن کیسے ہوتا ہے اوزان اور میٹر میرے اندر فٹ دکھائی دیئے۔ وزن سے گرے مصرع کو فوراً میں پکڑ لیتا فی الحال میں نے ایسے تمام اشعار کو انڈر لائن کر دیا تا کہ میرزا صاحب سے اجازت لے کر قطع و برید کروں لیکن جب میں نے چاروں افسانے پڑھے تو وہ کوئی خاص نہ تھے ایک افسانہ پی سی منظر کا کچھ بہتر تھا لیکن ان چاروں افسانوں سے بہتر افسانہ میرے پاس موجود تھا جس کا نام ''پاپا'' تھا۔ میرزا صاحب سے اتنی قربت اور یگانگت کے باوجود انہوں نے کبھی ذکر کیا نہ افسانہ طلب کیا نہ کبھی شائع ہونے والے افسانوں کی داد ہی دی حالانکہ ''برش اور تلوار'' چھپنے کے بعد شام کو پاک ٹی ہاؤس میں ہی مجھے عارف زمان، عزیز الحق اور جاوید شاہین نے کھُل کر داد دی تھی۔ جوں جوں میں اس نکتے پر سوچتا مجھے رنج ہونے لگتا۔۔۔ کہ کیا میرزا صاحب مجھے اس گمنام خاتون کا کزن سمجھ کر ہی ساری عزت و توقیر دے رہے ہیں تب میری شناخت کہاں گم ہوگئی؟

یہ غبار ایسا بگولہ بنا کہ سر چکرانے لگا اللہ کا نام لے کر اور اپنے خصوصی اختیار استعمال کرتے ہوئے میں نے ''پاپا'' کاتب کے حوالے کر دیا۔ پروف آئے تو میں نے کاپیاں جڑواتے ہوئے اپنا افسانہ ''پاپا'' تمام افسانوں کے آخر میں لگوا دیا اور پھر حسب ہدایت کاپیاں پریس بھجوا دیں۔ چودھری افتخار (مالک

پنجاب بکڈ پو وادب لطیف) اپنے والد چودھری برکت علی کی طرح نہیں تھے۔ وہ میٹر اور مواد میں کوئی دخل نہ دیتے تھے انہیں معلوم ہی نہ ہوا کہ ادب لطیف کے قائم مقام ایڈیٹر نے کتنا بڑا قدم اٹھالیا ہے پرچہ چھپ کر آیا تو میرزا صاحب کو بھی مری بھجوایا۔ میرزا صاحب نے پرچہ دیکھ کر استعفیٰ بھجوا دیا۔ یہ داستان میرزا صاحب کے خاکے ''صحرانورد'' میں شامل کر دی ہے۔

شیخ منظور الٰہی کمشنر بحالیات تھے۔ انہوں نے ''ہمدرد ٹرسٹ'' کے ماہنامہ اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے اپنے خطبے کا پہلا جملہ کہا وہی ہماری تاریخ ہے وہی زوال کی داستان وہی کرپشن کی ابتداء۔ انہوں نے کہا۔۔۔

''ہمارے قومی کردار کو برباد کرنے میں میرے ڈیپارٹمنٹ کا ہاتھ اور حصہ سب سے زیادہ ہے۔''

سوا سی لوٹ مار کی بنیاد وہ قانون بنا کہ ہندو کی چھوڑی ہوئی جائیداد مقامی لوگوں کو الاٹ نہیں ہو سکتی حتیٰ کہ جو لوگ طلوع پاکستان سے بھی پہلے سے جن دکانوں میں کاروبار کر رہے ہیں انہیں بھی یہ حق نہ دیا گیا کہ وہ اُسی دکان کو اپنے نام کروا سکیں۔ سوا سی اصول کے تحت جب میرے والد حج پر گئے ہوئے تھے اور میں نے نا سمجھ ہونے کے باوجود بلڈنگ کے نئے مالک کو کرایہ دینے گیا تو وہ ٹال مٹول کرتا رہا اور ملاقات کا شرف ہی نہ بخشا میں نے ابا جی کے دوستوں سے مشورے کے بعد کرایہ منی آرڈر کروا دیا۔ موصوف نے پوسٹ مین سے مل کر نہ تو کرایہ وصول کیا اور نہ ہی واپس۔ عین ساٹھ دن گزرنے کے بعد کرایہ واپس کیا گیا کہ وقت پر نہیں ملا اور پھر ڈیفالٹر کا مقدمہ بھی دائر کر دیا گیا اور جلد جلد تین سمن جاری کروا کر ضائع کر دیے اور آخری فیصلہ آنے سے پہلے وارننگ دے کر بلایا گیا والد حج سے واپس آ چکے تھے۔ گیارہ روز کے اندر اندر فیصلہ آ گیا جو ہمارے خلاف تھا۔ دکان خالی کرانے کے لیے عدالتی بیلف کدالیں اٹھائے، ٹرک دکان کے سامنے لے آیا۔ والد صاحب یہ خبر سن کر پہلے ہی ہائی کورٹ سے سٹے آرڈر لے چکے تھے اور ہائی کورٹ کے ریمارکس بھی بڑے سخت تھے۔ یہ کون ہے جس نے گیارہ دنوں میں یہ فیصلہ کر دیا ہے، مگر مالک مکان سٹے آرڈر منسوخ کرانے کے درپے تھا کہ ابا جی جو صرف خدا پر توکل کرتے تھے بیزار ہو کر دکان چھوڑ گئے اور ٹمپل روڈ پر چلے گئے۔۔۔ مگر کہاں انارکلی کہاں ٹمپل روڈ۔ کاروبار ڈوبنے لگا، اثاثے بکنے لگے مگر والد صاحب مطمئن اور میں بے حد مضطرب تھا۔ انہیں دنوں میں نے فیروزسنز میں ملازمت کر لی مگر وہ ایک ماہ بھی نہ چلی پھر ادب جدید والے امان عاصم صاحب مجھے سید امتیاز علی تاج کے پاس لے گئے اور بہت تعریف کی۔ تاج صاحب نے کچھ پروف مجھے دیکھنے کے لیے دیے۔ جنہیں پڑھ کر میں پاس قرار دیا گیا۔ جب تنخواہ کی بات چلی تو تاج صاحب نے فرمایا۔

''پچھتر روپے''

ان دنوں میری کہانی ''شمع'' لاہور میں شائع ہو چکی تھی جس کے مجھے پچاس روپے ملے تھے۔ (شاید یہ انعامی رقم تھی) میں نے تاج صاحب سے کہا ''سر دو کہانیوں کا سو روپیہ بنتا ہے آپ کچھ رعایت کیجیے'' امان عاصم صاحب نے بھی زبردست سفارش کی کہ وہ مجلس ترقی ادب کے سول ایجنٹ تھے اور ہر سال دو لاکھ کی کتابیں خرید کر سپلائی کرنا ان کی ذمہ تھا۔ تاج صاحب بھی ان کا لحاظ کرتے تھے سو مجھے سینئر پروف ریڈر کا گریڈ دے کر رکھ لیا گیا۔ اب سارے الاؤنس ملا کر تنخواہ ایک سو ستاون روپے بن گئی۔ واپس آتے ہوئے میری آنکھوں میں نمی تھی، انارکلی جو میری جنت تھی، جس میں مَیں نے آنکھ کھولی تھی، جینا سیکھا تھا۔۔۔ پل پل گزارا تھا نگینہ بیکری میں ادیبوں کی باتیں سنی تھیں جس کی ہر راہ گزر پر میرے قدموں کے نشان تھے یک لخت مجھ سے چھین لی گئی مجھے ہر روز جیب خرچ پانچ روپے ملتے تھے۔۔۔ پانچ روپے میں کافی ہاؤس میں دس ہاف سیٹ چائے منگائی جا سکتی تھی۔ جب میں جاتا تو دوستوں کی محفل پھیلتی چلی جاتی اور پانچ روپے ختم اس لیے نہ ہوتے تھے کہ دوسرے دوست بھی چائے وغیرہ منگوا لیا کرتے تھے اور دنیا کے دکھوں کو سگرٹ کے مرغولوں کی نذر کرنے والے سب سے زیادہ شاہ خرچ اور جونیئر دوستوں، ملنے والوں یا ناواقف شاعروں کو عزت اور آسودگی دینے والا یوسف کامران تھا۔ اگر وہ آ جاتا تو چائے کے ساتھ پٹیز اور کلفٹن کے سگریٹ اور کبھی کبھی آئس کریم یا پھر پرانی انارکلی جا کر فالودے کی دعوت بھی مل جایا کرتی۔۔۔ وہ شاہ خرچ ہی نہیں دردمند بھی تھا اسی لیے میں اسے شاہ زادہ صاحب کہا کرتا تھا۔

مجلس ترقی ادب وہ ادارہ تھا جو ریٹائر ادیبوں کی فلاح کے لیے اور انہیں فیڈ کرنے کے لیے قائم کیا گیا تھا لہٰذا یہاں سبھی اپنے اپنے دفاتر سے ریٹائرمنٹ کے بعد ملازمت کرنے آ جاتے تھے اور انہیں باوقار روزگار مل جاتا تھا۔ ریگولر صرف میں ہی تھا جو میٹرک کے بعد باقاعدہ ملازم ہوا تھا۔۔۔ یہاں سے ریٹائر ہونے کے لیے اپنے پختہ ارادے کی ضرورت تھی یا بیماری کی مجبوری۔۔۔ یا پھر موت۔

میرے زمانے میں سید امتیاز علی تاج کے علاوہ سید عابد علی عابد (ریٹائر دیال سنگھ کالج کی پرنسپل شپ سے) کلب علی خان فائق، رسا جالندھری، مولوی عبدالمجید (سٹور کیپر) اور اسی طرح دوسرے لوگ تھے جو ساٹھ ستر سال سے بھی زیادہ عمر کے تھے۔ میرے اندر دن رات اپنی تعلیم مکمل کرنے کی چبھن سر اٹھاتی رہتی۔۔۔ مگر اپنے آس پاس کے لوگ جن کے ہاتھ میں سارے اختیارات تھے وہ میٹرک ہی تھے۔ وہ کسی دوسرے کی اپنے سے زیادہ تعلیمی استعداد برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ مگر میرا جنون مجھے حوصلہ دیتا رہا اور میں نے اپنے مشن کو جاری رکھا بالآخر مجلس میں ہی لُک چھپ کر میں نے ایف اے کا امتحان دے کر بی۔ اے کی تیاری شروع کر دی۔۔۔ مگر راز داری کے ساتھ اس لیے کہ سب میٹرک اور کچھ لوگ میٹرک بھی نہ تھے۔۔۔ اور وہ Boss بھی تھے اگر انہیں معلوم ہو جاتا تو مجھے فارغ کروا دیتے۔ اسی اثناء میں تاج صاحب قتل ہو گئے۔ قرعۂ فال پروفیسر حمید احمد خاں صاحب کے نام نکلا وہ اس وقت امریکہ میں

لیکچر دینے گئے ہوئے تھے مگر بورڈ آف گورنرز نے انہیں رکمنڈ کر دیا تھا کیونکہ وہ وائس چانسلر شپ سے استعفیٰ دے چکے تھے اور فارغ تھے وہ واپس آئے۔ مجلس کے ناظم مقرر ہوئے۔ اٹھارہ سو تنخواہ مقرر ہوئی۔

تین سال چھ ماہ اور کچھ دن کا عرصہ انہوں نے مجلس ترقی ادب کو فعّال بنانے میں صرف کیا تب تک میں گریجویشن کر چکا تھا۔۔۔ خاں صاحب نے ''تیز ہوا کا شور'' پڑھی تو مجھے خصوصی دعوت دے کر بلوایا کہا ''میں جرمنی کے بٹوارے والی دیوار کے پاس اور گوئٹے کے مجسمے کے سامنے تک ہو کر آیا ہوں مشرقی جرمنی والی سائڈ سے ایک عورت دیوار کو تکتی جاتی تھی وہ روتی جاتی تھی یونس جاوید صاحب لوگوں کے جذبات آپ نے کیسے محسوس کیے دیکھا جائے تو آپ نے اس عمر میں بغیر دیکھے وہاں کے رنجیدہ لوگوں کے محسوسات کو زبان دی ہے۔'' یقیناً اس داد سے اور یہ داد بالکل خالص اور معتبر تھی مجھے خوشی اور سرشاری نصیب ہوئی۔ میں نے موقع غنیمت جان کر عرض کیا ''سر میں ایم اے کرنا چاہتا ہوں ۔۔۔ ریگولر'' وہ فوراً مان گئے مگر کہا ''بورڈ آف گورنرز کے سامنے رکھوں گا۔۔۔ انشاءاللہ ہو جائے گا۔'' کچھ دن بعد انہوں نے مجھے بلوا کر کہا ''بورڈ کا جلسہ اگلے ہفتے ہو رہا ہے آپ کا شیڈول کیا ہوگا؟''

میں نے کہا ''سر صبح آٹھ بجے دفتر آؤں گا۔ نو بجے سے بارہ بجے تک یونیورسٹی صرف دو پیریڈ۔۔۔ سوا بارہ بجے سے دفتر۔۔۔ لوگ دو بجے چھٹی کریں گے میں پانچ بجے کے بعد تک دفتری امور انجام دوں گا۔'' خاں صاحب نے مطمئن ہو کر نوٹس بھی لے لیے اور کہا ''اس کے لیے آپ کو موٹر بائیک خریدنا ہوگی ورنہ یہ مشکل شیڈول ممکن نہ ہوگا'' میں نے دوسرے ہی دن موٹر سائیکل خرید لی۔

بورڈ کا اجلاس ہوا۔۔۔ میں بے حد سرشاری میں تھا۔ دوسرے دن صبح صبح سوا آٹھ بجے ہی خاں صاحب نے یاد فرمایا میں سینہ پھُلائے ان کے پاس حاضر ہوا آداب کیا۔ جواب میں انہوں نے کہا ''یونس جاوید صاحب تشریف رکھیے (وہ ہمیشہ میرا پورا نام ہی لیا کرتے تھے) چہرے پر بیزاری اور اضطراب تھا۔ کہنے لگے ''بورڈ کے چیئر مین صاحب نے آپ کا کام مسترد کر دیا ہے'' میں خاموش رہا تو انہوں نے کہا ''چیئر مین ایس اے رحمان۔۔۔ خود کو چیئر مین ماوزے تنگ سمجھنے لگے ہیں۔ پھر خاں صاحب نے بتایا کہ وہ ایس اے رحمان تیسری جماعت سے اکٹھے پڑھتے رہے تھے اور ایس اے رحمان جانتے ہیں کہ میں غلط سفارش نہیں کرتا۔ اور یہ بھی کہ میں ایجوکیشن کے معاملات میں کس قدر مخلص ہوں۔۔۔ بہر حال خاں صاحب نے پوری داستان کے بعد پہلے ایک پھر دو۔۔۔ اور پھر تین گھنٹیاں وقفوں سے بجا دیں ایک گھنٹی ان کے خصوصی قاصد کے لیے تھی دوسری مہتمم مطبوعات کے لیے اور تیسری اکاؤنٹنٹ کے لیے۔ تینوں اندر آ گئے۔ خاں صاحب نے قاصد سے کہا ''دروازے پہ رہو۔۔۔ کوئی اندر نہ آئے۔'' وہ واپس ہوا باقی دو سے کہا ''میری بات غور سے سنو تم دونوں۔''

Bitween you, me, younas javed sahib and God

یہ بات ایک امانت ہے۔۔۔ یونس جاوید جب صبح آٹھ بجے دفتر آئیں گے ٹھیک نو بجے یونیورسٹی جائیں گے وہاں سے بارہ سوا بارہ بجے دفتر واپس آیا کریں گے۔ اور یہ تین گھنٹے وہ بعد میں دفتری امور سرانجام دیں گے۔۔۔ یہ۔۔۔

''مگر سر بورڈ نے۔۔۔'' اکاؤنٹنٹ نے قانونی گرہ لگانے کی کوشش کی تو خاں صاحب نے زوردار آواز میں کہا ''بات کو مکمل سنا کرو۔۔۔ یہ سب اَن آفشیلی ہوگا اور اگر اس سمجھوتے کے بارے کسی نے کوئی بات کی۔۔۔ تو تمہاری ذمہ داری ہوگی۔۔۔ بس۔۔۔ یہی کہنا تھا۔۔۔ آپ لوگ تشریف لے جائیں''

حسد سے ان کے چہرے سرخ ہو رہے تھے دونوں میٹرک پاس تھے اور اکاؤنٹنٹ تو کارپوریشن سے ڈیپوٹیشن پر آیا ہوا تھا۔ وہ کسی کو خاطر میں ہی نہیں لایا کرتا تھا۔ رزلٹ آیا میں فسٹ کلاس میں پاس ہوا تھا مگر میری پنجاب یونیورسٹی میں پوزیشن بھی دوسری تھی۔ پروفیسر حمید احمد خاں نے مجھے گلے لگایا۔ مراعات دیں اور کہا ''میری خواہش ہے کہ آپ کو جلد ایڈیٹر آف بکس اور اگر صحیفہ شروع ہوا تو اس کا بھی ایڈیٹر لگایا جائے۔'' خاں صاحب کا انتقال ہو گیا قاسمی صاحب ناظم ہوئے میں نے اکتیس سال صحیفہ کو ایڈٹ کیا۔ صحیفہ کے پہلے ایڈیٹر سید عابد علی عابد دوسرے ڈاکٹر وحید قریشی اور تیسرا میں تھا۔۔۔ مگر میرے نام کے ساتھ ڈیکوریشن کے لیے جو نام نامی درج ہوتے تھے ان میں ایک ناظم کا نام اور دوسرا کلب علی خاں فائق تھے۔۔۔ لہٰذا تنقید اور تحقیق بھی میرے نصیب میں آ گئی کہ روزی روٹی کے لیے یہ سب ضروری تھا۔

اس زمانے میں پی ٹی وی ہی ایک ادارہ تھا جو سنٹرلی ایئر کنڈیشنڈ تھا جون جولائی میں دفتر میں چھٹی کے بعد میں کبھی کبھی دوستوں خصوصاً سرمد صہبائی سے ملنے چلا جاتا۔۔۔ ایک تو وہاں کی کینٹین زبردست تھی دوسرا دوپہر آسودگی سے گزر جاتی۔ کیونکہ ان دنوں پاک ٹی ہاؤس گرم تھا ایک روز ایک پروڈیوسر کو سکرپٹ کی سخت ضرورت تھی اسے دوسرے دن ڈرامہ سیٹ پہ لے جانا تھا جو سکرپٹ موجود تھا اسے قبول نہ تھا۔ پروڈیوسر کا نام تھا آصف شاہکار۔۔۔ سرمد کی ذمہ داری تھی کہ وہ سکرپٹ مہیا کرے۔ اس نے مجھے سامنے بیٹھا دیکھ کر کہا ''تم کیوں نے نہیں لکھتے۔۔۔ لکھو ڈرامہ۔۔۔ ریڈیو کے لیے لکھتے رہے ہو۔۔۔ اور'' اس نے رک کر کہا۔۔۔ یہ پچیس منٹ کا سکرپٹ ہے۔۔۔ پنجابی کا۔ (سرمد پنجابی کا معتبر شاعر ہے خصوصاً کافی لکھنے میں۔۔۔ زبردست ہے) میں نے ممیانے کی کوشش کی مگر اس نے فیصلہ کن انداز سے آصف سے کہا ''اسے لے جاؤ۔۔۔ سیدھے ''سلاطین'' چلے جاؤ۔۔۔ وہاں ڈس کس بھی کرو اور لکھواؤ بھی۔۔۔ اسے چھوڑنا نہیں۔۔۔''

میں بہانے ہی ڈھونڈتا ہا اور سرمد نے مجھے آزمائش میں ڈال دیا وہ ڈرامہ جس کا نام ''اگ تے نروان'' تھا میرا پہلا ڈرامہ تھا وہ ٹیلی کاسٹ ہوا تو پھر مجھے ٹی وی والوں نے نہیں چھوڑا۔ جب لانگ پلے کا پروجیکٹ شروع ہوا تو

میرے پاس محمد نثار حسین اور سرمد آئے۔۔۔آئے تو قاسمی صاحب کے پاس تھے بلکہ ہفتے میں دو بار آتے تھے کہ وہ لانگ پلے کے لیے سکرپٹ لکھ دیں مگر پچھلے تین ماہ سے وہ گریز پا تھے سو ایک روز میرے پاس آ گئے۔۔۔انہوں نے مجھے قائل کر لیا۔۔۔یہ میرے لیے ایک چیلنج تھا۔سو میں نے آٹھ دنوں میں جو سکرپٹ لکھا وہ ''کانچ کا پُل'' کا تھا جو ایک سو چوبیس منٹ پہ محیط تھا میوزک گانے کے بغیر۔۔۔ صرف مکالموں کے جمال سے کہانی کھلتی چلی جاتی۔۔۔ ۱۷ ستمبر ۱۹۸۱ء کو وہ ڈرامہ ٹیلی کاسٹ ہوا تب محمد صفدر میر سے انتظار حسین تک اور احمد بشیر سے خالد احمد تک (انگریزی میں کالم نگاری کرنے والے خالد احمد) سب نے مجھے زندہ کر دیا۔احمد بشیر نے تو مجھے دس بارہ سینئر ادیبوں کے سامنے ٹی ہاؤس میں کھڑے ہو کر کہا ''اٹھو۔۔۔کھڑے ہو جاؤ'' میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا تو احمد بشیر نے میرا ماتھا چوم کر کہا

''ایسی چنگاری بھی یا ربّ
اپنے خاکستر میں ہو''

☆ آپ کو حادثاتی ادیب کہا جائے تو آپ کا ردِ عمل کیا ہوگا؟

☆☆ حادثے سے صرف موت واقع ہو سکتی ہے ادیب نہیں بنا جا سکتا۔ کیونکہ ہر کہانی کے پیچھے ایک نہیں کئی کہانیاں ہوتی ہیں گویا کہ:

دردو غم کتنے کیے جمع تو دیوان کیا

☆ ہر روز کہانی کی جستجو عادتاً ہے یا ضرورتاً؟

☆☆ اصل میں کہانی کو میری ضرورت ہے وہ ہر روز مجھے کہیں نہ کہیں تلاش کر لیتی ہے۔۔۔اس کے کردار میرے سامنے آ کھڑے ہوتے ہیں۔ جہاں سست ہوا کہانی کل پہ ٹل جاتی ہے۔فوراً بیٹھ گیا تو کچھ نہ کچھ ضرور مل جاتا ہے۔

☆ کہانی آپ نچلے اور متوسط طبقے کی لکھتے ہیں اور رہائش ڈیفنس میں رکھتے ہیں؟

☆☆ دل نے ایک ایک دکھ سہا تنہا۔۔۔انجمن انجمن رہا تنہا۔۔۔ میں کہیں بھی رہوں مگر میں جیتا اپنے ہی کرداروں میں ہوں۔مجھ پر اعتراض ہوتا کہ آپ ڈرائیور کے ساتھ بیٹھ کر چائے پیتے ہیں۔۔۔چپراسی کو برابر بیٹھاتے ہیں اور ملازم سے آپ جناب کہہ کر مخاطب ہوتے ہیں یہ میرے اندر کی کوئی آرزو ہے مجھے نہیں معلوم۔۔۔اور مرزا رسوا نے جو میرے گرو ہیں، کہا تھا۔۔۔''سچے لکھنے والے میں عجز، ایثار اور شرمیلا پن ہوتا ہے۔'' اور شاید یہی درست ہے۔

☆ کہانی کو دانستہ دلچسپ بنانے کے لیے کون کون سے گُر آزماتے ہیں؟

☆☆ کم لفظوں میں زیادہ یا بڑی بات کہنے کی کوشش

☆ ادب بالخصوص اردو ادب میں گفتگو کم اور عمل زیادہ کی توقع بے جا نہیں؟

☆☆ یہ توقع ادب سے نہیں ادیب سے رکھی جاتی ہے وسائل، اہلِ وسائل کے پاس اور مسائل ادیب کی جھولی میں پھینک کر توقع کی جاتی ہے کہ یہ سارے معاشرتی نظام کو بدلے۔

☆ آپ جس بے دردی اور بے باکی سے معاشرتی گرز چلاتے ہیں اس کے پیچھے کون سی قوت کارفرما ہے؟

☆☆ حقیقت پسندی سے زیادہ سنگدلی اور کیا ہوگی؟ اگر اس معاشرے میں ہریالی کم اور کیکٹس اور آکاس بیلیں زیادہ ہو رہی ہیں تو مت کاٹیے۔نشان دہی تو کر دیجیے۔۔۔سچائی ایک طاقت بھی ہے تلوار بھی۔۔۔ہتھیار بھی۔گلزار بھائی! آپ اس نکتے کو مجھ سے کہیں بہتر سمجھتے ہیں۔

☆ میجک ریالزم، فسونی حقیقت نگاری کا استعمال کیوں ضروری خیال کرتے ہیں؟

☆☆ اس لیے کہ اس کے بغیر وہ بات مکمل نہیں ہوتی جو آپ کہنا چاہتے ہیں۔۔۔اور اسی سے نئے چراغوں کی لَو تراشی جا سکتی ہے، راستے بچھائے جا سکتے ہیں، منزلوں کی کھوج کا آ نما ہو سکتا ہے۔

☆ گذشتہ کچھ عرصہ سے سرمایہ داری اور جاگیرداری کو کثرت سے نشانہ بنانے کے وجوہات کیا ہیں جبکہ تمام شعبہ ہائے زندگی کے بیشتر افراد اس دلدل میں دھنسے ہوئے ہیں؟

☆☆ دلدل میں وہی مراعات یافتہ دو فیصد لوگ دھنسے ہیں جنہیں یہ خبر نہیں کہ قارون کا بھی رزق خاک ہوا۔ اور فراعنہ جفر کے مقابر خزانوں سے بھرے ہونے کے باوجود ان کے لیے کوئی آسودگی پیدا نہ کر سکے۔ ہمارے یہاں ستانوے اٹھانوے فیصد لوگ دکھوں اور صعوبتوں میں سسکتے ہیں مگر ہر ہزار میں دو لوگ وہ بھی ہیں جن کا خیال ہے کہ کفن میں جیب لگائی جا سکتی ہے۔۔۔قبر میں لاکرز بنوائے جا سکتے ہیں۔وہ کینسر کے اس خلیے کی طرح ہیں جو رزق تو دس خلیوں کا کھاتے ہیں مگر باڈی کے اندر خاموشی سے بیکار بیٹھ جاتے ہیں اور زندہ انسان کو ہڈیوں کا ڈھانچہ بنا جاتے ہیں کیا اس صورت حال کو نشانہ بھی نہ بنایا جائے؟ علامہ اقبال نے کہا تھا:

کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ

☆ کیا تخلیق کار حقیقت پسند ہو کر کوئی کارنامہ انجام دے سکتا ہے بلخصوص تیسری دنیا کا تخلیق کار؟

☆☆ ہم اگر برائی کو روک نہیں سکتے تو کم از کم اس کے بارے میں زیادہ سے زیادہ گفتگو تو کر سکتے ہیں اس کی نفی تو کر سکتے ہیں۔ ہر تخلیق کار ریشم کے کیڑے کی طرح ریشم بُنتا رہتا ہے اور خود اندر ہی مر کر دوسرے کے لیے ریشم چھوڑ جاتا ہے۔کارنامہ کیا ہوتا ہے۔۔۔وہ نہیں جانتا کیونکہ خوشبو لگانے والے کو ایک منٹ بعد ہی اس کا اچھا بُرا احساس نہیں رہتا۔۔۔دوسرے لوگ اس کا فیصلہ کر سکتے ہیں۔آپ ایسے صاحبِ نظر لوگ؟

☆ آپ کے ہاں فیشن ایبل خواتین یعنی اونچے طبقے کی کہانیوں میں

مصنوعی پن کیوں نظر آتا ہے؟

☆☆ فیشن میں لپٹی خواتین جو سراسر ملمّع چڑھی دنیا کی باسی ہیں۔۔۔کیا ان میں مصنوعی پن یا تصنّع نہیں ہوگا؟ اگر ان کرداروں سے کسی کو مصنوعی پن جھلکتا بلکہ چھلکتا دکھائی دے جائے تو ظاہر ہے یہ تو فنکار کی جیت ہے جو انہیں پینٹ کرتا ہے ان کے پورٹریٹ بناتا ہے۔

☆ جو لوگ آپ پر منٹو کی بھونڈی نقالی کا الزام لگاتے ہیں اُن کے لیے آپ کے پاس کیا جواب ہے؟

☆☆ منٹو صاحب کی نقالی اور بھونڈی نقالی کا الزام اگر کسی نے مجھ پر لگایا ہے تو مجھے اس کی خبر نہیں۔ میرا اسلوب اور انداز ''میں ایک زندہ عورت ہوں'' کے افسانوں سے تبدیل دکھائی دیا مگر اس میں عورت کے مختلف شیڈ جو میرا مشاہدہ تھے میں نے پینٹ نہیں کیے خود بخود پورٹریٹ بنتے گئے۔ میرے زمانے میں عورت کے نئے روپ اس معاشرت میں اترتے تھے لاہور جیسے شہر میں ہزاروں عورتیں رجسٹرڈ تھیں اس کے برابر ''لذ بین'' تھیں ان پر کہانی لکھنے کی مجھ پر ممانعت تھی کہ میں نے اُسی پروفیسر کا مشاہدہ کیا تھا جب اس سے وعدہ بھی کرنا پڑا۔ ابھی تک لذ بین پر کہانی نہیں لکھی حالانکہ میرے پاس بہت کردار کلبلا رہے ہیں مگر خاکوں کی کتاب ''ذکر اس پری وش کا'' درمیان میں ہے۔۔۔ یوسف کامران اور امانت علی خاں کے خاکے باقی ہیں۔ باقی اٹھارہ ہو چکے ہیں زندگی نے مہلت دی اور صحت مندی نے ساتھ دیا تو یہ بھی ہوگا۔ یہی میرا جواب ہے۔

☆ ایک خیال یہ ہے کہ آپ تیل نکلے تِلوں سے دوبارہ تیل نکالنے کی کوشش میں سرگرداں ہیں؟

☆☆

سیف اندازِ بیاں بات بدل دیتا ہے
ورنہ دنیا میں کوئی بات نئی بات نہیں

آپ تو جانتے ہیں گلزار صاحب۔۔۔ ہم جو کچھ سوچتے ہیں، لکھتے ہیں یا لکھنا چاہ رہے ہیں ہم سے پہلے لکھا جا چکا ہے۔۔۔ الفاظ کا چناؤ۔۔۔ اسلوب اور بات کہنے کا ڈھنگ بدلنے کے ساتھ نسل بھی بدل جاتی ہے۔۔۔ تازہ تِل کسی کے پاس ہوں تو بتایئے؟

☆ کبھی کبھی الفاظ کا چناؤ بھی آپ کے ہاں مستعار لگتا ہے؟

☆☆ الفاظ کے چناؤ میں، میں بے حد محتاط ہوں جہاں لفظ میسّر نہ ہو میں تخلیق کر لیتا ہوں اور لوگوں نے بھی یہ کیا ہوگا۔ ہر کہنے والے کے پاس ڈیڑھ دو سو لفظ ہی تو ہوتے ہیں مگر میں مثال دیتا چلوں۔۔۔ کرپشن کی ڈیل کے لیے ایک لفظ میں نے ''اندھیرا اُجالا'' میں چھ ڈراموں میں لکھا تھا ''مُک مُکا'' اب یہ لفظ ہماری ڈکشنری کا حصہ تقریباً بن چکا ہے بڑے سے بڑے لیڈر یا اینکر پرسن آج اسے بلا جھجک استعمال میں لا رہے ہیں۔ ڈرامہ ''آواز'' ''احساس'' میں مَیں نے لکھا تھا پھر چار اور ڈراموں میں بھی تھا زبان کا حصہ بننے میں کتنے برس لگے؟ لگ بھگ تیس سال لفظ تو اور بھی تھے مثلاً ڈرائنگ روم، لیبارٹری جنہیں لوگ قبول کر چکے ہیں۔ تب مجھے کوئی بھی لفظ کسی سے مستعار لینے کی کیوں ضرورت پیش آتی۔

☆ ایک ذمہ دار اور صاحب علم اہلِ قلم کو موضوعات کے چناؤ اور اُن کے برتاؤ میں کس قدر آزادی ہونی چاہیے؟

☆☆ مکمل آزادی اس لیے ہونی چاہیے کہ لکھاری کے اپنے اندر بھی ایک سنسر کوڈ موجود ہوتا ہے۔ اسے معلوم ہے کہ بات کہنے کا انداز کیسا ہونا چاہیے۔ پابندی لکھنے والے کے لیے جبر ہے جو اس کے ذہن کو پامال کر دیتی ہے۔ مثلاً پی ٹی وی پہ شروع میں پوزیٹو کردار میں ایک فرشتہ سیرت ڈاکٹر یا افسر یا وکیل تو دکھا سکتے تھے مگر حقائق کے مطابق بڑے ڈاکٹر یا افسر یا وکیل کے بارے میں نہیں لکھ سکتے تھے بلکہ شروع میں تو کوشش یہ تھی کہ پیشہ کسی کردار کا معلوم ہی نہ ہو۔ میرا ایک پورا ڈرامہ دوبارہ نیا سیٹ لگا کر ریکارڈ کیا گیا تھا کہ ہر چند غربت کا لفظ تو استعمال نہیں کیا گیا مگر گھر، اس کا رہن سہن اور کرداروں میں غربت جھلکتی تھی اوپر سے روحی بانو جیسی لیجنڈ اداکارہ کی اداکاری کلیجہ چیرتی تھی اس پہ کسی کا حوصلہ نہ ہوا ٹیلی کاسٹ کرنے کا لہٰذا دوبارہ بہتر انداز میں ریکارڈ کروایا گیا۔ کیا اُس سے غربت ہمارے ذہنوں اور آنکھوں سے اوجھل ہو جائے گی۔

☆ مواد مقامی اور تکنیک بین الاقوامی کی اصطلاح آپ کے لیے استعمال کی گئی ہے یا دیگر اہلِ قلم کے لیے بھی۔ آپ اس خیال سے اگر اتفاق کرتے ہیں تو اپنی تکنیک کے حوالے سے کچھ فرمایئے؟

☆☆ ظاہر ہے۔۔۔ میں اپنے آس پاس کی کہانیاں لکھتا ہوں۔۔۔ پاکستان میرا ملک ہی نہیں محبوب بھی ہے لہٰذا مواد تو پاکستان ہی سے لیا جائے گا۔ تکنیک بین الاقوامی سے مراد میں کم از کم یہی سمجھتا ہوں کہ ہر بات کا جواز ہو، اس کی گہرائی اور معلومات کے حوالے سے مکمل ہو۔۔۔ محدود لفظوں مگر بہترین لفظ ہوں اور بہترین ترتیب سے سجے ہوں کہ موثر بھی ہوں دلچسپ بھی۔ یہ اصطلاح میرے ہی بارے میں پہلی مرتبہ استعمال ہوئی تھی مگر چونکہ اس سے پہلے یہ بات راجندر سنگھ بیدی کے حوالے سے بھی سنی تھی اور میں بیدی کے جزئیات نگاری کے فن سے متاثر بھی ہوں اور قائل بھی جہاں تک مجھ سے ممکن ہو سکا میں نے جزئیات نگاری کو کردار کی پرتوں میں سجا کر رکھا۔۔۔ میں اس میں کہاں تک کامیاب ہوا۔۔۔ یہ آپ بتا سکتے ہیں۔۔۔ میں نہیں۔

☆ جو لوگ آپ کی مرزا رسوا اور ڈپٹی نذیر احمد سے نسبت کا ذکر کرتے ہیں اُن کے بارے میں آپ کی رائے جاننا ضروری ہے؟

☆☆ مرزا رسوا۔۔۔ ایک جینئس تھا اس نے ناول اپنی ضرورتوں کے تحت لکھے بے مثال شاعری کی۔ اردو ٹائپ کا '' کی بورڈ'' اردو شارٹ ہینڈ اور حیدر آباد دکن کے لیے بے شمار تراجم بھی کیے۔ میں رسوا کی خاک پا کے برابر بھی نہیں۔

ڈپٹی نذیر احمد سے نسبت کن معنوں میں کس نے اور کب ذکر کیا مجھے اس کے بارے میں کچھ معلوم نہیں۔

☆ انگریزی کے کئی ادیب بلخصوص ڈی ایچ لارنس سے بھی آپ کی ذہنی ہم آہنگی بتلائی جاتی ہے؟

☆☆ بعض صورتوں میں میرے کرداروں کے محسوسات اور تحرک لارنس کے کرداروں کے تحرک اور محسوسات سے آملتے ہیں۔۔۔شاید اس لیے ایک آدھ نقاد نے اس کا ذکر کر دیا۔

☆ آغا حشر نے شیکسپیئر کو نقل کر کے ہندوستانی شیکسپیئر کا لقب پایا آپ نے طبع زاد ڈرامے لکھے مگر آپ کو کوئی لقب نہ دیا جا سکا؟

☆☆ الحمدللہ۔۔۔میں نقل کرنے سے محفوظ رہا اور کسی مصنوعی لقب سے بھی۔کیا عافیت اسی میں نہیں ہے؟

☆ آپ کی زندگی بجائے خود لا انتہاہی تجربات کا پُل ہے اس کے باوجود آپ نے ''کنجری کا پُل'' تختۂ مشق کیوں بنایا؟

☆☆ ''کنجری کا پُل'' نہ صرف لاہور کا علاقہ ہے بلکہ تاریخ بھی ہے ماضی بھی اور ان عورتوں کا حوالہ بھی جو آج کے دور میں اپنا روپ بدل چکی ہیں اور ان میں ''ادافروش'' بھی ہیں۔''پروفیشنل'' کے ساتھ ایک نیا فرقہ ''سیمی پروفیشنل'' بھی پیدا ہوا جو کسی بڑے گھرانے، شخصیت یا شہرت کے زینے پر قابض ہو کر ''ڈیرے داروں کی طرح منزلیں مارتی چلی جاتی ہیں۔خیر یہ تو الگ بحث اور لمبی کہانی بلکہ کئی لمبی کہانیاں ہیں۔مجھے انسپائر کرنے میں میرے اس ماضی کا حصہ ہے جو میں نے قرآن پاک حفظ کرتے وقت مشاہدہ کیا۔بیس سیپاروں کے بعد ہمارے اساتذہ کا اختلاف چینیانوالی مسجد کی انتظامیہ سے ہو گیا لہٰذا قاری فضل کریم نے اپنا مدرسہ یہاں سے اٹھا لے جانے میں ہی بہتری سمجھی۔۔۔تب مدرسہ تجوید القرآن لاہور کے موتی بازار میں اٹھ آیا۔موتی بازار مستی دروازہ سے لاہور میں داخل ہونے کے بعد آتا ہے۔اس کا ایک سرا ''بارود خانہ'' سے ملتا تھا جو بازارِ حُسن کا مین دروازہ ہے۔ایم اسلم صاحب بارود خانے کے ایک مردانے میں بیٹھ کر دن رات رطب ویابس قسم کے ناول لکھا کرتے تھے بقول ان کے بازارِ حُسن کا آدھا علاقہ انہیں کا تھا جس میں ہر طرح کی طوائف ان کی کرائے دار کی حیثیت سے مقیم ہو کر اپنا ''آفس'' چلاتی تھی میاں امیر الدین جو پنجاب کے گورنر بھی رہے ان کے عزیز بھی تھے یعنی ایم اسلم کے اُن کی حویلی بھی بارود خانے میں تھی جو زبردست تھی (دور ہے) یہ تمہید ضروری تھی مجھے اس بازار کی اہمیت کا احساس یا شعور تو بہت بعد میں آیا۔جس دن ہم مدرسہ کے تمام طلبا اٹھ کر موتی بازار کی ایک خوبصورت مگر ویران مسجد میں اٹھ آئے اس دن مجھے بتایا گیا کہ یہ خوبصورت مسجد جس کے نیچے دکانوں میں مسلمان کاروبار کرتے تھے۔اوپر کی منزل میں فلیٹ بھی استعمال کرتے تھے اور غسل خانے بھی مگر مسجد جو سیڑھیاں چڑھ کر اوپر کی منزل میں تھی۔۔۔کوئی نماز پڑھنے اس لیے نہ دیکھا گیا تھا کہ یہ مسجد ایک طوائف نے بنائی تھی۔اس مسجد کو آباد کرنے کا رسک قاری فضل کریم اور دیگر اساتذہ نے لیا۔ہم بچے تھے ہم نے اپنے نرم و نازک اور ننھے ننھے ہاتھوں سے مسجد کے فرش کو دھویا اور مدرسہ کا آغاز ہو گیا دوسرے واقعات بھی میرے لاشعور میں کلبلاتے رہتے تھے خصوصاً اماں طالعاں (فرضی نام) کی حویلی جس میں اس نے ۱۹۳۹ء میں خاکساروں کو پناہ دی تھی اور پھر خود ریزہ ریزہ ہوتی ہوئی ستم سہتے سہتے جان ہار گئی مگر اُس نے اپنا وعدہ نبھایا اور چودہ خاکسار جان بچا کر نکل گئے۔

☆ آپ کے ناول ''کنجری کا پُل'' کو اگر مستعار یا چبائے ہوئے چنوں سے تشبیہہ دی جائے تو آپ یقیناً خفا ہو جائیں گے؟

☆☆ آپ چاہیں جو بھی تشبیہہ دینا پسند فرمائیں مجھے خفا ہونے کا حق ہے نہ اختیار۔۔۔کہانی بیٹی کی طرح ہوتی ہے۔۔۔ڈولی میں اتارنے کے بعد اس کا جو نصیب۔مگر ''کنجری کا پُل'' میں بہت سے واقعات بالکل درست ہیں۔سندھ کا سیاسی وڈیرہ جو اپنے سیاسی دشمنوں کو محبت میں گوندھ کر شراب اور عورت سے وار کرتا تھا حتیٰ کہ وہ جان ہارتے چلے گئے کہ کبھی دل کے کمزور اور پیشنٹ تھے نقل کرنا یا مستعار لے لینا میرے مزاج کا حصہ ہی نہیں۔

☆ شوقِ آوارگی یا ادیب کا اشتیاق آپ کو اُس گلی تک لے گیا جس کا نام لینا بھی تلوار کی دھار پر چلنے کے برابر ہے؟

☆☆ اول تو میں پس منظر بیان کر چکا ہوں دوپہر کے وقت جب میں فارغ ہوتا تھا، خوب گھومتا تھا، جہاں ریڈیو بجتا ہوا ملتا اسی جگہ کسی تھڑے پر بیٹھ کر گیت سننا بھی مجھے بہت پسند تھا پھر چند روز بعد عین بازارِ حُسن کے ایک کیفے میں جانے کا اتفاق ہوا جہاں گانے بھی اچھے بجائے جاتے تھے اور چائے بھی دو آنے میں ملتی تھی۔اس علاقے کو خصوصی طور پر ''ہیرا منڈی'' کہا جاتا تھا جس گلی کی طرف آپ کا اشارہ ہے وہاں سے تو میں تب گزرا جب میرے ساتھ اعجاز حسین بٹالوی اور انتظار حسین بھی تھے اصل میں ہم تینوں کا معمول کچھ سالوں سے بن چکا تھا کہ محرم کی چار، پانچویں شب کو جو شبیہ ذوالجناح مبارک بیگم کے امام باڑے سے برآمد ہوتی تھی اور جس کے پیچھے بغیر میک اپ کے طوائفوں کا ماتمی جلوس بھی ہوتا تھا اور دیگر خواتین و حضرات بھی ہوتے تھے اعجاز بٹالوی اور انتظار حسین جایا کرتے تھے بعد میں کچھ سال میں بھی شریک ہوا اسی سلسلے میں آتے جاتے اعجاز صاحب نے اس گلی کی نشان دہی ہی نہیں کی بلکہ اس سے گزر بھی گئے اور اماں طالعاں کی حویلی کی نشان دہی بھی کی جو اس وقت کے تھانے کے بالکل سامنے تھی۔

☆ اُن لوگوں کا رہن سہن، بود و باش، مزاج اور سوچنے سمجھنے کے اطوار جاننے میں آپ کو کن کن مراحل سے گزرنا پڑا؟

☆☆ میں نے ہوش سنبھالنے کے بعد ایک ہی مرتبہ سول لائن تھانہ کسی شخص کی ضمانت دینے کے لیے دیکھا۔رات کے دو بجے جو ماحول میں نے دیکھا وہی کافی تھا اور میں نے سارے مشاہدے کر لیے۔۔۔اسی طرح ٹی ہاؤس سے ادیبوں کا ایک قافلہ ''بھٹی تکہ شاپ'' جو صفاں والے چوک میں ان دنوں بے حد پاپولر تھی کہ پل پل براتوں کی طرح لوگ جمع ہو جاتے تھے جگہ ملنا محال تھا۔باقی سب لوگ ٹی ہاؤس کے باہر ریگل بار سے (ٹی ہاؤس کے ساتھ والی دکان ''ایگل

سائیکل کمپنی''تھی۔رات کو بند ہونے کے بعد سب بلانوش اسی کے تھڑے پہ مے خانہ آباد کرتے جسے ''ریگل بار'' کہا جاتا تھا) فیض یاب ہوکر کباب کھانے بھٹی تکہ آئے تھے صرف میں ہوش میں تھا۔سو میں نے اندازہ لگا لیا کہ ہر نشے والے گاہک کا حساب غلط جوڑا جا رہا ہے۔لہٰذا میں نے سارے تکّوں کبابوں اور پلیٹوں کا حساب نظر بچا کر لکھنا شروع رکھا۔آخر میں کھُلا کہ ایک سوچھپن کباب اور پچپن تکے نہ تھے صرف چھپن کباب تھے اور پچیس تکے تھے اور صرف تین عدد نان۔ یوسف کامران میری ہوشمندی سے بہت خوش ہوا اور جاوید شاہین، سلیم شاہد اور دیگر بھی کہ بہت سے روپے میری وجہ سے بچا لیے گئے بلکہ منیر نیازی کی زبان میں سب یا یوسف کامران افراطِ زر کا شکار ہو گئے۔سوال تھا کہ ان ڈھیر سارے رپوں کا کیا کیا جائے؟

''گانا سنا جائے'' پتہ نہیں کس نے کہا تھا۔دوسری ٹیبل سے ایک شاہ خرچ اجنبی نے زور سے پکارا ''اور یہ سب کچھ میری طرف سے ہوگا'' سب نے حیران ہو کر اجنبی کی طرف دیکھا۔اس نے نوٹوں کی گڈی نکال کر سامنے رکھ دی اور کہا ''چلئے اُٹھیے'' ہمارے پاس ایک ہی گاڑی ہے سب کیسے جائیں؟ یوسف نے تاسف کے ساتھ اجنبی کو مطلع کیا۔

''میرے پاس کوسٹر ہے۔۔۔سولہ آدمی کے لیے۔۔۔ڈرائیور ہے اور ایک ایک پیگ کا انتظام بھی ہے۔۔۔''ایک نعرے کے ساتھ سب اٹھ گئے۔بس وہی ایک محفل دیکھنے کا اتفاق مجھے ہوا جس سے میں نے بہت کچھ دیکھا، سیکھا۔۔تحیّر سے باہر نکلنا مشکل ہو رہا تھا سارا مشاہدہ حیران آنکھ سے کیا اس اجنبی نے بہت نوٹ لٹائے۔زاہد ڈار اپنی طرف سے کچھ دینا چاہ رہا تھا اس نے اپنی گھڑی اتار کر طوائف کے گاؤ تکیے کے نیچے رکھ دی اور نکل گیا۔بس وہ نکلا تب محفل بھی برخواست ہوگئی۔۔۔سارے مراحل طے ہو چکے تھے۔

☆ آپ کے خیال میں اُن لوگوں کا شمار گناہ گاروں میں کیا جانا چاہیے یا مزدور پیشہ لوگوں میں؟

☆☆ خون پسینے کی کمائی کرنے والوں کو میں بے حد عزت دیتا ہوں اور یہ وہ لوگ ہیں جن کی زندگیاں دکھوں سے لدی پھندی ہیں اور سبھی کوئی کہیں سے کوئی کہیں سے ایک نکتے پر جمع ہو جاتے ہیں کہ سارے راستے مسدود کر دیے گئے تھے۔مزدور پیشہ ہونا تو ایک معمولی بات ہے وہ لوگ اس کالی صعوبت زدہ زندگی کو شکست دینے میں مصروف ہیں۔ دنیا نے انہیں عزت سے سیکس ورکر کا ٹائٹل دے دیا ہے ہم لوگ منافق ہیں اور منافق گناہ گاروں سے بھی بڑا گناہ گار ہے۔

☆ شنید یہ ہے کہ ''کنجری کا پُل'' کی سیاحت میں خود مصنف بھی بابا عطار کی طرح بار بار گرتا سنبھلتا رہا ہے؟

☆☆ میں شوبز سے برسوں وابستہ رہا۔گرنے سنبھلنے کا وقت تھا نہ مزاج۔ یہاں شکار ہونے کو بہت لوگ گرے سنبھلے مگر یہ راستہ، تخلیق، ڈراما یا کہانی سے دور ہوتا چلا جاتا ہے۔لہٰذا میں نے مشاہدے، امیجینیشن اور حافظے سے کام لے کر خود کو مکمل کرنے کی کوشش کی۔

یوں بھی یہ مفروضہ قابل توجہ ہے شاید غلط بھی۔۔۔ریاض خیر آبادی نے شراب کو چھوا نہ چکھی مگر اس کے تمام اشعار جام و سبو اور مے خانہ سے مزیّن ہیں اسی طرح منٹو صاحب نے عورت کو اولیت دی وہ طوائف ہو یا وقتی پروفیشنل انہوں نے مشاہداتی طور پر اس پر لکھا مگر ان کی اپنی کہانی بے حد پاکیزہ تھی۔صنفِ نازک کے کوچے تک وہ گئے بھی مگر کسی نہ کسی مظلوم عورت کی مدد یا دلجوئی کے لیے (میں نے تفصیلی واقعات فلم ڈائریکٹر ولی صاحب کے حوالے سے قتیل شفائی کے خاکے میں یا میرے مضمون ''منٹو صاحب'' میں درج ہیں مگر لبّ لباب وہی ہے جو عرض کر دیا گیا ہے۔

☆ یہ تصور کہاں تک درست ہے کہ آپ کی زندگی کا دوسرا ونڈر لینڈ صنفِ نازک کے کُوچے میں جا کر دم توڑتا ہے؟

☆☆ کون ہے جس کا دوسرا ونڈر لینڈ صنف نازک کے کوچے میں جا کر دم نہیں توڑتا؟ اگر کوئی کہتا ہے کہ میں اس سے مبرّا ہوں تو غلط کہتا ہے۔

☆ آپ کے ہاں جس قدر تلذذ نظر آتا ہے اُسے ماہرِ نفسیات ذہنی علالت سے تعبیر کرتے ہیں؟

☆☆ اعمال خراب ہونے سے سب سے پہلے ہم سے ہماری لذتیں چھین لی جاتی ہیں۔اگر کسی تصویر، تحریر یا تقریر سے کسی بھی قسم کا حظ اٹھایا جا سکتا ہے تو کیا بُرا ہے؟ میرے خیال میں اسے زندگی کا ضرور حصہ سمجھنا چاہیے اور قبول بھی کر لینا چاہیے البتہ ماہرین نفسیات کا معائنہ ضروری ہے جن کی قدغنیں انہیں زندگی کے آخر میں ڈبو دیتی ہیں۔

☆ ہر فنکار کا کوئی نہ کوئی ملک ضرور ہوتا ہے آپ کے لیے پاکستانی افسانہ نگار کی اصطلاح استعمال کرنے والے آپ کا سکوپ کم نہیں کر رہے؟

☆☆ یقیناً۔۔۔میرے لیے ہی نہیں سب کے لیے سرحدیں قائم کر کے بات نہیں کرنی چاہیے۔فنون لطیفہ ہی وہ خوبیاں آشکار کرتے ہیں جو انسان کے اندر سے بہ ہم سمیت شدت پسندی اور بے جا بغاوت کو منہا کرتے ہیں سو۔۔۔وہ ہر ملک ہر خطے کے لیے ہوتے ہیں ان کی سرحدیں آفاقی ہونی چاہئیں زنانہ مردانہ ڈبوں یا مذہب کے نام پر مختلف دائروں میں مقیّد کرنا آفاقی اور زندہ ادب کی توہین ہے۔

☆ دو قومی نظریہ بھی آپ کے ہاں اُجاگر کیا جاتا ہے جبکہ شواہد کچھ اور ہی دہائی دے رہے ہیں؟

☆☆ ہندوستان کی موجودہ شدت پسندی آپ سے کس بات کا تقاضا کر رہی ہے۔صلح کل شخصیات اپنے ایوارڈ واپس کر کے ہی احتجاج کر سکتی ہیں۔میں تمام فنکاروں، اداکاروں، ہدایت کاروں اور موسیقاروں، سیاست دانوں اور اروندھتی رائے سمیت سب کو سلیوٹ کرتا ہوں جنہوں نے خود دو قومی نظریے کو

ایک طرح سے سپورٹ کیا ہے آج۔۔۔۲۰۱۵ء میں۔

☆ دیوارِ برلن کی نسبت دونوں اطراف کے لوگوں سے آپ کی ہمدردی بہت سے عالمی اور علاقائی معاملات کو ہوانہیں دے رہی؟

☆☆ جی نہیں۔۔۔میرا نشانہ وہ استعماری قوتیں ہیں جو ہتھیار بیچنے کے لیے بٹوارے کرتی ہیں اور انسانوں کی تقسیم ان کے لیے اپنے مفادات کی ایک سیڑھی ہے میں عوام کی ہی بات کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ وہی ظلم سہتے ہیں وہی دکھ جھیلتے ہیں اور وہی جنگوں کا سامنا کرتے ہیں۔۔۔اور جنگ انسانی حقوق کی سب سے ہولناک اور سفاک نفی ہے اور میں جنگ کے خلاف ہوں انسانیت اور صرف انسانیت کے حق میں ہوں۔اگر پاکستان ہندوستان میں انتقال آبادی کا خیال رکھا جاتا اور قائداعظم یہی چاہتے تھے جو جس جگہ ہے وہی درست تسلیم کر کے آزادی کے خواب کو تعبیر دی جاتی تو آج۔۔۔آج ہمارے علاوہ کچھ دوسرے ملکوں کے لوگ بھی آسودہ ہو جاتے۔لگ بھگ دوارب لوگوں کے سکون اور خوشحالی کا آسان نسخہ پتہ نہیں کیوں ضائع کر دیا گیا جو قائداعظم اور علامہ اقبال کا بھی خواب تھا۔

بعینہٖ دیوار برلن بالآخر تو ٹرنی پڑی جبکہ ہمارے ہاتھ میں رسی کا دوسرا سرا ہرگز نہیں ہے۔

☆ ایک لمحے کے لیے ہم آپ کو باغی قلمکار تسلیم کرلیں تو آپ کے مقابل کون ہوگا؟

☆☆ میرے مقابل کون ہوسکتا ہے۔کرپٹ مافیا، سرمایہ دار، لوٹ کھسوٹ کرنے والے شہنشاہ اور دیگر جابر بادشاہتیں اور وہ لوگ جو میرے قابل رہائش معاشرے کو جسے میں مزید خوبصورت بنانے کے جتن کر رہا ہوں (اور ہر ادیب یہی کرتا ہے) بدصورت، کالا اور جہنم نما بنا رہے ہیں۔

☆ آپ کے ڈرامے کی گونج چین اور جاپان کے علاوہ بھی سنی گئی ہے۔ ذاتی طور پر آپ اور ملک وقوم کو اس کے کچھ فوائد بھی ہوئے؟

☆☆ مجھے اطمینان ہوا کہ میرا لانگ پلے ''کانچ کا پُل'' بیجنگ یونیورسٹی کے نصاب میں شامل ہے۔ میں چین گیا اور باری باری سب کا تعارف کرایا جانے لگا، میرا نام سنتے ہی ایک خاتون میرے ساتھ آکر بیٹھ گئی اس نے نہایت نستعلیق اردو میں مجھے بتایا کہ ابھی تک آپ کا ڈراما پڑھایا اور دکھایا جا رہا ہے اور یہ بھی کہ ''اندھیرا اُجالا'' کے چھ خاص ڈرامے بھی ہمارے یہاں منگوائے گئے ہیں۔میرے لیے یہ قابل اطمینان ہی ہونا چاہیے کہ میرا ملک کا شملہ اونچا ہوا ہے۔ مادی فوائد کے بارے میں مجھے کچھ علم نہیں۔البتہ جب میں نے خاتون سے پوچھا کہ اسقدر شستہ اردو آپ نے کہاں سے سیکھی تو بیجنگ یونیورسٹی کی شعبہ اردو کی ہیڈ نے بتایا (نام مشکل سا تھا کہیں لکھا ہوا ہے مگر زبانی یاد نہیں) ''میں پنجاب یونیورسٹی کے اورینٹل کالج سے ایم۔اے کر کے آئی ہوں'' یہ بھی میرے لیے قابل فخر بات تھی۔

☆ تحقیق میں ناسخ کے انتخاب کی یقیناً ٹھوس وجوہات ہوں گی؟

☆☆ مجلسِ ترقی ادب کے دیگر فرائض اور صحیفہ کی ادارت کے علاوہ مجھے کوئی نہ کوئی کتاب مرتب کرنی ہوتی تھی اول ترین نسخوں کو سامنے رکھ کر موازنہ، اختلاف، حواشی اور مقدمہ۔۔۔لہٰذا جب مجھے بھاری بھرکم شاعر امام بخش ناسخ صاحب کا کلیات سپرد کیا گیا تو میں نے نہایت عرق ریزی سے اسے مرتب کیا۔ پنجاب یونیورسٹی کے اس وقت کے شعبہ اردو کے سربراہ ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا صاحب نے مجھے کہا تھا کہ آپ چاہیں تو اسے Ph.D کے لیے تیار کر سکتے ہیں مگر اس طرح اس کی اشاعت کئی سال تک رک جاتی۔اس وقت میں نے یہی غنیمت جانا کہ اسے چھپ جانا چاہیے۔

☆ آپ کے ہاں تنقیدی صلاحیتوں کا استعمال صنفِ نازک سے مشروط کیوں ہے؟

☆☆ نہیں تو۔۔۔شاید میں اس سوال کو سمجھ نہیں پایا۔

☆ آپ کی بابت جس قدر بھی تحقیقی کام ہوا ہے اُس سے آپ کس حد تک مطمئن ہیں؟

☆☆ جی نہیں۔۔۔ایم فل کے کئی تھیسز، ایم اے کے چار پانچ مقالے۔ ان میں صرف جاوید چودھری کا ایم اے کا مقالہ سب سے بہتر ہے علاوہ ازیں آغا گل کے دو مضمون، مبین مرزا کا ایک، پروین عاطف، محمد صفدر میر اور انور سدید صاحب کے چند مضامین اور مرحومہ ڈاکٹر منیبہ خانم صاحبہ کا ایک خاکوں پر مضمون میری عمر بھر کی کمائی ہے ایک نمبر رسالہ ''انگارے'' (ملتان) کا بھی نکالا تھا سید عامر سہیل نے۔۔۔بس یہی اثاثہ ہے۔

☆ آپ کے ہاں مقدار کے مقابلے معیار کو زیادہ اہمیت نہیں دی گئی؟

☆☆ بہتر تھا کہ میرے ایسے بڑے کام کی نشان دہی کر دی جاتی حالانکہ میرے سامنے ہمیشہ معیار ہی رہا۔اگر میں اس میں ناکام ہوا ہوں تو مجھے گائیڈ ضرور کیا جانا چاہیے تاکہ میں اصلاح کرسکوں۔

☆ آپ اپنے تخلیقی، تحقیقی، تنقیدی کام کو کس مقام کا مستحق گردانتے ہیں اور مستقبل کے حوالے سے کس طرح کی اُمیدیں وابستہ کیے ہوئے ہیں؟

☆☆ پتہ نہیں میں کسی مقام کا مستحق بھی ہوں یا نہیں۔یہ تو مجھے آپ ایسے جہاندیدہ سکالرز سے ہی معلوم ہوسکتا ہے۔مستقبل کے حوالے سے ادب سے کوئی امید وابستہ کرنا اسی دن کم کم ہو گیا تھا جس دن ادب کے پروفیشنلسٹ اور لفظوں کے شناوروں کے مقابلے میں صحافیانہ شذرے لکھنے والوں کی طاقت، اہمیت اور قدر بہت ٹاپ پر چلی گئی اور اسے ہی عروج اور کامرانی کے درجات دیے جانے لگے اور شاید حکومتیں بھی ان سے ڈرنے لگی تھیں سوان کے لفظ سونے میں تلنے لگے۔میں کس سے کس قسم کی امید وابستہ کرسکتا ہوں اور کیوں؟

☆

''اناج کی خوشبو''

سجاد باقر رضوی

(•)

یونس جاوید نئے افسانہ نگاروں میں نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ پچھلے سات آٹھ برسوں میں میں نے ان کے بہت سے افسانے سنے اور پڑھے ہیں۔ انہیں افسانوں کے حوالے سے میں ان سے متعارف ہوا اور اب جب کہ میں ان سے متعارف ہو چکا ہوں تو ان کے مجموعے ''تیز ہوا کا شور'' میں شامل افسانوں سے متعلق اپنے تاثرات کو آپ تک پہنچانا چاہتا ہوں۔ ایک بات یونس جاوید نے نہیں کی اور ایک میں نہیں کروں گا۔ یونس جاوید نے یہ افسانے موضوع یا تکنیک کے کسی خاص نظریے کے تحت نہیں لکھے اور میں ان افسانوں کے پیچھے یونس جاوید کی اپنی شخصیت کا سراغ نہیں لگاؤں گا۔ مجھے اس قسم کے سارے تجزیے یا تو فن کار کی چوری پکڑنے کے مترادف معلوم ہوتے ہیں یا پھر شخصیت کے قصیدہ کے ساتھ فن کا ذکر محض ''گریز'' دکھائی دیتا ہے۔

ان افسانوں کے ذریعے مجھے یونس جاوید کے متعلق محض اتنی سی بات کا علم ہوا ہے کہ وہ کہانی کہتے ہیں اور کہانی بھی گوشت پوست کے انسانوں کی۔ ان کے یہاں ''ہڈیوں کا ڈھانچ'' نہیں ملتا اس لیے کہ وہ کسی استعارے یا علامت کو کردار نہیں بناتے۔ ان کے کردار محض اسی معنی میں علامت بنتے ہیں کہ وہ کسی انسانی رویے یا رجحان کی نمائندگی کرتے ہیں۔ چوں کہ وہ بنیادی طور پر زندہ اور متحرک کرداروں کی کہانیاں لکھتے ہیں۔ اس لیے ان کی تکنیک کا اصل اصول یہ ہے کہ کہانی کی دل چسپی برقرار رہے۔ ان کی کامیاب کہانیوں کے موضوعات انسانی زندگی کی اس سطح سے حاصل کیے گئے ہیں جہاں حرکت و عمل پوری شدت سے نمایاں ہوتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ یونس جاوید کی سب سے زیادہ کامیاب کہانیاں وہ ہیں جن میں گفتگو کم اور عمل زیادہ ہے۔ متحرک اور توانا کرداروں کو حرکت اور عمل میں دکھاتے ہوئے پلاٹ پر ان کی گرفت مضبوط ہوتی ہے۔ چست پلاٹ اور جاندار کردار دونوں کے ساتھ یکساں انصاف کرنا، ان کے فن کی قوت کی دلیل ہے۔

یونس جاوید کے افسانوں کا موضوع نچلے متوسط طبقے اور نچلے طبقے کی زندگی ہے اور وہ نچلے طبقے کی زندگی کی عکاسی میں زیادہ کامیاب ہیں۔ ان کے افسانوں میں شہر اور دیہات دونوں ہیں۔ دیہات کی مٹی کی خوشبو ہے اور شہر کی ''چلت پھرت'' ہے۔ محنت مزدوری کرنے والے انسان ہیں اور ہل چلانے والے کسان ہیں۔ ایک افسانہ پارسی گھرانے سے متعلق ہے اور ایک کا ماحول برلن کی دیوار کی آس پاس ہے۔ پاکستان کی دیہاتی زندگی کے تعصّبات اور معتقدات سے لے کر عام انسانی زندگی کی محبت و نفرت تک افسانہ نگار کی گرفت مضبوط ہے۔ ان تمام باتوں کے باوجود یونس جاوید کے افسانوں میں ''نظریہ بازی'' مطلق نہیں ہے۔

نظریہ بازی ایک چیز ہے اور فن کار کی نظر سے اس کے زاویہ ہائے نظر اور وسعت نظر کا پتا لگنا دوسری چیز۔ ویسے میں ذاتی طور سے اس بات کا قائل ہوں کہ کسی نظریے کے تحت بھی فن کی تخلیق ہو سکتی ہے۔ بشرطیکہ نظریہ فنکار کی نظر بن گیا ہو اور فن میں اس کی حیثیت وہ نہ ہو جو پانی میں تیل کی ہوتی ہے۔ بات یہ ہے کہ نظریات کا تعلق شعور سے ہوتا ہے۔ فن کی تخلیق کے لیے تحریک کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ پس تخلیق کے لیے شعور اور لاشعور کا ارتباط و اتصال ضروری ہے۔ محض شعور اور معروضی حقیقتوں پر زور دینا یا محض لاشعور اور موضوعی صداقتوں کی بات کرنا بے معنی ہے۔ محض معروضی حقائق اور شعور کی بات کرنا ''بنجر پن'' کی تلقین اور محض موضوعی حقائق اور لاشعور پر ایمان ''پاگل پن'' پر اصرار ہے اور میری نظر میں یہ دونوں باتیں ''موت'' ہیں جب کہ تخلیق ایک نئی زندگی کی علامت اور حیاتیاتی عمل ہے۔

اسی مفہوم میں یونس جاوید ''نظریہ باز'' نہیں ہیں۔ معاشرتی زندگی کے چھوٹے موٹے انسانی دکھ، سکھ، محبتیں اور نفرتیں اور اسی قسم کے دیگر مثبت و منفی اقدار انسانی حوالوں اور ٹھوس مثالوں کے ذریعے فن کے جامے میں آ کر یونس جاوید کے افسانے بن جاتی ہیں۔ یونس جاوید اپنے افسانوں کے ذریعے اگر کسی چیز کے قائل معلوم ہوتے ہیں تو وہ انسان کا وقار ہے۔ انسان اپنی ادنیٰ ترین سطح پر بھی ان کے یہاں پر وقار نظر آتا ہے وہ نہ رجائیت کا پیغام دیتے ہیں اور نہ قنوطیت کا، اس کے باوجود ان کے افسانوں میں انسانی زندگی اپنی کمیت و کیفیت دونوں ہی اعتبار سے دلچسپ نظر آتی ہے۔

یونس جاوید کے افسانوں کی ایک مثبت قدر یہ ہے کہ ان میں تکنیک کے پیچھے بھاگ دوڑ نظر نہیں آتی۔ نئے نئے اسلوب اور نئے نئے پیرایہ بیان کی خواہش نہیں ملتی۔ وہ اپنے گاڑھے اور کھدر سے خوش ہیں، پرانے امریکی کوٹ انہیں نہیں بھاتے، اور بس کھردری اور بھدی مگر توانا اور جان دار زندگی کو اپنے سیدھے سادے رواں دواں پیرایۂ بیان میں بیان کرتے چلے جاتے ہیں۔ اور جہاں کہیں وہ اس سطح سے بلند ہو کر پُرتصنع زندگی کا نقشہ کھینچنے کی کوشش کرتے ہیں اور ان کے کردار مزدوروں، کسانوں، چوراچکوں کے بجائے پروفیسر اور دانش ور بننے کی کوشش کرتے ہیں تو وہ بے جان معلوم ہوتے ہیں۔ مگر ایسا ان کے یہاں بہت کم ہوتا ہے۔ بہت ہی کم۔ ایک دو افسانوں کو چھوڑ کر اس کتاب میں شامل تمام افسانوں میں زندہ موضوعات، زندہ اسلوب کے باعث زندگی کی گہما گہمی کو پیش کرتے ہیں اور اچھے فن کی اس بنیادی شرط کو پورا کرتے ہیں کہ فن کار خود سے، اپنے تجربوں سے، اپنے جذبہ و احساس سے سچ بولے۔ اس کا ایک ادنیٰ ثبوت یہ ہے کہ آپ ان افسانوں کو پڑھیے اور دیکھیے کہ آپ خود ان کی فضا میں سانس لیتے

ہیں اور ان کے بنائے ہوئے ماحول میں شامل ہیں۔ موضوع اور اسلوب کے اعتبار سے اگر آپ چاہیں تو یونس جاوید کو حقیقت پسند کہہ لیں۔ پھر بھی ان کی حقیقت پسندی بندھے ٹکے منصوبے کے تابع نہیں ہے۔ یوں کہیے ان کی حقیقت نگاری نظریاتی نہیں تجرباتی ہے۔ وہ تو دیوار برلن کے موضوع پر بھی لکھتے ہیں تو پوری کہانی افراد کے ذاتی دکھ اور ٹھوس انسانوں کے ٹھوس جذبات کے تانے بانے سے تیار کرتے ہیں۔

اور یہی کہانی ان کے اس مجموعے کی پہلی کہانی ہے۔ ''اس رات کا درد'' برلن کی دیوار سے پیدا شدہ انسانی صورت حال کے متعلق ہے۔ انسانی امنگوں اور آرزوؤں کے کسی بڑی اور اندھی قوت سے ٹکراؤ سے انسانی المیہ پیدا ہوتا ہے اور یہ کہانی ایسے ہی انسانی المیہ کی تفسیر ہے۔ افسانے کا ہیرو ولہیلم اس کی محبوبہ ماریانہ اور ایک لڑکا جومی دیوار کے اس سمت ہیں۔ ولہیلم کی ماں، اس کا اندھا چچا اور جومی کا دوست کتا دیوار کے اس سمت۔ ولہیلم اپنی ماں کو اس طرف لانا چاہتا ہے تاکہ اس کی موجودگی میں اپنی محبوبہ سے شادی کر سکے۔ بیٹا اپنی ماں سے ملنا چاہتا ہے اور ماں بیٹے سے ملنے کو بے قرار ہے۔ کہانی کا اختتام یوں ہوتا ہے:

ولہیلم دیوار پھاند گیا۔

دوسری صبح مشرقی اور مغربی برلن کے اخباروں میں دو الگ الگ خبریں چھپیں۔

مشرقی برلن کے اخبار میں لکھا تھا:

رات کے اندھیرے میں مغربی برلن کا ایک جاسوس گرفتار:

ملزم کے قبضے سے اہم دستاویزات برآمد ہوئیں۔

مغربی برلن کے اخباروں میں یہ خبر چھپی:

ایک بڑھیا نے اپنے اندھے دیور کے فلیٹ کی کھڑکی سے مغربی برلن میں چھلانگ لگا کر آمریت کے خلاف اور جمہوریت کے حق میں اہم پارٹ ادا کیا ہے۔

اس مجموعے کی دوسری کہانی ''نروان'' ''ماں جی'' کے کردار کا نفسیاتی جائزہ ہے۔ یوں کہنا بہتر ہوگا کہ ماں جی کا کردار ہی اس کہانی کا موضوع ہے۔ ''ماں جی'' ایک مریض انا رشک وحسد اور خود غرضی کا پتلا ہیں، مگر اس ہمدردی کے حوالے سے جو ایک معنی میں خود ان کی انا کا ہی دوسرا رخ ہے۔ ''نروان'' حاصل کر لیتی ہیں۔ اس کہانی میں افسانہ نگار نے ''ماں جی'' کے کردار کی خود غرضی کو ایک دوسرے رخ سے یوں پیش کیا ہے کہ وہ بے غرضی اور ہمدردی معلوم ہونے لگتی ہے۔

''رات کی اونچی فصیل'' بھی ''نروان'' کی طرح ایک کردار کے تجزیے پر مبنی ہے مگر یہ کہانی محض کردار کا تجزیہ نہیں۔ سسٹر سنجانا ایک پارسی لیڈی ڈاکٹر ہیں جو اپنی ماں کے ساتھ خوشحال کی زندگی بسر کرتی ہیں۔ ہمدردی اور اخلاص کا پیکر سسٹر سنجانا اپنے مریضوں کو دوا، دعا، خلوص و محبت سب کچھ دیتی ہیں ان کے پورے کردار میں ایک ایسا دھیما پن ہے جو ان کی ہم آہنگ شخصیت پر دلالت کرتا ہے۔ انہیں زندگی میں ایک ایسا سکون حاصل ہے جو محض ایمان اور ایقان کی دولت سے ہی ممکن ہے۔ بسا اوقات سسٹر سنجانا انسانی سطح سے بلند ہو کر فرشتہ لگنے لگتی ہیں۔ پھر ایک وقت ایسا بھی آتا ہے کہ سسٹر سنجانا کی پرسکون زندگی کے پیچھے کائنات کی مخفی قوتیں کارفرما ہو جاتی ہیں۔ وہ سیڑھیوں سے گر کر ایک لامتناہی تکلیف کا شکار ہو جاتی ہیں۔ اور رفتہ رفتہ اپاہج بن جاتی ہیں۔ پھر کائنات کی جابر قوتوں کے خلاف انسانی فطرت کا ازلی جذبۂ بغاوت سسٹر سنجانا میں عود کر آتا ہے۔

''انہوں نے چراغ کی سنہری لو کو دو ایک بار ہاتھ سے چھوا اور پھر تڑپ کر گلاس کا بچا ہوا پانی اس پر گرا دیا۔''

چراغ کا اس طرح بجھنا، زندگی کے آخری سہارے کے خاتمے کی علامت بھی ہے اور انسان کی ازلی بغاوت کا نشان بھی۔ مگر سسٹر سنجانا نے یہ چراغ خود بجھایا ہے اور اپنے اس فیصلے کے حوالے سے وہ فرشتوں کی صف سے نکل کر انسانوں کی صف میں شامل ہو جاتی ہیں۔

''سیدھا راستہ'' اپنی نوعیت کے اعتبار سے معاشرتی طنز ہے۔ افسانے کا ہیرو ''ہیرا'' ''سودے بازی'' چھوڑ کر سیدھے راستے کی تلاش کرتا ہے۔ یہ افسانہ ہیرا کی اس رات کی سرگذشت ہے جب وہ آخری بار ایک دو بڑے شکار کر کے، سیدھے راستے پر لگ جانا چاہتا ہے۔ تین چار بار کوشش کے باوجود وہ ناکام رہتا ہے مگر اس کی ہر ناکامی اس کے لیے ایک نیا انکشاف بنتی ہے۔ صبح ہوتے ہی وہ اپنی تمام ناکامیوں اور انکشافات کا بوجھ اٹھائے ساری رات کھلے رہنے والے ایک ہوٹل میں چائے پینے آتا ہے جہاں اس کی ملاقات اس کے ایک دیرینہ ساتھی ''بلاکی والے'' سے ہوتی ہے جو ''سودے بازی'' چھوڑ چکنے کے بعد دوبارہ اس ''دھندے'' میں شریک ہو جاتا ہے۔ ہیرے کے استفسار پر وہ اسے بتاتا ہے:

''پہلے سودا اٹھاتے تھے اور جیل ویل جاتے تھے۔ بعد میں معلوم ہوا سودا لوں یا نہ لوں، کوئی فرق نہیں۔ جیل بھی جاؤں گا مار بھی کھاؤں گا۔ ورنہ پولیس کو ماہوار ادا کروں۔ انہیں اس بات سے سروکار نہیں کہ میں سودا لوں یا چھوڑ دوں انہیں تو بس اپنا حصہ چاہیے اور جی حضوری اور خدمت گزاری الگ۔

ہیرا جو سیدھے راستے کا متلاشی تھا بلاکی والے کو رات کے تجربات یوں سناتا ہے:

''جتنے لوگ مجھے آج ملے تھے، میں نے سب سے ان کے پیشے کے بارے میں پوچھا تھا۔ ان سب کا پیشہ اور میرا تمہارا پیشہ ایک ہی ہے۔''

''وہ سب دھاڑیے تھے کیا؟''

''نہیں۔۔۔ یہ بات نہیں، بلکہ کوئی خوراک میں زہر ملاتا ہے اور کوئی سیمنٹ میں دریا کی مٹی۔ کوئی ٹیکس بچاتا ہے، کوئی مذاق میں لوگوں کو لوٹتا اور ہیرامنڈی آ کر لٹتا ہے۔ ایک ان میں ایسا بھی تھا صحیح معنوں میں بھوکا مر رہا تھا۔

سب سے زیادہ ہمدردی مجھے اسی سے ہوئی مگر میں اس کا پیشہ کیا بتاؤں؟۔۔۔وہ بھی میری طرح رات کا مسافر تھا۔ وہ کھمبے کے نیچے کھڑا ہو کر رات بھر سردی میں پڑھتا اور روگ خریدتا ہے۔ فاقوں کا علاج تو اس کے پاس ہے نہیں۔ البتہ وہ اپنے جسم میں پلنے والی بیماریوں کا علاج، پڑھ لکھ کر عمر کے آخری حصے میں ضرور کرا سکے گا۔ میرے لیے سب کے سب بیکار تھے۔ عجیب پیشہ ہے ان سالوں کا۔۔۔سب کے سب ایک دوسرے کو لوٹتے ہیں۔''

غالباً اس کتاب کا سب سے زیادہ جاندار افسانہ ''اناج کی خوشبو'' ہے جس میں ایک غریب گورکن کی کہانی بیان کی گئی ہے۔ رجائیت پسند افسانہ نگاروں نے تو ہمیشہ زندگی کی بات کی اور موت کے موضوع سے گریز کیا۔ اور ادب میں زندگی کے ہنگاموں کا ایک اثر یہ بھی ہوا کہ زندگی کا وہ ٹکڑا ابھی تجربے کے لائق نہ سمجھا گیا جو انسان کی موت اور قبرستان میں اس کی تدفین سے متعلق ہوتا ہے۔ یونس جاوید نے زندگی کے طبقاتی استحصال کو قبرستان کے حوالے سے بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ قبرستانوں میں طبقاتی احساس، نودولتی ذہنیت، قبروں کی قدر اور ان کے ساتھ دلی لگاؤ کا خاتمہ، ملوں کے لیے آہستہ آہستہ قبرستان کی زمین پر تصرف، قبرستان کے نگہبانوں کی تجارتی ذہنیت، گورکنوں کے معاشی مسائل، ان کا اپنے رزق کے لیے دوسروں کی موت کی دعا کرنا اور ان سب پیچ در پیچ مسائل کے بیچ انسانیت کا تاجرانہ ذہن کے خلاف شدید ردعمل۔۔۔اس افسانے میں یونس جاوید نے ان تمام باتوں کو موضوع بنایا ہے۔

''بڑے لوگوں سے میری مراد ان لوگوں سے ہے جو باپ دادا کے جنازوں کے ساتھ کاروں میں بیٹھ کر آتے ہیں اور قبرستان کی دیوار کے باہر کار کھڑی کر کے شیشوں میں سے دیکھتے رہتے ہیں۔''

''جب سوہنا مرا۔۔۔تو مجھے جھونپڑی اور قبرستان اور مٹی سے نفرت ہو گئی تھی مگر اس عورت کا خیال کر کے میری نفرت مر گئی۔ میں نے سوچا میرے دو بیٹے تھے، ایک قبرستان دوسرا سوہنا۔۔۔بڑے نے چھوٹے کو نگل لیا تو میں بڑے کو نگاہوں سے اوجھل کیوں کر دوں۔''

''بابا نے دیے سے نگاہیں ہٹا کر چھت کی طرف دیکھا، پھر ہاتھ اٹھا کر بولا ''یا اللہ ایک جنازہ ہی بھیج دے۔ میرے بچے کے لیے۔۔۔چھوٹا موٹا جنازہ۔۔۔کسی بچے کا جنازہ۔۔۔'' ''بچے کا جنازہ نہ کہو'' فاطمہ نے تڑپ کر کہا ''میں بچے والی ہوں۔۔۔بچوں کے جنازوں سے مجھے خوف آنے لگا ہے''۔۔۔''پگلی'' بابا نے شگفتہ لہجے میں کہا ''ہم تو اللہ میاں سے اپنا رزق مانگ رہے ہیں۔''

ان کہانیوں کے علاوہ اس کتاب کی اور کہانیاں مثلاً ''دوسری کہانی'' ''نجات'' اور ''پامسٹ'' وغیرہ بھی نہایت دلچسپ ہیں۔ موضوع کے لحاظ سے بھی اور فن کے اعتبار سے بھی، کہ یونس جاوید زندگی کی رنگارنگی کو پیش کرتے ہوئے، فن سے کبھی غافل نہیں ہوتے۔ ان کے یہاں فن بنیادی طور پر موثر انداز میں کہانی بیان کرنے کا فن ہے۔ ان کے کردار پلاٹ کی زمین سے پھوٹتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ پلاٹ کی چستی اور کرداروں کی زندگی آپس میں اس طرح مربوط ہوتے ہیں کہ ایک کو دوسرے پر فوقیت دینے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ اور اب ایک آخری بات:

یونس جاوید کے افسانے پاکستانی سرزمین پر رہنے بسنے والوں کے انسانی نقطۂ نظر کے ترجمان ہیں۔ ان کے یہاں پاکستانی انسان ہیں، بین الاقوامی انسان نہیں۔

''دورِمعراج''

منشی پریم چند کے بعد اُردو افسانے کا جو بھرپور دَور آیا تھا اسے افسانہ نگاری کا دورِ معراج کہنا چاہیے۔ بعض نقادوں کے نزدیک اب افسانہ نویسی کے اس انداز کو زوال آ چکا ہے حالانکہ سورج کو زوال نہیں آتا، وہ صرف زاویہ یا رُخ بدلتا ہے۔ جو اہلِ قلم اُس دور کی متوار روایات سے مثبت انداز میں متاثر ہوئے اور اُن روایات میں اپنی انفرادیت کو شامل کر کے ایک نیا اسلوبِ افسانہ نگاری اختیار کیا ہے، اُن چند ناموں میں یونس جاوید کا نام ایک عرصے سے نمایاں ہے۔ یونس جاوید کو افسانہ لکھنے کے لیے نہ علامتوں کی بیساکھیاں استعمال کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے اور نہ تجرید کے پینترے دکھانے کی حاجت ہوتی ہے۔ یہ فراریت پسند ذہنیتوں کے کُند ہتھیار ہیں اور یونس جاوید ایک سچا، جری، حقیقت پسند اور صداقت نگار ادیب ہے۔ اپنے باطن میں سیڑھیاں لگا کر اترنے کی بجائے اپنے اور اپنے کرداروں کے باطن کا غیر مشروط تجزیہ زیادہ جرأت مندانہ کام ہے اور یونس جاوید جرأت مندی کی اس شاہراہ پر کمال خود اعتمادی کے ساتھ، سرکشیدہ گامزن ہے۔ سادگی اور سلاست اس کے اسلوبِ تحریر کی سب سے بڑی خوبی ہے اور یہ خوبی صرف ان اہلِ قلم میں ہوتی ہے جن کے ہاں لفظیات سے زیادہ محسوسات و مشاہدات کو اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ یونس جاوید اپنے معاشرے کا نہایت دیانت دار ترجمان ہے اور اس ترجمانی کے فرائض وہ ذمہ داری کے علاوہ ایسی حُسن کاری سے ادا کرتا ہے کہ پڑھنے والا شروع سے آخر تک افسانے کی گرفت میں رہتا ہے۔ اور جب وہ افسانہ پڑھ چکتا ہے تو اسے محسوس ہوتا ہے کہ اس کا باطن زیادہ روشن ہو گیا ہے اور اس نے اسرارِ حیات کی کتاب کا ایک اور وَرق اُلٹا ہے۔

احمد ندیم قاسمی

بدلتی حقیقتوں کی نمائندگی

محمد صفدر میر

(●)

اُردو کی اصنافِ سخن میں سے ڈرامے کا فن غالباً سب سے کم عمر وسیلۂ اظہار ہے۔ یہ درست ہے کہ اُردو طبع زاد ڈرامہ لکھنے، اور بعض حالات میں اُسے سٹیج پر، یا کسی اور وسیلے سے تماشائیوں کے سامنے پیش کرنے کا رواج اب سو سال سے زیادہ پرانا ہو چکا ہے۔ اس کے باوجود حقیقت یہی ہے کہ ہمارے ادیبوں کے لیے صحیح معنوں میں ڈرامہ نویسی ابھی تک ایک اجنبی فن کی حیثیت رکھتی ہے اور اگر انہیں اس میدان میں ایک حد تک اپنا ہُنر آزمانے اور اس کی پیچیدگیوں، نزاکتوں اور تہ داریوں پر عبور حاصل کرنے کا موقع ملا ہے تو یہ ادھر دس بیس برس میں ٹیلی ویژن کی بدولت ہی ممکن ہو سکا ہے۔ بجا کہ اُن میں سے بعض لکھنے والوں نے بہت قلیل مدت میں ڈرامے کے عملی تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے میں اعلیٰ کارکردگی کا ثبوت دیا ہے اور اپنی خداداد ذہانت اور تخلیقی اُپج کی بدولت نہایت قابلِ قدر ڈرامے تصنیف کیے ہیں، جنہیں بین الاقوامی معیار کے مطابق قرار دیا جا سکتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ ہمارے لیے یہ تسلیم کرنا بھی ضروری ہے کہ ریڈیو کی طرح ٹیلی ویژن کے سکرپٹ لکھنے والوں کی اکثریت ابھی تک ڈرامے کے فن کی ابتدائی منزلوں ہی میں بھٹک رہی ہے۔

دنیا کی دوسری تہذیبوں کی طرح برصغیر کی تہذیب میں بھی شروع ہی سے سٹیج یا تماشا سازی کے فنون ۔۔۔ رقص، ناٹک، بہروپ، نقل وغیرہ کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ دوسرے ملکوں کی ڈرامائی روایات کی طرح یہاں بھی ان فنون کی بنیاد بڑی حد تک عوامی زندگی کے مذہبی اور تاریخی حوالوں اور دیو مالا پر رکھی گئی تھی۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ازمنۂ وسطیٰ کے ایک طویل عرصے میں جب برصغیر کے زیادہ تر حکمرانوں کا مذہب اسلام تھا، یہاں پر موسیقی اور کسی حد تک رقص کو چھوڑ کر سٹیج کے فنون کی زیادہ پذیرائی نہیں ہوئی۔ اس سارے زمانے میں بڑی حد تک یہ فنون پس منظر میں چلے گئے اور صدیوں تک ان کا نشوونما اور اِرتقاء رُکا رہا۔

انگریزوں کی حکومت کے زمانے میں جب تعلیم اور ثقافت کی بنیاد مغربی تمدّنی سانچوں پر رکھی گئی تو برصغیر میں ڈرامے کے فن کو بھی دوبارہ ترقی کرنے اور پھلنے پھولنے کا موقع ملا۔ لیکن اب اس کی بنیاد قدیم مقامی روایات پر کم اور یورپ کی تماشا سازی کی روایات پر زیادہ رکھے جانے کے حالات پیدا ہو چکے تھے۔ برصغیر کے جن علاقوں میں مغربی تمدن کا اثر زیادہ طویل عرصے تک اور زیادہ گہرا پڑا (مثلاً بنگال، مدراس، مہاراشٹر وغیرہ میں) وہاں کی زبانوں میں تھیٹر کے فنون کو ترقی کرنے کا زیادہ موقع ملا۔ اور اُن کے ادیبوں کے لیے اپنی کلاسیکی اور عوامی ڈرامائی روایات سے ازسرِ نو رشتہ جوڑنا ممکن ہو سکا۔

اُردو میں تھیٹر کا آغاز انیسویں صدی کے وسط میں نوابی لکھنو کے مخصوص تمدّنی اور ثقافتی حالات میں ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے طرزِ بیان و اظہار اور پیشکش کے طریقوں پر موسیقی اور رقص چھائے ہوئے ہیں۔ اور اس کی گفتگو کی زبان اور ادائیگی پر داستان گوئی کے مقطع و مرصّع بناوٹی اسلوب کا گہرا اثر ہے۔ لکھنو کا تھیٹر، ڈرامے سے زیادہ بیلے اور اوپرا کے زیادہ قریب تھا۔ انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے آغاز کی تین دہائیوں میں اظہار، پیشکش اور اُسلوب کے یہی انداز اُس عوام پسند کاروباری تھیٹر نے اپنا لیے جو شمالی ہند میں اُردو زبان کے ذریعے ظہور میں آیا۔ اس کے ڈراموں کے پلاٹ، یا تو داستانوں سے اخذ کیے جاتے تھے اور یا شیکسپیئر، مولیئر یا دوسرے مغربی ڈرامانویسوں کے شاہکاروں کے چربوں پر مشتمل ہوتے تھے۔ یورپی ڈرامے سے ہمارے تھیٹر کے فن کاروں اور تماشائیوں کی مرعوبیت کا یہ عالم تھا کہ اس کاروباری تھیٹر کے سب سے بڑے اور ہردلعزیز ڈرامانگار آغا حشر کو فخر سے ''انڈین شیکسپیئر'' پکارا جاتا تھا۔ آغا حشر کے کئی نہایت مقبول ڈرامے شیکسپیئر کے ہملٹ، کنگ لیئر، میکبتھ، رچرڈ سوم، کنگ جان وغیرہ سے ماخوذ تھے۔

بیسویں صدی کے آغاز کا کاروباری اُردو تھیٹر ایک بہت بڑا ثقافتی اور معاشرتی ادارہ تھا جو کلکتے اور بمبئی سے لے کر لکھنؤ، دلّی، لاہور اور پشاور تک کے شہری اور قصباتی درمیانی طبقے کی تفریحی ضروریات کو پورا کرتا تھا۔ لیکن تیسری دہائی میں متکلم فلم کے ساتھ ہی یہ تھیٹر رُو بہ زوال ہو گیا۔ اور دوسری جنگِ عظیم کے شروع ہونے تک اس کا کوئی نشان باقی نہ رہا۔ اس زمانے سے فلم ہی ڈرامائی تفریح کا بڑا ذریعہ بن گئی۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ اس میں سوقیانہ پن اور ابتذال کی سطح کاروباری تھیٹر سے بھی نیچے چلی گئی۔ نیو تھیٹرز جیسے چند اداروں کو چھوڑ کر زیادہ تر کمپنیوں کی فلمیں معاشرتی، نفسیاتی اور تہذیبی زندگی کے حقائق سے سراسر بے تعلق ہوتی تھیں۔

یہی زمانہ تھا جب برصغیر میں ریڈیو کو ایک اطلاعاتی اور ثقافتی میڈیم کے لحاظ سے اہمیت اور فروغ حاصل ہوا۔ اور معاشرے میں تھیٹر کے فقدان سے جو کمی محسوس ہوتی تھی اُسے کسی حد تک ریڈیو ڈرامے نے پورا کیا۔ ریڈیو ڈرامے کے مصنفین، ہدایت کار اور اداکار زیادہ تر پڑھے لکھے اور شائستہ طبقے سے تعلق رکھتے تھے اور ڈرامے کے فن کے اعلیٰ مدارج سے واقف تھے۔ لہٰذا اُن کی تخلیقات کی سطح کاروباری تھیٹر یا فلم کی نسبت بہت بلند ہوتی تھی اور بڑی حد تک جدید مغربی ثقافت کے پیمانوں پر پُوری اترتی تھی۔ اس ڈرامے کے چند نمایاں مصنفین ہیں: امتیاز علی تاج، رفیع پیر، عابد علی عابد، شوکت تھانوی اور عشرت رحمانی شامل تھے۔ اور ان کے ڈراموں نے ایک عرصے تک اہلِ ذوق کو متاثر کیا اور سامعین کی ایک بڑی تعداد کو ڈرامے کے فن کی اعلیٰ بلندیوں سے روشناس کرایا۔ لیکن مشکل یہ رہی

کہ ان کے اکثر ڈرامے جدید یورپی ڈرامہ نگاروں کے یک بابی ڈراموں سے ماخوذ ہوا کرتے تھے اور فی الحقیقت انہوں نے اُردو میں طبع زاد ڈرامے کے فروغ میں زیادہ حصّہ نہیں لیا۔ ریڈیو پر طبع زاد ڈرامے لکھنے کا زمانہ دوسری جنگ عظیم کے وقت آیا، جب کئی جدید اور ترقی پسند مصنفین مثلاً کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، اُپندر ناتھ اشک، سعادت حسن منٹو وغیرہ ریڈیو سے منسلک ہوئے تھے۔ ان ادیبوں نے نہایت مختصر زمانے میں نہایت اعلیٰ پائے کے طبع زاد ڈرامے ریڈیو پر پیش کیے۔

ریڈیو ڈرامے کی ایک بڑی کمزوری تو یہی تھی کہ بہت کم ڈراموں کے بارے میں وثوق سے یہ کہا جا سکتا تھا کہ یہ طبع زاد تخلیقات ہیں۔ اور دوسرے اس کا کینوس ایک ایکٹ کے مختصر ڈرامے تک محدود رہتا تھا۔ لہٰذا یہاں مکمل ڈرامائی کیفیت کا پیدا ہونا اکثر خارج از امکان رہتا تھا۔ پھر بھی اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ریڈیو ڈرامے کے رواج کی وجہ سے پہلی بار اُردو کے تخلیقی طور پر فعّال مصنفین نے ڈرامے کے فن کو عملی طور پر برَت کر دیکھا اور اس نئی صنفِ سخن کے تکنیکی رموز واسرار اور اسلوبیاتی خم و پیچ کا کچھ اندازہ کیا۔ ریڈیو ڈرامہ یقیناً اردو ڈرامے کے ارتقاء کی ایک نہایت اہم منزل ثابت ہوا۔

لیکن جس میڈیم نے ڈرامے اور ڈرامانویسی کے فن کو ہمارے یہاں سب سے زیادہ ترقی کا موقع فراہم کیا ہے۔ وہ ٹیلی ویژن ہے۔ اس کے کئی سبب ہیں لیکن سب سے بڑا سبب غالباً یہی ہے کہ ٹیلی ویژن کے نسبتاً بہتر معاوضوں کی بدولت ہمارے معاشرے میں تخلیقی مصنفوں کے لیے شاید پہلی بار یہ ممکن ہوا ہے کہ وہ محض اپنی تحریر کے ذریعے اپنی روزی کما سکیں اور ڈرامانویسی کو ایک پیشے کے طور پر اختیار کر سکیں۔ شاید میری اس بات میں کچھ مبالغہ نظر آئے اور لکھنے والوں کی طرف سے ٹیلی ویژن کے ناکافی معاوضوں کی بحث چھڑ جائے۔ میرا مقصد محض اتنا عرض کرنا ہے کہ ٹیلی ویژن کے لیے مسلسل سکرپٹ لکھنے سے بعض مقبول عام ڈرامانویسوں کو کم از کم اتنی آمدنی میسر آ جاتی ہے کہ وہ اپنا پورا نہیں تو زیادہ تر وقت یک سوئی کے ساتھ اپنے فنی کام میں صرف کر سکیں۔ یوں تو کاروباری تھیٹر کے اور فلم کے عروج کے زمانے میں بھی ڈراما لکھنے والے ادیبوں کے لیے ایسا ممکن ہوتا تھا لیکن تھیٹر اور فلم کے مخصوص حالات کی وجہ سے اُن کو بہت کم اس بات کا موقع ملتا تھا کہ وہ اپنی تخلیقی سطح کو اپنے آدرشی، فنی اور ادبی معیار کے مطابق قائم رکھ سکیں۔ ٹیلی ویژن کے سرکاری ادارہ ہونے اور تعلیم یافتہ منتظمین، ہدایت کاروں اور اداکاروں کے اس سے متعلق ہونے کی بنا پر ڈرامانویسوں کے لیے یہاں اعلیٰ فنی اور ادبی پیمانے کی تصانیف تخلیق کرنے کے حالات پیدا ہوئے۔

ایک اور وجہ سے بھی ٹیلی ویژن نے اُردو ڈرامے کے ارتقاء میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ اور وہ ہے سلسلہ وار ڈراموں اور طویل دورانیے کے ڈراموں کی ترویج۔ ان دونوں ذرائع کی بدولت ہمارے ڈرامہ نویسوں نے ایک ایکٹ کے مختصر ڈرامے کے محدود فنی امکانات سے بلند ہو کر کرداروں کے پھیلاؤ اور اِرتقاء اور پلاٹ کی پیچیدگیوں اور متنوع کیفیات سے عہدہ برآ ہونا سیکھا اور یوں ڈرامائی عمل کی امکانی وسعتوں اور اس کے تاثر کے ارتکاز اور شدّت کو بیک وقت اپنے بیان میں سمو دینے کی تکنیک سے شناسائی حاصل کی۔

اس سلسلے میں شاید طویل دورانیے کے ڈراموں نے سلسلہ وار ڈراموں کی نسبت زیادہ اہم کردار ادا کیا ہے۔ سلسلہ وار ڈراموں میں ناظرین کی سہولت کی خاطر بہت سی باتوں کو دُہرایا جاتا ہے۔ اور ویسے بھی سیریل کو مقررہ حد تک پھیلانے (اور بعض اوقات اس مقررہ حد سے بھی آگے طول دینے) کی وجہ سے اس طرح کے ڈراموں میں تاثر کی شدّت باقی نہیں رہنے پاتی اور ڈرامائی عمل بکھرا بکھرا نظر آتا ہے۔ ڈرامے کو حقیقت میں ترقی دینے کے لیے کوئی ایسا Format فارمیٹ ضروری تھا جس کے ذریعے مصنّف ایک ڈرامائی کہانی کو مکمل طور پر پیش کر سکتا اور ساتھ ہی ساتھ اس میں تاثر کی یکتائی اور وحدت اور شدت قائم رکھ سکتا۔ یہ سلسلہ ۱۹۸۱ء میں ''ڈراما ۸۱'' سے شروع ہوا۔

ایک عجیب حُسنِ اتفاق ہے کہ لاہور ٹی وی کے قابل اور مشّاق پروڈیوسر محمد نثار حسین کی اس سیریز ''ڈراما ۸۱'' (اور اس کے بعد کئی سال تک اس کے تسلسل میں ڈراما ۸۲، ۸۳، ۸۴، ۸۵، ۸۶ وغیرہ) کا آغاز جس ڈرامے ''کانچ کا پُل'' سے ہوا، اُس کے مصنّف یونس جاوید تھے۔ میں نے جب یہ کھیل دیکھا تو میرے لیے یہ نام اجنبی تھا۔ اس لیے میں یہ سمجھا کہ یہ کوئی نہایت ہی کہنہ مشق اور بزرگ قسم کے ڈراما نگار ہیں جنہوں نے اپنی عمرِ عزیز کسی ایسے ملک میں اور ایسے ماحول میں گزاری ہے جہاں ڈرامے کا فن صدیوں کی مسلسل اعلیٰ روایت کا مظہر ہے۔

''کانچ کا پُل'' اس کتاب میں شامل دوسرے ڈراموں کی طرح ایک خالصتاً طبع زاد ڈرامہ ہے۔ جس کی بنیاد ہمارے معاشرے کی تیزی سے بدلتی ہوئی اقدار کی شکست و ریخت پر رکھی گئی ہے۔ ویسے تو اس کی کہانی ایک ادھیڑ عمر کی لیڈی ڈاکٹر اور اس کے نوجوان مریض کے جذباتی تعلق کے بارے میں ہے۔ لیکن حقیقت میں اس کے ذریعے سے ایک پورے معاشرتی انقلاب کی نقش گری کی گئی ہے، جس نے افراد، خاندانوں اور شہروں کی زندگیاں بالکل نئے تصوّرات، اقدار اور تعلقات پر استوار کر دی ہیں۔ ایک فیوڈل معاشرے سے ایک بورژوا معاشرے میں منتقل ہوتے ہوئے لوگوں کو جن متغیر حالات کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور جس طرح اُن کے درمیان بالکل نئے رشتے پیدا ہوتے ہیں۔ ''کانچ کا پُل'' اس کی نہایت خوبصورت تشکیل ہے۔ اور یہ صرف اسی ڈرامے سے مخصوص نہیں۔ یونس جاوید کے تقریباً سارے ڈرامے اس عظیم معاشرتی عمل کے مختلف پہلوؤں کی صورت گری کے نمونے ہیں۔

ہمارے یہاں بہت سے دانش وروں کا خیال ہے کہ پاکستانی معاشرے میں اس کے آغاز سے آج تک کوئی تبدیلی رُونما نہیں ہوئی ہے۔ نہ اس کے سٹرکچر میں، نہ اس کے اقدار میں، نہ اس کے سماجی، معاشی، سیاسی اور نفسیاتی

عوامل میں۔ یہ ایک نہایت سطحی نقطۂ نظر ہے جس کے ذریعے ہم اپنے آپ کو اپنے ماحول میں ہونے والے بنیادی تغیرات سے ناواقف رکھے ہوئے ہیں۔ یہ درست ہے کہ ہمارے یہاں کلاسیکی انداز میں ہونے والے معاشرتی انقلاب کا سا سیاسی اور معاشی عمل ظہور پذیر نہیں ہوا ہے لیکن جن مسلسل اور مستقل بحرانوں سے ہمارے معاشرے کو ان چالیس برسوں میں واسطہ پڑا ہے اُن کی وجہ سے رفتہ رفتہ تقریباً ہر سطح پر ہماری زندگی بدل گئی ہے اور بدل رہی ہے۔

یُوں تو پاکستانی معاشرے کے ہر طبقے اور ہر سطح کے افراد کی زندگیوں میں ایک خاموش اِنقلابِ اقدار رُونما ہو چکا ہے لیکن جس طرح اس انقلاب کی نشانیاں اور اثرات ہمارے درمیانے طبقے کی مختلف سطحوں پر دیکھے جا سکتے ہیں، وہ اور کہیں نظر نہیں آتے۔ پاکستان کا یہ درمیانہ طبقہ۔۔۔ چاہے وہ ہماری شہری زندگی سے تعلق رکھتا ہو یا دیہاتی زندگی سے۔۔۔ پاکستان کے نئے معاشرے اور اس کی بدلتی ہوئی حقیقتوں کی نمائندگی کرتا ہے۔ اس طبقے کے افراد میں پاکستان کے ہر لحظہ متغیر معاشرے کے نئے روپ نظر آتے ہیں۔ ان میں بزنس فرموں کے منیجر اور ڈائریکٹر، سرکاری افسر، پروفیسر، ڈاکٹر، وکیل، تعلیم یافتہ نوجوان شامل ہیں۔ ان میں عورتیں بھی ہیں اور مرد بھی۔ اور یہ سب اپنی زندگیوں کے لیے بہتر سے بہتر حالات مہیّا کرنے کی جدوجہد میں مصروف ہیں۔ اس جدوجہد کی نوعیت بدلتی رہی ہے اور مزید بدل رہی ہے۔ جوں جوں پاکستان کا معاشرہ موجودہ عالمی اقتصادی نظام کا حصّہ بنتا جاتا ہے۔ اسی حد تک یہ جدوجہد بھی شدید سے شدید تر ہوتی جاتی ہے۔ اور اس میں مصروف افراد کے لیے اس کی نوعیت ایک ایسی جنگ میں تبدیل ہوتی جاتی ہے جس میں ہر انسان دوسرے ہر انسان کا دشمن ہے یا اس کا آلۂ کار ہے، یا اس کا شکار ہے۔ ایسے ماحول میں انسانی انفرادیت میں انتہائی انانیّت کی شدّت، خودغرضی، بے رحمی، شکوک و شبہات اور بے تعلقی پیدا ہو جاتی ہے۔ اور اس کی وجہ سے انسانوں کا ایک دوسرے پر سے اور خود انسانی رِشتوں پر سے اعتماد اُٹھ جاتا ہے۔ یونس جاوید کے لیے پاکستان کے جدید معاشرے کے تضادات اسی انتہائی انانیّت سے پیدا ہوتے ہیں۔ اُن کے ڈراموں کا محور یہی ہے۔

جس عمل کے وسیلے سے وہ ہمیں ان تضادات کی صورت دکھاتے ہیں۔ وہ خاندانی رشتوں اور خاندانوں کے سٹرکچر کی شکست و ریخت ہے۔ ''کانچ کا پُل'' میں ڈاکٹر شاہدہ اور اس کی ماں بیگم نثار دونوں ہی اکیلی رہنے پر مجبور ہیں۔ بیگم نثار کو اس کا شوہر چھوڑ کر جا چکا ہے اور شاہدہ کو اس کا منگیتر ترک کر چکا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ اس میں سارا قصور مردوں کا ہو۔ یونس جاوید اس ڈرامے میں واضح کرتے ہیں کہ انانیت کی شدّت دونوں طرف افراد کو رشتوں کی بداعتمادی میں مبتلا کرتی ہے۔ اور یہی ڈرامائی تضاد اور ٹریجیڈی کا سرچشمہ ہے۔

''دھوپ دیوار'' میں رشتوں کی شکست و ریخت ایک پوری جائنٹ فیملی کے پیانے پر دکھائی گئی ہے۔ سلمان میں، روشن میں، امجد حسین میں، نرگس میں، ہم سلیف سینٹرڈ اور سیلف میڈ افراد کی انانیت کو انسانی رشتوں کو توڑتے ہوئے دکھاتے ہیں۔ اور ہر سطح پر یہ عمل انسانوں کو زیادہ سے زیادہ تنہائی کا شکار کرتا ہے۔

''ساون رُوپ'' میں ڈرامائی عمل معاشرتی سے زیادہ حیاتیاتی سطح پر رونما ہوتا ہے۔ لیکن یہاں بھی اس کی بنیاد حقیقت میں انانیت ہی پر رکھی گئی ہے۔ جو نئے بورژوا نظامِ معیشت میں انسانی فرد کا جوہری وصف بن جاتا ہے۔

''سٹیٹس'' میں ہم اس عمل کو اور اس کے ذریعے سے اقدار کی شکست و ریخت کو اپنی انتہا پر دیکھتے ہیں اور وہ بھی اس کے اصل معاشی اور معاشرتی سرچشمے کے تناظر میں۔ یعنی ایک انڈسٹریل کمپنی کے اندرونی عوامل کی کشاکش میں۔

یونس جاوید کا کارنامہ محض یہ نہیں کہ انہوں نے ہمارے بدلتے ہوئے معاشرے کے تضادات کے صحیح پس منظر اور مہیجات کی نشاندہی کی ہے بلکہ جس وجہ سے اُن کے ہمارے ڈرامے کی تاریخ میں ایک مستقل مقام حاصل ہوگا۔ وہ یہ ہے کہ انہوں نے نہایت خوش اسلوبی اور مہارت سے ہمارے معاشرے کے بنیادی المیہ عنصر کو ان ڈراموں میں متشکل کیا ہے۔

''مقبولیت کی مثال''

پاکستان ٹیلی ویژن سے دو قسم کے ڈرامے پیش کیے گئے۔ ایک وہ جنہیں معیاری ڈرامے کہا جا سکتا ہے اور دوسرے وہ جو مقبول ڈرامے کہلاتے ہیں۔ عام تاثر یہ دیا گیا کہ معیاری ڈرامے مقبول نہیں ہوتے اور یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ مقبول ڈرامے لکھنے والے معیار کا خیال نہ رکھ سکے۔ مگر یونس جاوید ہمارے ان ڈرامہ نگاروں میں شامل ہیں جن کے ڈرامے معیاری ہونے کے علاوہ مقبول بھی ہوئے یا مقبول ہونے کے باوجود معیار بھی قائم رکھ سکے اور جن کی وساطت سے یہ ثابت ہوا کہ معیار اور مقبولیت ایک دوسرے کی ضد نہیں ہیں بلکہ لازم و ملزوم ہیں۔

ان ڈراموں کی مقبولیت کا صرف یہی ثبوت نہیں کہ ان پر یونس جاوید کو پاکستان ٹیلی ویژن ایوارڈ، گریجویٹ ایوارڈ، عوامی ایوارڈ، پلے فیئر ایوارڈ، کاروانِ ثقافت کا گولڈ میڈل، ایشین انٹرنیشنل ایوارڈ، فیملی ڈاکٹرز ایسوسی ایشن ایوارڈ اور روزنامہ جنگ ایوارڈ دیا گیا۔ ان کی مقبولیت کا یہ ثبوت بھی ہے کہ ان کھیلوں کو فلمی صنعت سے تعلق رکھنے والے پروڈیوسرز بڑی سکرین پر منتقل کر رہے ہیں۔ گویا نام نہاد پاپولر ڈرامے اگر فلم سے متاثر ہو رہے تھے تو اب فلم ٹیلی ویژن ڈراموں سے متاثر ہونے لگی ہے۔

منّو بھائی

یونس جاوید اور اس کے خاکے

ڈاکٹر انور سدید
(لاہور)

کسی ادبی موضوع پر سوچتے ہوئے جب میں یونس جاوید کا تصور کرتا ہوں تو وہ مجھے بنیادی طور پر ایک افسانہ نگار نظر آتا ہے جو نقاد طاہر اصغر کے بقول ''راجندر سنگھ بیدی کے اس معیار کی پاسداری کرتا ہے کہ کامیاب افسانے کے لیے مواد کا مقامی اور تکنیک کا بین الاقوامی ہونا ضروری ہے۔'' انہوں نے راجندر سنگھ بیدی کو ایک طرف ''کھڈے لائن'' لگا کر یونس جاوید کے فن کی وضاحت کی تو لکھا:

''یونس جاوید کی ہر کہانی لہو میں تر ایک ٹوٹا ہوا کانچ کا ٹکڑا ہے جو زندگی کے کسی پہلو اور اس کے مکمل عکس سے آشنا کرتا ہے۔ یہ تمام ٹکڑے جوڑ دیئے جائیں تو اس خطے کے انسانوں کے خوابوں اور عذابوں کی تصویر اُجاگر ہوتی ہے۔'' (ایک چہرہ یہ بھی ہے۔ص ۷)

میں نے یونس جاوید کے افسانوں کا مجموعہ ''تیز ہوا کا شور'' پڑھا تو اسے راجندر سنگھ بیدی کے قرب و جوار میں چہل قدمی کرتے ہوئے نہیں دیکھا بلکہ محسوس کیا کہ علامتی اور تجریدی افسانے کے نقاب پوش دور میں وہ حقیقت کو اپنی مخصوص عینک سے دیکھ کر اُسے نہ صرف اصلی رنگوں میں پیش کر رہا تھا بلکہ اپنی بصارت سے ایسے کرداروں کا مشاہدہ بھی کر رہا تھا جو زندگی کی صادق اقدار سے دانستہ انحراف کرتے اور معاشرے کو روبہ زوال کر رہے تھے۔ اس قسم کے متضاد کرداروں کی بصیرت یونس جاوید کا افسانوی مزاج متعین کرتی ہے اور ہمیں اس نوع کی زندگیوں کے مشاہدے کے دستاویزی ثبوت فراہم کرتی چلی جاتی ہے۔ یونس جاوید کے افسانوں کی آخری کتاب ''میں ایک زندہ عورت ہوں'' ۲۰۰۴ء میں شائع ہوئی تھی جس کی بامعنی داد اسے ڈاکٹر انیس ناگی نے دی جو کسی کو تسلیم نہ کرنے اور ہر کسی کو مسترد کر کے صرف اپنا پرچم لہرانے کی شہرت رکھتے ہیں۔ انہوں نے لکھا:

''یونس جاوید کی حقیقت نگاری کا کمال یہ ہے کہ وہ معاشرتی زندگی کی جزئیات اور اپنے عہد کے دبے ہوئے کرداروں کی بُنت اس طرح تیار کرتا ہے کہ وہ معاصر عہد کو دیکھنے اور سمجھنے کا ایک دریچہ بن جاتا ہے۔''
(فلیپ: ''میں ایک زندہ عورت ہوں'')

ڈاکٹر انیس ناگی نے یونس جاوید کی تکنیک پر رائے نہیں دی لیکن اب مجھے طاہر اصغر کی بات درست نظر آتی ہے کہ اس کتاب میں یونس جاوید نے مقامی مواد کی پیشکش کے لیے بین الاقوامی تکنیک استعمال کی ہے اور وہ ۱۹۳۶ء کی تحریک کے ان افسانہ نگاروں سے مختلف ہے جو بنیادی طور پر چوپال کے حقیقت نگار تھے لیکن اس تحریک میں آئے تو گھر کا راستہ بھول گئے اور اب اکیسویں صدی میں خود پامالی کا شکار ہیں، فنی طور پر مر چکے ہیں لیکن جسمانی تدفین عمل میں نہیں آئی۔ اس کے برعکس یونس جاوید نے اس عظیم تحریک کے قافلہ سالار کا ہمسایہ ہونے کے باوجود اپنے فن کے نئے خطوط تراشے اور تکنیک کے اعتبار سے ''بین الاقوامیت'' کی طرف پیش قدمی کی اور ''زندگی کی بدوضع بوریت سے اکتائے ہوئے انسانوں کا فلسفہ تراشا تو اس کی آخری کتاب کی ''پیش لفظ نگار'' شاہین مفتی (ڈاکٹر) نے شہادت دی کہ ''یونس جاوید عوام الناس اور ان کی بچی کھچی اکلوتی مسرت کو قائم بالذات بنانے میں بہت کامیاب دکھائی دیتا ہے۔''

تمہید طویل ہو گئی ہے لیکن شاید اس کے بغیر یہ حقیقت واضح نہ ہو سکتی کہ یونس جاوید نے اپنا ادبی سفر افسانے سے شروع کیا تھا تو اس کا فن اب بھی اس صنف میں ہی مائل بہ ارتقاء ہے حالاں کہ اس دوران اس نے ''کلیاتِ ناسخ'' کا تحقیقی فریضہ بھی انجام دیا اور ''حلقہ اربابِ ذوق'' پر مقالہ لکھ کر پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ مجلس ترقی ادب کے رسالہ صحیفہ کی ادارت کے فرائض انجام دیے۔ اقبالیات کے سلسلے کی ایک کتاب ''صحیفہ اقبال'' مرتب کی۔ ٹیلی ویژن پر ڈرامہ ''کانچ کا پُل''، ''رگوں میں اندھیرا'' اور ''اندھیرا اُجالا'' جیسا مقبول عام سیریل پیش کیا۔ یہ سب یونس جاوید کی بے حد اہم ادبی جہات ہیں لیکن خوبی کی بات یہ کہ ان جہات کی شہرت میں اس نے اپنے بنیادی فن افسانہ کو نظر انداز نہیں کیا۔

یہاں مجھے افسانہ نگار اشفاق احمد یاد آ رہے ہیں جنہیں ابتدائی اور انتہائی شہرت مختصر افسانے میں ملی لیکن جب ٹی وی میڈیا پر انہیں لاکھوں ناظرین مل گئے تو وہ اس ''چکا چوندگری'' میں افسانے کو بھول گئے لیکن زندگی کے آخری دور میں محسوس کیا کہ لکھے ہوئے الفاظ کا مقام زیادہ مستقل نوعیت کا ہے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ انہیں زیادہ شہرت افسانہ ''گڈریا'' نے ہی دی تھی جو اب مستقبل کی طرف بھی بڑھ رہی ہے۔ یونس جاوید کی خوبی یہ ہے کہ اس نے ٹی وی ڈرامے سے بے پایاں شہرت حاصل کی، متعدد ایوارڈز بھی حاصل کیے لیکن اپنی بنیادی صنف ''افسانے'' کو نظر انداز نہیں کیا اور حد یہ ہے کہ وہ خاکہ نگاری کی طرف آیا تو اس میں بھی افسانے کے فن میں اپنی سوجھ بوجھ سے زیادہ فائدہ اُٹھایا۔ افسانے میں اس کے کردار بے چہرہ نہیں، لیکن ان کے خدوخال تراشنے میں یونس جاوید نے افسانے کی داخلی ضرورت کے مطابق متخیلہ سے بھی کام لیا ہے اور انہیں آراستہ کرنے میں اپنی فنی چابک دستی کا ثبوت دیا ہے لیکن خاکہ نگاری میں حقیقی کردار کو ذاتی تاثر کی داخلی کیفیت سے پیش کرنا ضروری ہے جو لمبے عرصے سے لاشعور کے کسی گوشے میں گوشہ نشین پڑی ہوتی ہے اور اس وقت تک سطح پر نمودار نہیں ہوتی جب تک کہ ممدوح خاکے کا موضوع نہیں بن جاتا اور یادوں کے خزینے سے

شخصیت کے نمائندہ نقوش ابھر کر خیال افزا اشاروں کی صورت اختیار نہیں کرتے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ افسانہ نگار ہونے اور زندگی کی بہت سی حقیقتوں کا شناسا ہونے کے ناتے یونس جاوید کردار سازی اور کردار نگاری پر بے پایاں دسترس رکھتا ہے اور خاکہ نگاری بھی کردار نگاری کی ہی ایک شاخ ہے جس کی فنی تکمیل پر ایک افسانہ نگار زیادہ دسترس رکھتا ہے۔ تاہم واضح رہے کہ اس صنف ادب کے لیے یونس جاوید نے اپنی بوطیقا وضع کر رکھی ہے جو میں نے اس کے خاکوں کی کتاب ''ایک چہرہ یہ بھی ہے'' سے حسب ذیل اخذ کی ہے۔

''خاکہ لکھنا۔۔۔ لکھنے والے کی عمر بھر کی کمائی ہے۔ اس لیے کہ دوسرے کی پرتیں کھولنے کے لیے شرطیں بہت کڑی ہیں جس میں ہم نوالہ وہم پیالہ ہونا پہلی شرط ہے۔ پیالے میں مشروب مغرب ہو تو راقم خود اپنی پرتیں بھی گن سکتا ہے۔ دوسری شرط سچ بولنا ہے۔ سو ہر خاکہ نگار سچ ہی بولتا ہے۔ مگر زیادہ تر دوسرے کے بارے میں۔ لہٰذا جب میرا دل دوسروں کے بارے میں سچ بولنے کو دھڑکتا ہے تو میں خاکہ لکھنے یا خاک اُڑانے بیٹھ جاتا ہوں۔''

(''ایک چہرہ یہ بھی ہے''ص ۱۳۶)

لیکن یہاں واضح کرنا ضروری ہے کہ کسی متنوع شخصیت کی نیرنگیاں بازیافت کرنے کے لیے ہم جلیس اور دوست دار ہونا تو ضروری ہے لیکن ہم نوالہ اور ہم پیالہ ہونا ضروری شرط نہیں، اس کا سب سے بڑا ثبوت یونس جاوید کے خاکے ''ونجارا'' (سلیم شاہد) اور ''فلیش بیک'' (نذیر ناجی) سے دیا جا سکتا ہے جو بلانوش ہیں لیکن یونس جاوید ان کی فطرت کا مطالعہ عدم نوشی کی حالت میں کر رہا ہے۔ دوسری بات یہ کہ اس کی خاکہ نگاری میں شہرت کی جزئیات سمیٹنے کا عمل تو نمایاں ہے اور کسی بھی مرحلہ پر ان جزئیات سے سرشاری کی کیفیت پیدا کرنے سے وہ غافل نہیں ہوتا لیکن ''خاک اُڑانے'' کا عمل اس کے ہاں مفقود نظر آتا ہے اور جب اس قسم کے مشکل مقامات آتے ہیں تو وہ روزنِ دیوار سے مشتبہ انداز میں تاک جھانک کرنے کی بجائے اپنے اوپر عقیدت، تقدیس اور حرمت کی چادر ڈال لیتا ہے۔ قلم کے اسپ تیز رفتار کی باگیں کھینچ لیتا ہے اور پھر اپنے مقدور کے مطابق سچ رمز و کنایہ میں بیان کر دیتا ہے۔ سلیم شاہد کے خاکے ''ونجارا'' سے یہ اقتباس ملاحظہ کیجیے۔

''بقول سلیم کے اس نے زندگی کا آغاز ایک ڈاکٹر کے کلینک سے کیا جس کی رہائش کلینک کے اوپر تھی۔ وہاں اس پر جوانی آئی اور ''اندر بوٹی مشک مچایا'' تو جادو سر چڑھ کر نہیں بولا۔۔۔ چوبارے تک چڑھ گیا۔ اس نیک طینت ڈاکٹر نے جو صحیح انسان کہلانے کا مستحق ہے۔۔۔ خاموشی سے فطری تقاضوں کو تسلیم کیا اور سزا کے بجائے جزا سے سلیم شاہد کو یوں نوازا کہ اسٹیٹ بنک میں مستقل ملازم کرا کے گویا اپنے چوبارے کے گرد حصار کر دیا۔''

(حوالہ ایضاً،ص ۸۰)

''کن ٹٹا'' میاں محمد نواز شریف کی وزارتِ عظمیٰ کے دور کے سفیر پاکستان عطاء الحق قاسمی کا خاکہ ہے جس کے بارے میں یونس جاوید کا خیال ہے کہ وہ ایسا پھل دار درخت ہے جس کی شاخوں پر ہر کوئی راہ چلتے پتھر مارتا ہے، خصوصاً عورتیں اور عورتوں کی سنگ باری کا ذکر آیا تو یونس جاوید نے لکھا:

''اس پھلے پھولے درخت پر پہلا پتھر پڑتا ہے تو آواز آتی ہے ''سبحان اللہ!'' وہ اس سے زیادہ توجہ نہیں دیتا مگر دوسرے پتھر پر آواز آتی ہے ''ماشاء اللہ'' بس! لیکن اگر تیسرے پتھر کو کوئی اس پر تان لے تو پھل چور ہاتھ سمیت غائب ہو جاتا ہے اور آواز آتی ہے ''الحمد للہ!''

اس خاکے میں ''سبحان اللہ'' سے ''الحمد للہ'' تک کے مراحل اگر کھول کر بیان کیے جاتے تو ممدوح پر حدود کا مقدمہ قائم ہو جاتا اور مداح پر ازالہ حیثیت عرفی کی نالش دائر ہو سکتی تھی لیکن دیکھئے خاکہ نگار نے دونوں کو عدالتی کارروائی سے کس خوب صورتی سے بچا لیا ہے اور اپنا بے لاگ سچا تاثر اس جملے میں رقم کر کے اپنا قومی فریضہ بھی ادا کر دیا ہے جو بطور ادیب اس پر عائد ہوتا تھا۔

''جس معاشرے میں عورتوں کا احترام اور بچوں سے شفقت کرنے والے موجود ہوں وہ معاشرہ خوب صورت بھی ہے اور خوب سیرت تھی۔''

(ص ۱۹۹)

یونس جاوید فطری طور پر خیالِ خاطر احباب رکھنے والا ادیب ہے اور سچ لکھنے کے مرض میں گرفتار ہونے کے باوجود وہ پوری کوشش کرتا ہے کہ احساس کے نازک آبگینوں کو ٹھیس نہ لگے اور اپنی بات بالواسطہ معنی کے لفافے میں اس طرح لپیٹ کر پیش کرے کہ ذی ہوش قاری سے کوئی بات پوشیدہ نہ رہے اور کم گوش قاری الفاظ کی ملائم اور نرم سطح پر سے ہی حیرتیں سمیٹتا رہے۔ اے جی جوش صاحب کے خاکے میں بھی سطح پر چند حیرتیں یوں پیش کی گئی ہیں:

''عجیب بات یہ ہے کہ جوش صاحب نے اپنے ماضی کو کبھی نہیں چھپایا۔ وہ اب بھی سائیکل چلاتے ہوئے گوال منڈی میں تانگے والے سے لڑ پڑنے کا واقعہ سنا دیتے ہیں۔ وہ سیف الدین سیف سے ''امبرسر'' کی ملاقاتوں کا ذکر بھی کرتے ہیں۔ جس طرح وہ اپنے حال سے خوش ہیں اسی طرح وہ اپنے ماضی سے بھی خوش تھے اور ہیں۔ انہیں فخر ہے کہ انہوں نے شاعری میں بڑے بڑے استادانِ فن سے تلمذ اور تلذذ دونوں حاصل کیے ہیں۔ تلذذ سے تو وہ اب تائب ہو چکے ہیں اور تائب ہونے کی وجہ وہی مصرع ہے جو چیلنج بن کر ان کے دل میں اُتر گیا۔ ''چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی'' انہوں نے چیلنج قبول کیا اور حج پر جانے سے پہلے ہی کافر کو منہ لگانا چھوڑ دیا۔ حج کے بعد اتنا فرق پڑا کہ دوسروں کے منہ کو بھی اس ''کافر'' کے کناروں تک نہیں پہنچایا۔'' (ص ۱۴۸)

دیکھئے اس مشکل مقام کو جس میں تلمذ اور تلذذ باہم آمیختہ ہو جاتے ہیں اور جسے زبیر رضوی اور جاوید شاہین جیسے منجھے ہوئے ادبا بھی عبور نہ کر سکے تھے، یونس جاوید کس کامیابی سے سر کر گیا ہے کہ استاد کی عزت پر کوئی حرف نہیں آیا اور شاگرد کا پیمانِ وفا بھی قائم رہا ہے۔

یہ بات شاید ممتاز شیریں نے اپنے ایک مقالے میں لکھی تھی کہ ''بعض افسانے اس طرح شروع ہوتے ہیں کہ قاری کی توجہ فوراً کھنچ جاتی ہے۔ ان کے آغاز اتنے جاذب ہوتے ہیں کہ چلنے والے کا دامن پکڑ کر ٹھہرا لیں۔'' یہ خوبی یونس جاوید کے ان افسانوں میں مجھے نمایاں نظر آتی ہے جو اس کے نئے مجموعے ''میں ایک زندہ عورت ہوں'' میں شامل ہیں۔ اس خوبی کا غیر شعوری استعمال اس کے خاکوں سے بھی عیاں ہے لیکن یہاں اس خوبی کو کسی کردار کی بنیادی صفت یا مرکزی نقطہ گرفت میں لینے کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس ابتدائیے پر ہی قاری یونس جاوید کی انگلی پکڑ لیتا ہے اور پھر ''ہر چہ بادا باد'' کہے بغیر ہی قاری خاکے کے مطالعے پر مائل ہو جاتا ہے۔ یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کے چند خاکوں کے ''ابتدائیے'' درج کر دیے جائیں تاکہ آپ اس کی کتاب ''ایک چہرہ یہ بھی ہے'' خرید کر پڑھنا ضروری تصور کرنے لگیں۔ ''لاہور کا دروازہ'' کا ابتدائیہ:

''بابا یونس ادیب لاہور کا چودھواں دروازہ ہے اور باقی سب دروازوں سے زیادہ معتبر اور باوقار کہ اس سے گزرے بغیر کوئی بھی شخص اصلی اور نرول لاہور کی شبیہ دیکھ سکتا ہے، نہ داستان قسم کے محلوں کے ورق اُلٹا سکتا ہے۔'' (ص ۱۰۶)

''ونجلرا'' کا ابتدائیہ:

''میں ایک ایسے سلیم شاہد کو جانتا ہوں جو سنجیدہ شاعر، بہترین باپ، ٹو دی پوائنٹ شوہر اور ''آؤٹ آف دی وے'' دوست ہونے کے باوجود ہر فن مولا ہے۔'' (ص ۷۶)

''کن ٹٹا'' کا ابتدائیہ:

''عطا قاسمی وہ آل راؤنڈر ہے جس کی بیٹنگ اعلیٰ، باؤلنگ عمدہ، فیلڈ پھرتیلی اور دوسرے کو آؤٹ کرنے میں گولڈن آرام کہ دیکھنے والے عش عش کریں۔ گراف ہر میچ میں بلند سے بلند تر۔'' (ص ۱۱۵)

یونس جاوید کے بیشتر خاکوں کا عقبی دیار ''پاک ٹی ہاؤس'' ہے جہاں ہر ہفتے حلقہ اربابِ ذوق کے اجلاس ہوتے ہیں لیکن جسے لاہور میں ادیبوں کے مرکزی مقام کی حیثیت حاصل ہے۔ انتظار حسین نے اپنے ایک ناول میں لاہور کو ''ٹی ہاؤس'' کی کھڑکی سے دیکھنے کی کوشش کی تھی، یونس جاوید کبھی اس کھڑکی کے باہر سے اندر بیٹھے ہوئے ادیبوں کو دیکھتا ہے کبھی ڈرا، سہا اور سمٹا سمٹایا اندر داخل ہوتا ہے تو کسی عقبی نشست پر بیٹھ کر سینئر ادیبوں کی باتیں سنتا رہتا ہے۔ حتیٰ کہ وہ وقت آ جاتا ہے کہ وہ خود بھی ایک سینئر ادیب شمار ہونے لگتا ہے اور احمد بشیر، نذیر ناجی، یونس ادیب، سلیم شاہد اور سہیل احمد خان جیسے لوگ اس کے افسانوں اور ڈراموں پر اسے آگے بڑھ کر مبارک باد دینے کے لیے بے تاب ہو جاتے ہیں۔ اس قسم کا ایک منظر خاکہ ''جوگی'' میں یوں محفوظ ہے:

''پھر یوں ہوا۔۔۔ کہ طویل دورانیے کے کھیلوں کا آغاز میرے مشہور ڈرامے ''کانچ کا پُل'' سے ہوا۔ یہ ستمبر ۱۹۸۱ء تھا۔ ڈرامہ چلنے کے ہفتہ عشرہ بعد احمد بشیر ٹی ہاؤس میں وارد ہوا۔ میں دروازے کے ساتھ والی میز پر دوستوں کے ساتھ بیٹھا تھا۔ اس نے آتے ہی میری طرف رخ باندھا اور قریباً گرجا ''کانچ کے پُل، کھڑے ہو جاؤ!'' میں سُن ہو گیا۔۔۔ ''اٹھو'' اس نے دھاڑ کر کہا۔ میں اُٹھا تو اس نے میرا ماتھا چوم کر گلے سے لگا لیا۔ مجھے خود بھی یقین نہیں آیا کہ میں کانپ رہا ہوں۔ جب اس نے کہا ''تم نے بہترین کھیل لکھا ہے'' اس نے پانچ چھ تعریفی کلمات کہنے کے بعد کسی انگریزی کالمسٹ کو بے نقط سنائیں۔ بعد میں معلوم ہوا کہ اس ذہین ترین کالمسٹ نے ڈرامے کی بے حد تعریف کی تھی مگر رائٹر کا نام نہ لکھا تھا۔''

ٹی ہاؤس میں سینئر ادیبوں کا جونیئر ادیبوں کو حوصلہ افزائی سے آگے بڑھانے کا یہ انداز منفرد اور ادب کی مشعل کو روشن رکھنے کے لیے نئے ادیبوں کا بہت معاون تھا۔ یونس جاوید کے خاکوں میں یہ تناظر ہمہ وقت روشن رہتا اور ادیبوں کی کہکشاں کو نہ صرف منور رکھتا ہے بلکہ ان کی زندگی کی رنگینیوں کی بہار بھی دکھاتا ہے جو نئی تخلیق سے خود بخود منظر پر اُبھر آتی تھیں۔ خاکہ ''فلیش بیک'' میں ٹی ہاؤس کی فضا کو یونس جاوید نے یوں تحفظ عطا کر دیا ہے:

''ادب کا محاذ ان دنوں تھا بھی گرم اور کچھ ایسا کہ ہر شخص نظم، غزل، افسانہ یا کوئی نظریہ جیب میں لیے ٹی ہاؤس میں آتا۔۔۔ سنتا سناتا۔۔۔ چائے کا دور اور سگرٹوں کے مرغولے تو بس بونس میں مل جاتے تھے۔ ہر چند کہ دستر خوان، چائے یا سگریٹ، غزل یا نظم میں چار چاند لگا دیتے تھے۔ مگر وقتی طور پر۔۔۔ بالآخر تو حلقہ اربابِ ذوق میں ہی کسی بھی صنف ادب کا پوسٹ مارٹم ہوتا تھا۔'' (ص ۹۳)

یونس جاوید نے موقع کی مناسبت سے حلقہ اربابِ ذوق کی متعدد جھلکیاں پیش کی ہیں اور اس کی ادبی حیثیت کو سماجی زاویوں سے بھی اُبھارا ہے۔ ایک عمومی رائے کچھ اس طرح کی ہے:

''یوں تو حلقے میں مختلف ادوار میں مختلف سکے رائج رہے، کبھی عزیز الحق کا تو کبھی عارف امان کا، کبھی ان دونوں کا۔ ارشاد کاظمی بھی کچھ دنوں ان مباحث پر چھا سا گیا۔ وہ وکیل کی مار مارتا تھا مگر اس کی ذہانت منفی تھی۔ مثلاً اس نے سلمیٰ جبیں کے افسانے پر ایسے تابڑ توڑ حملے کیے کہ وہ روہانسی ہو کر رہ گئی۔۔۔ شدید نفرت سے ارشاد کاظمی کو دیکھا اور پھر ہتھیار ڈال دیئے۔ چند دن بعد دونوں لارنس میں ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے ٹہلتے ہوئے مجھے دکھائی دیئے اور پھر میں نے سنا دونوں نے شادی کر لی ہے۔'' (ص ۹۳، ۹۴)

''مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ کسی شاعر کی غزل حلقے میں پیش ہوئی۔ غزل جیسی بھی تھی، نذیر ناجی نے چھوٹتے ہی غزل کو تہس نہس کر دیا اور دلائل دے کر اسے ناکارہ اور ناکام غزل ثابت کر دیا اور کچھ اس طرح کہ میرے علاوہ ہر شخص کو اس غزل میں کیڑے ہی کیڑے دکھائی دینے لگے۔ پھر سناٹا چھا گیا اور یہ بات یقینی ہو گئی کہ اگلے جملے میں ہی صدر اس غزل پر بحث ختم کرنے کا اعلان کر دیں

گے کہ نذیر ناجی کی رگِ جملہ بازی کچھ اس طرح سے پھڑکی کہ جملہ چست کیے بغیر نہ رہ سکا اور غزل کی کاپی پھینکتے ہوئے بہ آوازِ بلند کہا: ''جنابِ صدر! ایسی غزلیں تو میں تیسری جماعت میں پڑھتا تھا۔'' اس سے پہلے کہ یہ جملہ غزل کے تابوت میں آخری کیل ثابت ہوتا، کسی نے برجستہ کہا ''ناجی صاحب! جناب نے تیسری جماعت پاس کب کی تھی؟'' کچھ ایسا بے ساختہ قہقہہ پڑا کہ بہت سوں کو اسی دن معلوم ہوا کہ ناجی نے علم کو ڈگریوں میں مقید نہیں کیا۔'' (ص ۹۵)

یونس جاوید کا خاکہ ممدوح کے ساتھ سیدھی سمت میں سفر نہیں کرتا بلکہ وہ اپنی محبوب شخصیت کے گرد و پیش سے بھی خوشبو دار دھواں سمیٹتا چلا جاتا ہے۔ خوشبو پھیلتی چلی جاتی ہے اور دھواں اس کے اُسلوب کی پرکاری میں سمٹتا اور تاثر کو مثبت جہت دیتا چلا جاتا ہے۔ اس قسم کے مقامات پر وہ ناگفتنی کو گفتنی بنانے کے لیے لطیفے کا سہارا بھی لیتا ہے اور ماحول کو خوشگوار صورت دے دیتا ہے۔ اس کی ایک صورت اے۔جی جوش صاحب کے خاکے میں یوں سامنے آتی ہے:

''بعض اوقات (جوش صاحب کی) محبت کا یہ بوجھ اس قدر زیادہ ہو جاتا ہے کہ آدمی کراہ کر مرنے لگتا ہے۔ بالکل اس نواب کی طرح جسے ایک بہت گرانڈیل اور کڑیل جوان بائی جی پسند آ گئی تھیں۔ بھاری بھرکم بائی جی پسند بھی اس لیے آئیں کہ موصوف بہت ہی دھان پان سے تھے، سو جس شب نواب صاحب مہمان ہوئے تو آغازِ وصل کی گفتگو میں بائی نے لاڈ سے اپنی ایک ٹانگ نواب صاحب کے اوپر رکھتے ہوئے کہا ''جناب! کا اسمِ گرامی تو پوچھا ہی نہیں۔'' بوجھ سے نواب صاحب کی آنکھیں اُبل پڑیں۔ سانس رکتا ہوا محسوس ہوا اور آنکھوں میں نیلے نیلے دائرے ناچنے لگے۔ انہوں نے پورا زور لگا کر پہلے خود کو جمع کیا، پھڑکے، تلملائے، پھر لمبا سانس کھینچ کر تقریباً چیخ کر بولے ''دوسری ٹانگ بھی رکھ دو تو بندے کو مردہ کہتے ہیں۔'' (ص ۱۳۹)

اس لطیفے کے قہقہے کو سمیٹ کر یونس جاوید نے جوش صاحب کی یہ خوبی پیش کی ہے کہ وہ ''لوگوں پر دوسری ٹانگ کا بوجھ نہیں ڈالتے مگر جس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیں وہ رات کو ٹکوریں کرتا پھرتا ہے۔''

اپنے خاکوں میں یونس جاوید نے اس قسم کے متعدد ''واقعاتِ معترضہ'' جمع کیے اور بے خبر قارئین کی معلومات میں قیمتی اضافہ کیا ہے۔ مثلاً خاکے ''مونا سکھ'' میں اس کا دعویٰ ہے کہ:

''کنول فیروز کو میں ایک حوالے سے امام العاشقین بھی کہہ سکتا ہوں کہ اس نے خود تو عشق نہیں کیے دوستوں سے بہت عشق کیا ہے اور ان کی محبتوں کو پروان چڑھانے میں کلیدی کردار اور کارنامے انجام دیئے تھے۔ محض یادداشت پر ان چند عاشقوں کی تفصیل کافی ہوگی جس میں اس نے بڑے کشٹ اٹھائے تھے۔''

''یہ سنہری دور ۱۹۸۰ء سے شروع ہوتا ہے جب نسرین انجم بھٹی اور زبیر رانا کا عشق پروان چڑھا اور کنول نے گاڈ فادر بن کر اسے شادی کی دہلیز تک پہنچایا اور بہت سی مصیبتیں برداشت کیں۔ دوسرے نمبر پر رشید مصباح کا عشق تھا۔ رشید مصباح کا عشق اپنی شاگرد فریدہ سے ہوا تو کنول نے صاف کہہ دیا: ''اگر شادی مقصود ہو تو بندہ حاضر ہے ورنہ میں نائیکہ کا کردار ادا نہیں کر سکتا۔'' رشید مصباح نے شادی کے لیے رضامندی کا اظہار کیا تو کنول نے کمرِ ہمت باندھ لی اور اس کے ساتھ کشٹ اٹھانے والوں میں احمد منیر مرحوم (جو ظہور نظر کا بھانجا تھا) زبیر رانا، نسرین انجم بھٹی اور سلیم کنول بھی شریک تھے۔ زبیر رانا کو تو باقاعدہ پولیس گرفتار کر کے لے گئی مگر کنول بچ گیا۔۔۔ بالآخر یہ نکاح بھٹو کالونی کے کسی گھر میں ہو گیا اور شادی کی دعوت ایمبسیڈر ہوٹل میں شان و شوکت سے ہوئی۔'' (ص ۱۵۸)

یونس جاوید کے متنوع مشاہدات سے سلیم شاہد کی حاضر دماغی اور حاضر جوابی کا واقعہ بھی یہاں اقتباس کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے کیوں کہ یونس جاوید کی بے بسی اور خوف زدگی کا مظہر بھی ہے جس نے شراب نوشوں کے ہجوم میں دخترِ رز سے پینگیں نہیں جھلائیں۔ واقعہ یوں ہے:

۱۹۷۶ء میں ایک مرتبہ وہ (سلیم شاہد) مجھے ''مورل سپورٹ'' کے لیے ساتھ لے کر ''ایڈل جی'' شراب خریدنے گیا۔ شراب کے دو کوارٹر لے کر اس نے ایک میری جیب میں اور دوسرا اپنی میں اُڑس لیا۔ ہم دونوں ٹی ہاؤس کے سامنے والے بڑ کے پیڑ کے نیچے تک ہی پہنچے تھے کہ ایک سکوٹر سوار اے ایس آئی نے ہمیں گھیر لیا۔ میں سر سے پاؤں تک لرز گیا جب کہ سلیم شاہد مسکراتا رہا۔ ''شراب ادھر لاؤ'' انسپکٹر بڑی تہذیب سے بولا۔ ''کس لیے؟'' سلیم شاہد نے پوچھا۔ انسپکٹر اسکوٹر سے اُتر آیا، بولا ''یہاں بتا دوں یا تھانے لے جا کر؟'' سلیم اسی لہجے میں بولا ''برادر یہ شراب میری ہوتی تو ضرور آپ کو پیش کرتا بلکہ ساتھ بٹھاتا۔ یہ ''مساوات'' کے ایڈیٹر کے لیے ہے۔ اسے پی کر ایڈیٹوریل لکھنا ہے۔ اب بتائیں کیا حکم ہے؟'' انسپکٹر مسکرایا۔ اس نے نحیف و نزار سلیم شاہد کو ایک ڈھیلا سلوٹ مارا اور اسکوٹر پر بیٹھ کر نکل گیا۔ میرے کانپنے کو دیکھ کر وہ کھل کر ہنسا اور بولا ''اگر بادہ خواری کی ہوتی تو یہ حال نہ ہوتا۔ بادہ خوار کو خدا نے بچنے کے سو گُر سکھائے ہوتے ہیں۔'' (ص ۸۶۔۸۷)

یونس جاوید واحد متکلم کی صورت میں اپنے سب خاکوں میں ہر جگہ موجود ہے۔ خاکہ ''چراغ آخرِ شب'' اس نے اپنی والدہ محترمہ اور ''سنگ میل'' پاکستان کی ۱۹۶۵ء کی جنگ پر لکھا ہے۔ ان خاکوں کو ہم تکنیکی طور پر خود نوشت سوانح عمری کی صنف میں بھی رکھ سکتے ہیں کیوں کہ ان میں وقت یونس جاوید کے ہم قدم ہے اور وہ پرت در پرت اس شخص کو بھی منکشف کر رہا ہے جس کی ماں چٹی ان پڑھ لیکن روشن خیال تھی اور اس کی دنیاوی تعلیم کے لیے اپنے شوہر سے پوشیدہ سرمایہ پس انداز کر رہی تھی اور والد انارکلی بازار میں اعلیٰ درجے کے فاؤنٹین پینوں کا کاروبار کرتے تھے اور انہوں نے یونس جاوید کو نہ صرف قرآن مجید حفظ کرایا بلکہ وہ اسے جامعہ ازہر بھیج کر عالم دین بھی بنانا چاہتے تھے اور جہاد کے لیے بھی تیار کر رہے تھے لیکن ماں نے اپنے بیٹے کو آنکھوں کے سامنے لاہور میں رکھنے کو ہی ترجیح

دی اور یونس جاوید جب حافظ ہوگیا تو والد نے پہلے رمضان کے لیے مسجد مبارک کا انتخاب کیا جہاں اس کے دادا جی نے رمضان میں تراویح پڑھائی تھیں اور پھر یہ سلسلہ شروع ہوا تو سنہری مسجد، نیلا گنبد، مولانا احمد علی کی مسجد اور چینیاں والی مسجد کی تراویح اور شبینے تک پھیلتا گیا اور پھر اپنی ماں کی ترغیب پر دین کے ساتھ دنیوی تعلیم کی طرف توجہ دی تو وہ ایم اے تک پہنچ گیا اور اب پی ایچ ڈی بھی ہوگیا ہے اور اس پرانے مقولے میں کہ ''ہر بڑی شخصیت کے پیچھے کسی نہ کسی عورت کا ہاتھ ہوتا ہے۔'' یوں ترمیم کرنے کی تجویز پیش کی ہے کہ

''۔۔۔پیچھے کسی نہ کسی ماں کا ہاتھ ہوتا ہے۔''

خاکہ ''چراغِ آخرِ شب'' میں فردیت کے نادر لیکن مقدس گوشوں کو آشکار کیا گیا ہے۔ اس کے برعکس خاکہ ''سنگِ میل'' میں وہ قوم سامنے آتی ہے جو دشمن کے سامنے جنگ کے ہنگام میں سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن جاتی ہے اور وطن کے ناموس وتحفظ کے لیے نقدِ جان پیش کرنے میں ذرا بھر تامل نہیں کرتی۔ یونس جاوید نے لکھا ہے:

''ان دنوں ہمیں یہ بھی معلوم ہوا کہ جنگ کیا ہوتی ہے؟ محاذ کیا ہوتا ہے؟ شہادت کا کیا رتبہ ہے؟ زخم کیسے کھلتے ہیں؟ خون کیسے دیا جاتا ہے اور سیسہ پلائی دیوار کا مفہوم کیا ہے؟''

لیکن اس کے ساتھ ہی وہ نالہ بہ لب ہے کہ

''آج جہاں میں کھڑا ہوں۔۔۔ مجھے لگتا ہے ہم ان لفظوں کے معانی نہیں جانتے۔۔۔ یا پھر لفظ اپنے مفاہیم کھو چکے ہیں۔۔۔ یا پھر میری بصیرت میں کچھ کمی ہے۔۔۔ مگر ایک بات طے ہے کہ کہیں نہ کہیں گھپلا ہے ضرور۔'' (ص ۱۹۱)

یونس جاوید کی ان باتوں میں چودہ کروڑ پاکستانی باشندوں کی آواز شامل ہے لیکن حالات کے بہاؤ اور امریکی یلغار کے سامنے تاریخ کسی کو ملزم یا مجرم قرار دیئے بغیر اپنا فیصلہ خود رقم کر رہی ہے اور کسی کو پتہ نہیں کہ گھپلا کہاں ہو رہا ہے لیکن بقول یونس جاوید کہیں نہ کہیں ہو ضرور رہا ہے۔ سابقۃ الذکر خاکوں کے مقابلے میں متذکرہ دو خاکوں میں ہمارے سامنے ایک بالکل مختلف النوع یونس جاوید آتا ہے لیکن تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس کے تین خاکوں ''جوگی''، ''سید صاحب'' اور ''دوسرا دن'' سے جو عقیدت، محبت اور خلوص جھلکتا ہے وہ باقی تمام خاکوں کو بے تکلفی پر غالب آتا محسوس ہوتا ہے۔

احمد بشیر کے خاکہ ''جوگی'' کو تو میں لالۂ خودرو سمجھتا ہوں یعنی یونس جاوید نے احمد بشیر کی کتاب ''جو ملے تھے راستے میں'' کا دیباچہ لکھنا شروع کیا تو احمد بشیر اس کی یادوں سے اُبھر کر سامنے آنے لگا۔ سب سے پہلے اسے ممتاز مفتی کی یہ بات یاد آئی کہ ''احمد بشیر کی شخصیت کے شالامار کے کسی پوشیدہ حجرے میں ایک سور رہتا ہے۔'' یونس جاوید نے ۳۵ برس پہلے کے اس حجرے سے سور کو تلاش نہیں کیا کیوں کہ اسے شخصیت کے اس شالامار سے ایک معصوم بچے، ایک تجسس بھرے نوجوان اور ایک مضطرب مدبر کو بازیافت کرنا تھا، جس کی جھولی خوابوں سے بھری ہوئی تھی اور جو ہر شام یہ نوید دیتا تھا کہ دوسری صبح جبر اس وطن سے ہی کیا پوری دنیا سے اُٹھ جائے گا۔ یونس جاوید کے تجربے میں جو احمد بشیر آیا تھا وہ ایمن آباد کا پہلا شیخ تھا جس نے دولت جمع کرنے کے جنون کو کھرچ کر اپنی ذات سے الگ کر دیا تھا کیوں کہ سچ پر پردہ ڈالنے کا گر اسے آتا ہی نہیں تھا۔ اس خاکے میں احمد بشیر ایک ایسا ترقی پسند ہے جو سگان دنیا سے مختلف ہے اور جس کا فطری سچ اس کے اپنے خاکوں مثلاً احسان دانش، چراغ حسن حسرت، میراجی، ظہیر کاشمیری، کشور ناہید اور قدرت اللہ شہاب کے خاکوں سے آتش فشاں کی طرح گھن گرج کے ساتھ لاوا ریز نظر آتا ہے۔ یہ خاکے رسائل کے اوراق میں گم ہو گئے تھے، یونس جاوید نے انہیں تلاش کیا اور ایک خوبصورت کتاب کی صورت دے دی جس کے چھپتے ہی شور مچ گیا اور احمد بشیر کے ''واجب القتل'' ہونے کے فتوے صادر کر دیئے گئے لیکن احمد بشیر جب تک زندہ رہا ان فتوں کو بقول یونس جاوید مچل مچل کر دوہراتا اور کہتا کہ ''سچ کو آنچ نہیں ہے۔'' احمد بشیر ترقی پسندوں میں شاید واحد ادیب ہے جس نے اپنی ذات کو نام ونمود اور شہرت ونمائش سے شعوری طور پر محفوظ رکھا اور ترقی پسندوں نے بھی اسے ہمیشہ نظرانداز کیا لیکن غیر ترقی پسند یونس جاوید نے اسے روایتی ٹلّہ جوگیاں (جہلم) کا دانشور قرار دے دیا تو ہفتا دو ہشتاد سالہ تمام ترقی پسند ادیب اس کے سامنے ''بونے'' اور دولت کے پجاری نظر آنے لگے جن کی ساری دلچسپی ''دو پیسے'' کے کام یا سرکاری ایوارڈ میں تھی۔

یونس جاوید نے ''مجلس ترقی ادب'' میں پہلا قدم رکھا تو اس ادارے کے ناظم کی کرسی پر سید امتیاز علی تاج تشریف فرما تھے، جنہیں ڈرامہ ''انار کلی'' لکھ کر ادبی دنیا میں لازوال شہرت مل چکی تھی، ''نیاز مندان لاہور'' کے رکن کی حیثیت میں بھی ان کی شخصیت معروف تھی، لیکن اہم بات یہ ہے کہ انہوں نے زمانی شہرت کو اپنی فطری حلیم الطبعی اور موروثی وضع داری پر غالب نہ آنے دیا اور عالی ظرفی اور کشادہ دلی سے مجلس میں ایسی فضا قائم کر دی جسے تحقیق کی صبر آزما فضا قرار دیا جا سکتا ہے۔ دکھ کی بات یہ ہے کہ سید صاحب جب اردو کے کلاسیکی ڈرامے کی تیس جلدوں والے پرجیکٹ پر کام کر رہے تھے تو کسی شقی القلب نے انہیں قتل کر دیا۔ اس غیر طبعی موت کی وجہ سے کلاسیکی ادب کی اشاعت کے متعدد منصوبے ادھورے رہ گئے۔ پوری ادبی دنیا میں صفِ ماتم بچھ گئی، تاج صاحب کی موت کو ''اُردو ڈرامے کی موت'' قرار دیا گیا۔ یونس جاوید کا یہ خاکہ تعزیتی نوعیت کا ہے جو آخر میں قتل کی صحافتی اور تفتیشی رپورٹ بن جاتا ہے لیکن اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ اس نے تاج صاحب کو فاصلے سے دیکھنے کے باوجود اپنی زیرک نگہی سے ان کی شخصیت کے متعدد منفرد گوشوں کا مطالعہ کر لیا تھا۔ مثلاً اس نے محسوس کیا کہ:

''کام لینے کے دو ہی طریقے ہیں۔ لالچ یا خوف۔۔۔ مگر ان (تاج صاحب) کا طریق ان دونوں سے الگ تھا۔ وہ شفقت اور احترام کے

گھنے سائے میں ڈوبے ایک ایسے راستے کی طرح تھے کہ جو بھی اس پر چلا کسی بہت آسودہ اور کشادہ باغ میں نکل آیا۔ اس میں کام کرنے کی صلاحیت دوگنی ہو گئی۔۔۔وہ دوسروں کو اس قدر عزت دیتے تھے، کچھ ایسا حسنِ سلوک تھا، ان کا کہ یہ ان کی ذات کا بنیادی استعارہ بن کر رہ گیا تھا۔ ایک نرماہٹ تھی کہ ان کے قلم تک ہی ڈھل گئی تھی۔''

یونس جاوید نے ان کی عالی ظرفی کے متعدد واقعات لکھے ہیں اور ان کی فطرت کے بعض نرم گوشوں کو منکشف کر دیا ہے۔ ایک واقعہ یوں ہے:

''ایک مرتبہ ایک غلط چیک کاٹ کر کیش کرا لیا۔ تاج صاحب نے چھان پھٹک کے بعد اسے مجرم پایا مگر بہت اداس ہو گئے کہ بددیانتی انہیں سخت ناپسند تھی۔ ہم سب کو کمرے میں بلایا۔ سارا واقعہ سنایا۔ بنک کی رپورٹ نکالی۔ دکھائی اور افسردہ ہو گئے۔ پھر کلرک کو بلا کر کہا ''کیس تو پولیس میں جانے والا ہے لیکن تم اس چیک کی رقم واپس کرنے کے علاوہ باقی حساب آڈٹ کرا کے درست دکھا دو تو تم پر اور خود ہم پر پولیس کا عتاب نازل نہ ہوگا۔'' کلرک مان گیا۔ اس نے تحریر تو لکھ لی مگر دوسرے دن جب آڈیٹر بلائے گئے تو وہ روپوش ہو گیا۔ یہ واقعہ عیدالفطر سے تین چار روز پہلے کا تھا۔ انہوں نے دوبارہ سٹاف کو اکٹھا کیا۔ پولیس کو مطلع کرنے سے پہلے سو مرتبہ سوچا اور کہا ''کیسا آدمی ہے اس کے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ عید بچوں کے لیے بہت بڑی خوشی ہوتی ہے۔ ظالم نے ننھے بچوں کی خوشیاں برباد کر دیں۔'' رپٹ درج کراتے ہوئے انہیں بہت دکھ اور افسوس تھا مگر بددیانتی۔۔۔کام کی ہو یا نام کی۔۔۔یا حساب کتاب کی انہیں سخت ناپسند تھی بلکہ اگر کہا جائے کہ شدت سے نفرت تھی تو بجا ہوگا۔'' (ص ۱۸)

میں یہ واقعہ لکھ کر تاج صاحب کی بددیانتی سے نفرت کے رجحان کی تجدید کر رہا ہوں تو پل کے نیچے سے بہت سا پانی گزر چکا ہے اور مال، کام اور نام کی دیانت کے معیار بھی تبدیل ہو چکے ہیں، اب مجلس ترقی ادب میں مالی بدعنوانی نہ صرف لاکھوں تک پہنچ چکی ہے بلکہ عارفہ زہرہ سید اور طاہر جمیل کی رپورٹ میں ثابت بھی ہو چکی ہے لیکن مبینہ بدعنوان اہلکار اپنی نشست پر براجمان بتائے جاتے ہیں۔ شاید لنگوٹی میں پھاگ بھی کھیلا جا رہا ہے اور اکاؤنٹنٹ جنرل کے ''آڈٹ'' سے بھی گریز کیا جا رہا ہے جس کا حکم مجلس کی ''گورننگ باڈی'' نے دیا تھا۔ اس نوع کے حالات میں تاج صاحب کے اقدام کی جو عملے کی مشاورت سے اُٹھایا گیا، جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔

اس خاکے میں ایک مقام پر سید عابد علی عابد بھی رونما ہوتے اور تاج صاحب کے وسیلے سے اپنے کردار کا ایک انوکھا زاویہ منکشف کر جاتے ہیں۔ یونس جاوید نے لکھا ہے:

''مجلس میں ان دنوں عابد علی عابد بھی کام کرتے تھے جو ادارے کے لیے قابلِ فخر تھا۔۔۔جب میں نیا نیا ملازم ہوا، ان دنوں بوجوہ ان پر دفتر آنے کی پابندی نہ تھی مگر وہ اسے زیادہ پسند نہ کرتے تھے اور چاہتے یہی تھے کہ دفتر میں آنا جانا رہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے ایسی باتیں بھی کیں جو اُن کی مجبوری تھی۔۔۔ مثلاً ایک مرتبہ وہ تاج صاحب سے کہہ رہے تھے ''سید صاحب، رات احسن کا ایک ڈرامہ ہاتھ لگا۔۔۔پڑھا تو لگا تاج نے لکھا ہے۔'' تاج صاحب نے اس جملے کو قبول تو نہ کیا مگر ان کی وضعداری کچھ ایسی تھی کہ وہ بہت شدت سے عابد صاحب کی مخالفت بھی نہ کر سکے۔'' (ص ۱۷، ۱۸)

یونس جاوید نے سید امتیاز علی تاج کو بہت کم دیکھا، کاش! وہ انہیں زیادہ دیکھ سکتے اور ان کی شخصیت کے مزید پہلوؤں کو ہمارے سامنے منکشف کرتے۔

مجلس ترقی ادب کے حوالے سے یونس جاوید کا ایک اور خاکہ پروفیسر حمید احمد خان کے بارے میں ہے جو سید امتیاز علی تاج کے ناگہانی قتل کے بعد مجلس کے ناظم مقرر ہوئے تھے اور جب یہ تقرر ہوا تو وہ ملک سے باہر تھے، ان کا تقرر ان کی عدم موجودگی میں عمل میں آیا تھا۔ یونس جاوید نے ان کے ساتھ مجلس میں ان کے سانحۂ ارتحال تک کام کیا اور ان کی شخصیت کے گوشوں کا مطالعہ بھی قریب سے کیا لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خاکہ نگار کے سامنے ایک شخص مثلِ آفتاب موجود ہے جس کی طرف وہ آنکھ اٹھا کر دیکھ نہیں سکتا۔ دوسرے یہ خاکہ بھی تعزیتی نوعیت کا ہے جو پروفیسر حمید احمد خان کی وفات کے دوسرے دن لکھا گیا اور اسی شام حلقہ اربابِ ذوق میں پڑھا بھی گیا۔ چنانچہ خاکہ نگار غم میں ڈوبا ہوا اور نالہ بہ لب محسوس ہوتا ہے۔ آنسوؤں کی ان جھالروں کے عقب سے ہمیں یونس جاوید نے خاں صاحب کے کردار کے متعدد روشن چراغ دکھائے ہیں۔ مثلاً پہلے ہی روز کی سٹاف میٹنگ میں انہوں نے تاج صاحب والی کرسی اُٹھوائی، دوسری رکھوائی اور بیٹھنے سے پہلے کہا ''جسارت ہے کہ جس جگہ کل تک میرا دوست بیٹھا کرتا تھا، میں بیٹھ جاؤں مگر زندگی انہیں رنگوں سے عبارت ہے۔''

اس سٹاف میٹنگ کے دوران انہوں نے اپنے معمول کی جو باتیں ارشاد فرمائیں وہ بھی بڑی معنی خیز اور آئندگان کے لیے قابلِ تقلید ہیں۔ انہوں نے کہا:

''دو باتیں میں آپ کے گوش گزار کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ ایک تو یہ کہ ۱۴۔ اگست ۱۹۴۷ء کے بعد میں نے جھوٹ نہیں بولا جس کا مطلب ہے کہ جھوٹ مجھے پسند نہیں۔ دوسری یہ کہ بعض اوقات میرے لہجے کے باعث دوستوں اور رفیقوں کو مجھ سے شکایت پیدا ہو جاتی ہے لیکن آپ دیکھیں گے کہ میرے قلم سے آپ کے خلاف کچھ نہ لکھا جائے گا۔ ایک بات اور بھی آپ کو بتا ہی دوں کہ جن لوگوں نے کبھی نہ کبھی مجھ سے کچھ پڑھ رکھا ہے مجھے سب سے زیادہ عزیز بھی ہیں لیکن اگر آپ کو ان سے جائز شکایت ہوئی تو انصاف بہر حال ہوگا۔'' (ص ۴۷)

کسی ادارے کے سربراہ کا اپنے دفتر کے کارکنوں اور اہلکاروں کو رفیق اور دوست سمجھنا اور ان کے ساتھ برابر کا سلوک کرنا ایسا کلیدی نکتہ ہے جس

سے ہر مشکل کا قفل کھل سکتا ہے لیکن افسوس کہ ہمارا معاشرہ ان اوصاف سے تہی ہو چکا ہے اور اب ہر طرف افسرانہ نخوت اور انائے کا ذب گردن فراز نظر آتی اور پوری قومی کو ترقی معکوس کے عمل سے گزار رہی ہے۔ پروفیسر حمید احمد خان اپنے اس اصول پر خود کتنا عمل کرتے تھے، اس کا ثبوت بھی یونس جاوید نے اس خاکے میں فراہم کر دیا ہے۔ اس نے لکھا ہے:

''اقبال کے عشق نے ہی انہیں مجبور کیا تو اقبال صدی کے اہتمام میں انہوں نے خصوصاً اقبال پر چار نئی کتابیں شائع کرائیں اور جلسہ بھی کیا۔ جلسے کے بعد وہ بے حد مطمئن تھے۔ کہنے لگے کل ''سب لوگ'' ایک جگہ جمع ہو کر چائے پئیں۔ میں آپ لوگوں کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں۔ کرسیاں بچھیں، چپراسی بھی تھے، مالی بھی مگر خاکروب نہیں تھا۔ پوچھا ''جلال کہاں ہے، بلاؤ۔۔۔''سب لوگوں'' سے میری مراد سب لوگ ہی ہیں۔'' پھر اس کے لیے کرسی منگوا کر رکھوائی اور اسے بیٹھنے کے لیے کہا۔ وہ بیٹھ گیا تو بولے ''تم عیسائی ہونے کی وجہ سے ہمارے ساتھ چائے پینا پسند نہ کرو تو الگ بات ہے مگر ہمیں تمہارے ساتھ بیٹھ کر چائے پینے میں کوئی عار نہیں اور پھر اس جلسے کا اہتمام کرنے والوں میں تمہارا حصہ بھی اتنا ہی ہے جتنا باقی دوسروں کا۔'' (ص ۵۱)

دلچسپ بات یہ ہے کہ خاں صاحب اپنے معاونین کو ان کے ذاتی کاموں میں راہنمائی کے لیے بڑی مفید نصیحتیں بھی دیا کرتے تھے۔ یونس جاوید ایم اے کے امتحان کی تیاری میں مصروف تھا تو انہوں نے اس سے کہا:

''یونس جاوید صاحب! اورینٹل کالج کے کسی استاد کو ناراض نہ کیجیے گا۔'' پھر ایک لحہ رک کر کہا: ''سیاست علم و ادب سے، بہت سطحی چیز ہے اور یہ سطحی چیز اورینٹل کالج میں جا کر کچھ اور بھی سطحی ہو گئی۔ میں تو وائس چانسلر بھی رہا ہوں اور وہاں کے ماحول کو جانتا ہوں مگر آپ کو زیادہ فکر کی بھی ضرورت نہیں۔ آدمی اپنی سفارش خود ہوتا ہے۔'' (ص ۵۲)

اس خاکے میں یونس جاوید نے پروفیسر حمید احمد خان کے راست کردار کی متعدد عینی شہادتیں پیش کی ہیں تو ان سے ان کی دنیوی اعتقادات اور داخلی تصورات و ایقان کے ساتھ ان کی زندگی کے عملی زاویے بھی سامنے آ جاتے ہیں۔ مثلاً شاگردوں کے پیار اور خطوط نگاری کے سلسلے میں یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

''شاگردوں سے انہیں کس قدر پیار تھا، ان کے مسائل ذاتی ہوں یا گھریلو، خاں صاحب انہیں اتنا اہم بنا لیتے جس قدر ان کے لیے غالب اور اقبال کا مضمون تھا یا کسی بھی شخص کا خط۔۔۔ خط کا جواب تو وہ بڑے اہتمام سے دیا کرتے تھے۔ ایک دفعہ لکھتے۔۔۔ ٹائپ ہوتا۔۔۔ غلطیاں لگتیں۔۔۔ پھر ٹائپ ہوتا (جاننے والوں کو خط ہاتھ سے لکھتے تھے) کاغذ کو بڑی احتیاط سے تہہ کرتے ہوئے لفافہ خود بند کرتے۔۔۔ پتے کو چیک کرتے۔ اپنی مہر لگواتے، تب ڈاک رجسٹر پر چڑھتی۔ ڈاک میں جانے والے خط کی شہادت اس شخص سے لیتے جو خط پوسٹ کرنے گیا ہو۔ خط دستی بھجوایا گیا ہو تو رسید دیکھتے اور پھر ان کے چہرے پر روشنی آ جاتی۔ وہ اپنے آپ کو ہلکا پھلکا محسوس کرتے اور خوشگوار گفتگو کرنے لگتے۔۔۔ میں اکثر سوچتا یہ ایک خط کا بوجھ تھا۔۔۔ یا ایک پہاڑ کا۔''

اردو زبان سے محبت کا زاویہ اُبھرا تو یونس جاوید نے لکھا:

''آپ نے انہیں پنجابی بولتے ہوئے شاید نہ دیکھا ہو مگر میں نے انہیں پنجابی بولتے ہوئے بھی دیکھا ہے اور روتے ہوئے بھی۔۔۔ دفتر میں ایک صاحب ایسے تھے جو اردو کا تلفظ حد درجہ غلط بولتے تھے۔ خاں صاحب نے اس شخص سے کہا ''تسی میرے نال پنجابی وچ گل کر لیا کرو۔'' جب وہ چلا گیا تو مجھ سے کہا ''اردو کے ساتھ یہ سلوک مجھ سے برداشت نہیں ہوتا کہ مجھ سے ''مزاج'' کے بجائے ''مجاز'' بولے۔ میں نے کوشش تو کی یہ صحت مند اردو سیکھ لیں مگر اب کیا کریں ان کی مجبوری ہے۔'' (ص ۴۸)

لفظ کے بارے میں ان کا تصور حسبِ ذیل تھا:

وہ اکثر کہا کرتے کہ لفظ ایک طاقت ہے اور اس کی کئی سطحیں اور پرتیں ہوتی ہیں۔ اگر آپ نے اسے ایک ہی معنی میں استعمال کر دیا تو آپ اس طاقت کو استعمال کرنے کا ہنر بالکل نہیں جانتے۔ لفظ کا صحیح استعمال صحیح املا کے ساتھ اور تلفظ کا صحیح استعمال صحیح لہجے کے ساتھ، ان کا ایمان تھا۔ اس سلسلے میں انہیں ماضی سے سند لینا پڑتی تو ضرور لیتے۔ میں نے ''نسبتہ'' کا لفظ ''ہ'' کے بجائے ''الف'' سے لکھا تو کہا اگر حالی اور شبلی نے الف سے لکھا ہے تو درست ہے ورنہ سیکھ لیجیے کہ ''نسبتہ''۔۔۔''ہ'' سے ہوتا ہے۔ دوسری مرتبہ میں نے ''برصغیر'' کہا تو مجھے سمجھایا کہ براعظم کے بعد برعظیم ہونا چاہیے۔ برصغیر تو مٹی کا ڈھیلا بھی ہو سکتا ہے۔۔۔ خاں صاحب کا حال یہ تھا کہ کبھی کوئی تحریر لکھتے تو کلب علی خاں فائق صاحب اور مجھے بلا کر سناتے اور کہتے ''دیکھئے! یہ جملہ یوں درست رہے گا یا یوں۔''۔۔۔ فائق صاحب کبھی کوئی مشورہ دیتے تو وہ جملہ بدل دیتے۔ اس سے میں نے یہ اندازہ لگایا کہ تمام عمر اُن کی حیثیت طالب علمانہ رہی اور سیکھنے اور جاننے کے لیے ایک اضطراب انہیں ہر وقت بے چین رکھتا تھا۔'' (ص ۴۷ تا ۴۹)

یونس جاوید نے خاں صاحب کی وطن عزیز سے بے پایاں محبت کا ایک نقش اس وقت دیکھا جب سقوط ڈھاکہ عمل میں آ گیا تھا۔

''ڈھاکہ فال ہونے کے دوسرے روز وہ بہت سویرے دفتر آ گئے۔ چہرے پر سوالات کی زردی تھی، ہمیں کمرے میں بلایا اور کہا اب جینے کی خواہش باقی نہیں رہی۔۔۔ پھر باتوں باتوں میں آزادی کی تحریکوں سے پاکستان کے وجود اور اس کے بعد جو بھی خواب انہوں نے دیکھے تھے، ہمیں دکھائے۔ تاریخ لفظوں کے فریم میں تصویر بن کر آ گئی تھی۔۔۔ اتنے میں کسی نے اطلاع دی کہ ہندوستانی جہازوں نے گولیوں کی بوچھاڑ شروع کر رکھی ہے جو دفتر کے آس پاس نشانات چھوڑ گئی ہے۔ خاں صاحب اُٹھے اور مجلس کے وسیع لان میں ٹہلنے لگے۔ دو تین مرتبہ جہاز ناقابل برداشت گڑگڑاہٹ پیدا کرتے ہوئے گزرے۔ میں نے ان سے ڈرتے ڈرتے درخواست کی کہ وہ اندر آ جائیں کہ وہ روپڑے کہنے

لگے''میری خواہش ہے کہ گولیوں کی بوچھاڑ میرے اوپر سے گزرے۔۔۔یا بم میرے پاؤں میں آ کر گرے کہ فنا ہو جاؤں۔ یہ سب کچھ کس کی کوتاہی سے ہوا اور کون ذمہ دار نہیں ہے؟ یہ وقت بحث کا نہیں، یہ تو مرنے کا وقت ہے۔''ایک لمحہ توقف کے بعد بولے''مگر یہ آپ لوگوں کے مرنے کا وقت نہیں ہے۔آپ اندر جائیں۔''(ص ۴۸۔۴۹)

ان دو خاکوں سے میرے ذہن میں ایک خیال کوندے کی طرح لپکا ہے کہ مجلس ترقی ادب کو آغاز میں جو دو ناظم ملے وہ علمی، ادبی، تہذیبی اور تمدنی زاویوں سے کتنے پختہ نظر اور پختہ عمل تھے۔نتیجہ یہ ہوا کہ یہ ادارہ صرف پنجاب کا ہی نہیں پورے پاکستان کا وقار بن گیا لیکن حمید احمد خان رخصت ہوئے تو گویا چراغوں میں روشنی نہ رہی اور ادب کے وہ گم شدہ خزینے جن کی بازیافت امتیاز علی تاج اور پروفیسر حمید احمد خان نے کی اور تجدید اشاعت سے ان کی تزئین نو کی مجلس کے گودام میں خاک میں رُل گئے، یونس جاوید نے ایک ڈرے سہمے انسان کی حیثیت میں اس کا ذکر نہیں کیا لیکن طاہر جمیل اور عارفہ سیّد کی انکوائری رپورٹ یہی کچھ کہتی ہے۔شاید اس دَور کی مجلس ترقی ادب کا خاکہ اب لکھا جائے جب قریباً نوے برس کے عمر رسیدہ ناظم نے پچپن ساٹھ برس کے جوانِ رعنا یونس جاوید کو فارغ کر دیا ہے۔

یہاں پہنچ کر اب میں کہہ سکتا ہوں کہ یونس جاوید نے اپنے پڑھنے والوں سے جو وعدہ کیا تھا کہ''میں تھوڑا سا سچ چھپالوں گا مگر جھوٹ نہیں لکھوں گا'' وہ اس نے پورا کر دیا ہے۔اس کے خاکے شاہد ہیں کہ وہ زندگی کا بے حد زیرک ناظر ہے۔واقعات کی باریک ترین جزئیات اس کی مشاہدہ بین آنکھ سے اوجھل نہیں رہ سکتیں۔اکثر مقامات پر مجھے یوں محسوس ہوا کہ اس کی متحرک آنکھ متحرک کیمرے کا عدسہ ہے جو ہمہ وقت گردش میں رہتا ہے اور شخصیات کو فوکس میں لے کر ان کے پورٹریٹ تیار کرتا رہتا ہے اور وہ اپنے شعور کے ساتھ لاشعور کو بھی کاغذ پر منعکس کر دیتا ہے۔سعادت حسن منٹو کے''گنجے فرشتے''اور احمد بشیر کے''جو ملے تھے راستے میں''کے خاکوں کے بعد یونس جاوید کی کتاب''ایک چہرہ یہ بھی ہے'' میں متعدد شخصیات کے حوالے سے معاشرے کا بہت سا سچ ہمارے سامنے اپنی کڑواہٹ بکھیرتا چلا جاتا ہے لیکن معاشرہ اس سے مزید سچ سننے کے لیے بے تاب ہے۔

''ایف۔آئی۔آر''

آپ کی کتاب کے ملنے کی اطلاع دے چکا ہوں۔امید ہے کہ میرا خط ملا ہوگا۔اس خط کے لکھنے کا مقصد یہ ہے کہ آپ کو اُس خوشی میں شریک کر سکوں جو آپ کی کتاب پڑھنے سے مجھے حاصل ہوئی ہے۔ابھی کچھ دیر پہلے میں نے اس کتاب کو ختم کیا ہے۔جن لوگوں کے آپ نے خاکے لکھے ہیں اُن میں سے آدھے تو ایسے ہیں جن سے میں کبھی نہیں ملا، باقی آدھے وہ ہیں جن سے دو چار ملاقاتیں ہیں یا دور کی شناسائی ہے، مگر آپ کی کتاب پڑھنے کے بعد ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے میں ان سب کو بہت قریب سے جانتا ہوں اور برسوں سے ان کے ساتھ اُٹھنا بیٹھنا ہے۔یہ ان شخصیات کا نہیں آپ کا کمال ہے کہ آپ نے انہیں اپنے قاری سے اتنا قریب کر دیا۔آپ کا کمال یہ بھی ہے کہ چھوٹے چھوٹے جملوں میں آپ بڑی بڑی باتیں کہہ جاتے ہیں۔مثلاً اگر کسی شخص کا کوئی وصف مجھے بیان کرنا ہو تو میں دو صفحے ضرور لکھوں گا مگر آپ ایک دو جملوں میں ہی اس وصف کو بیان کر دیتے ہیں اور وہ بھی اس طرح کہ موضوع کی برائی بھی اس کی اچھائی نظر آتی ہے۔برائی کو برائی کے طور پر لکھا جائے تو تحریر ایف آئی آر بن جاتی ہے مگر آپ ایسا نہیں کرتے۔حیرت ہے کہ احمد بشیر صاحب سے اتنا قریب رہنے کے باوجود آپ نے قصائی کی چھری کو بطور قلم استعمال نہیں کیا۔

ایک خاکے میں غازی خدا بخش کا ذکر پڑھ کر مجھے اپنا بچپن یاد آ گیا۔غازی صاحب میرے والد مرحوم کے دوستوں میں سے تھے اور اکثر ہمارے گھر آتے تھے۔اتنے گہرے مراسم تھے کہ ہمارے گھر کے فرد سمجھے جاتے تھے۔لاہور میں نے جون ۱۹۴۸ء میں چھوڑ دیا جب میں ساڑھے بارہ برس کا تھا۔اس کے بہت بعد ۱۹۶۳ء میں میں نے اُنہیں دیکھا جب وہ کراچی میں ہمارے گھر چند روز رہے۔اُن کی تصویر ایک کیلنڈر پر بھی چھپی تھی۔وردی میں اذان دے رہے ہیں۔یہ کیلنڈر اپنی معیاد پوری کرنے کے بعد بھی ایک عرصے تک والد صاحب کے کمرے کی دیوار سے لٹکتا رہا۔یہ تو مجھے بہت بعد میں معلوم ہوا کہ وہ اردو ڈائجسٹ کے ایڈیٹر الطاف حسن قریشی کے خُسر ہیں۔

خدا آپ کو خوش رکھے کہ آپ نے یہ کتاب لکھ کر مجھے خوش کیا ہے۔

مشفق خواجہ

پُرتاثیر بیانیوں کا طلسم

ڈاکٹر سعادت سعید
(لاہور)

یونس جاوید کے افسانے انسان، سماج اور زندگی کے رنگا رنگ حوالوں سے معمور ہیں۔انہوں نے حقیقت نگاری میں موجود اسلوبی افسوں کا اس مہارت سے استعمال کیا ہے کہ ان کے بیانیے، معروضی حدوں سے نکل کر صورتِ حال کا سامنا کرنے والے کرداروں کے داخلی کوائف کو بھرپور انداز سے چھوتے دکھائی دیتے ہیں۔''تیز ہوا کا شور''، ''آوازیں''، ''میں ایک زندہ عورت ہوں'' اور اب ''ربا سچیا ربّ قدیر'' تک یونس جاوید کے ڈکشن میں نمایاں تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں۔ان کے تازہ ترین افسانوں میں میجک ریالزم یا افسونی حقیقت نگاری کے پر تاثیر تیور منعکس ہوئے ہیں۔ بیانیوں میں داخلی کیفیات کی عکاسی معمولی کام نہیں ہے۔اس کے لیے تجربے کی کٹھالی میں پگھل کر پانی ہونے کے ساتھ ساتھ زبان کے مکالماتی، خود کلاماتی، تفکراتی اور بیانیاتی امکانات کو بروئے کار لانا پڑتا ہے۔

یونس جاوید کے نئے افسانوں کے بیانیے کئی سطحوں پر خصوصاً جسمانی، جذباتی تصویر کشی میں ڈی ایچ لارنس کے فکشن میں موجود مسحود کن بیانیوں سے جا ملتے ہیں۔انہوں نے افسانہ نویسی میں کہانی پن کا اس انداز سے خیال رکھا ہے کہ ان کی کہانیاں سپاٹ حقیقت نگاری سے ماورا ہو کر آفاقی صداقتوں کے ادوار میں داخل ہو جاتی ہیں۔

یونس جاوید افسانہ نگار، ڈرامہ نگار، نقاد اور محقق ہیں۔ان کے چار سو سے زائد ڈرامے نشر و ٹیلی کاسٹ ہوئے ہیں۔ان کے افسانوں کے کئی مجموعے منظر عام پر آ چکے ہیں۔انہوں نے حلقہ ارباب ذوق پر ایک سیر حاصل تحقیقی مقالہ لکھا ہے۔معاصر افسانہ نگاروں خصوصاً نیلوفر اقبال، طاہرہ اقبال، سلمٰی اعوان، فہمیدہ کوثر اور فرحت پروین کے حوالے سے ان کی تنقیدی آرا ابھی شائع ہو چکی ہیں۔وہ بنیادی طور پر ایک حقیقت نگار کی حیثیت سے جانے پہچانے جاتے ہیں۔ انہوں نے اپنے افسانوں میں تاثراتی طریق اظہار استعمال نہیں کیا کہ یہ طریق اظہار زندگی، کائنات اور انسان کے اُڑے اُڑے منظر نامے پر منتج ہوتا ہے۔اسے زیادہ تر عالمانہ اور دانشورانہ تخلیقات پسند کرنے والے قاری زیادہ سراہتے ہیں۔

یونس جاوید نے مافوق الفطرت یا غیر انسانی کرداروں یا خلائی مخلوق کے حوالے سے افسانے قلمبند نہیں کیے۔

فلوبیر نے مادام بواری کی نقشہ کشی میں جس قسم کے معروضی بیانیے کا اہتمام کیا ہے اُردو ادب کے کئی مستند افسانہ نگاروں کے یہاں ویسے بیانیے دستیاب ہیں۔غلام عباس، راجندر سنگھ بیدی اور سعادت حسن منٹو نے جزئیات نگاری میں جو نام پیدا کیا ہے وہ کم کم افسانہ نگاروں کے حصے میں آیا ہے۔مگر یونس جاوید کی حقیقت نگاری مذکورہ افسانہ نگاروں کے اسالیب بیان کا پرتو بھی لیے ہوئے ہے۔انہوں نے اُردو افسانے کی رنگا رنگ کائنات میں اپنے مشاہدوں اور تجربوں سے گہرے رنگوں کا اضافہ کیا ہے۔

یونس جاوید نے یوں تو ان گنت چھوٹے بڑے موضوعات اور معاملات پر خامہ فرسائی کی ہے۔لیکن کچھ عرصہ سے ان کا مرغوب موضوع جاگیردارانہ اور سرمایہ دارانہ سماجوں کی چیرہ دستیوں کے نتیجے میں دکھی ہونے والی انسانیت ہے۔انہوں نے انسانی دکھوں کی کہانیاں دردمندانہ انداز سے لکھی ہیں۔ وہ مذکورہ سماجوں میں بے توقیر ہوتے انسانوں کے بارے میں کہانیاں لکھتے ہیں۔ ان سے انسان کی تذلیل برداشت نہیں ہوتی۔سرمایہ دارانہ معیشت میں جن لوگوں کو جبری طور پر پائمال کیا جاتا ہے انہوں نے ان کے نوحے لکھے ہیں۔

یونس جاوید کے کئی افسانوں میں عورت پر سماجی دباؤ کے خلاف رد عمل ظاہر کیا گیا ہے۔عورت کو کھلونا سمجھنا یا عورت کا مجبوری کی حالت میں کھلونا بننا دونوں قسم کے موضوعات کو انہوں نے باریک بینی سے کھنگالا ہے۔ جاگیردارانہ سماج میں عورت کی انا شکنی بھی ان کا مرغوب موضوع ہے۔انہوں نے عورتوں کے ہاتھ عورتوں کی بے عزتی اور بے توقیری کے خلاف بھی کھل کر لکھا ہے۔''ربا سچیا ربّ قدیر'' انہیں المیوں کی گواہی ہے۔

عہدِ حاضر میں حقیقی بیانیوں کے رخ پر غیر حقیقی کا پردہ ڈالنے کے لیے متعدد نظریات کی بازگشت سنی جا رہی ہے۔اس تناظر میں پروپ، سکلووسکی، آر بی بلیک مور، کینتھ برک، فرائیڈ، لاکاں، لیوی سٹراس، رولاں بارتھ، ہیڈن وائٹ، وولف گینگ ایزر، ہینس روبرٹ جاس، ژاک دریدا اور پال ڈی مان کے نظریات کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا، لیکن قارئین کے ایک بڑے طبقے کا خیال ہے کہ حقیقت نگاری کی اصل حقیقت کو گم کرنے کے علاوہ انہوں نے کوئی اور کام نہیں کیا۔حقیقت نگاری کو اس کی اصل روح کو اس حوالے سے جارج لوکاس اور فریڈرک جیمسن کے نظریات غنیمت ہیں۔انہوں نے موضوعیت یا شخصی اور ذاتی زندگی کو بھی حقیقت نگاری کی خشک منطقی اپروچ میں شامل کر کے اس کے لیے وجودی تجربات کے در بھی وا کیے ہیں۔اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں ہے کہ فکر و فلسفے کی دنیا میں جھوٹ کا بول بالا کرنے کے لیے کئی جدید نظریات کی تشہیر ہو رہی ہے۔ ہیئت پرست، فنی تنقید، شگا گو یا نو ارسطوئی دبستان، قاری اساس نظریہ، مابعد ساختیات اور ڈی کنسٹرکشن اور تعبیریاتی تنقید، ان سب تنقیدی نظریات کا بنیادی مقصد قارئین کی توجہ اصل حقیقت سے ہٹانا ہے۔مارکسی اور سماجی نظریات کے پیرو کار آج بھی حقیقت کے حقیقی نقطہ نظر کو فروغ دے رہے ہیں۔تاریخی اور نفسیاتی بیانیوں کی تعبیروں نے تو سب بنیادوں کو متزلزل کر دیا ہے۔ان کی دریافت کردہ سچائیوں ماننے سے انکار کیا جا رہا ہے۔فوریئے کی نفسیاتی حقیقت نگاری کا منبع

متوسط طبقے کی سائیکی ہے۔ وجودی نفسیاتی اور احوالی مظہریاتی حوالے جدید حقیقت نگاری سے باہر رہے ہیں۔

یونس جاوید نے سماج کی معروضی حقیقتوں کو کردار کی صورت حال کا حصہ بنا کر پیش کیا ہے۔اس سیاق وسباق میں ان کے افسانے کئی سطحوں پر معنوی پھیلاؤ کے حامل ہو جاتے ہیں۔ یونس جاوید کے افسانے ''یہی عورت ہے''، ''عورت بھی کیا شے ہے''، ''رباچیا''، ''محبت اس کو کہتے ہیں'' اور ''زوال'' وغیرہ میں جن حقائق کو پیش کیا گیا ہے جدید تھیوری پرست نقادان پر اپنی اپنی تھیوری کا عکس ڈال کر ان کو مکمل طور پر مسخ کرنے کا اہتمام کر سکتے ہیں۔حقیقت نگاری کے بہت سے اسالیب معمولی سے ٹوسٹ کے ساتھ تمام تر حقیقت کو آنِ واحد میں غائب کرنے کا کام بھی کر سکتے ہیں اور یونس جاوید محقق اور نقاد ہونے کی نسبت سے اس حقیقت سے مکمل آگہی رکھتے ہیں۔

یونس جاوید کے کئی افسانوں میں افسانہ نگار بطور معروضی مبصر کی تکنیک بھی استعمال ہوئی ہے۔ایسے افسانوں میں ان کا اپنا نقطہ نظر غالب نظر آتا ہے۔ہنری جیمز نے واحد متکلم یا بنیادی کردار کے وسیلے سے جذبے، ادراک اور خیال وفکر کو پیش کرنے کا وتیرہ کامیابی سے استعمال کیا تھا۔یونس جاوید نے اپنے چند افسانوں میں اس تکنیک سے بھی مدد لی ہے۔کرداروں کے بصری اور حسی خوابوں کو کم سے کم لفظوں میں پیش کرنا ان کا معمول ہے۔یونس جاوید کے ہاں کئی مقامات پر نفسیاتی حقیقت نگاری کی جھلکیاں بھی ملتی ہیں۔بیسویں صدی کے کئی مغربی ڈرامہ نگاروں نے اس تکنیک سے خاصا استفادہ کیا ہے۔اس حوالے سے یوجین اونیل، آرتھر ملر اور ٹینیسی ولیمز کے نام آتے ہیں۔

یونس جاوید نے ان کے پیچیدہ کرداروں کے حوالے سے استعمال ہونے والی نفسیاتی حقیقت نگاری کی تکنیک کو اپنے سادہ اور عام کرداروں کے جذباتی، حسیاتی اور کیفیاتی طرزِ عمل کے اظہار کے لیے استعمال کیا ہے۔اس کے وسیلے سے پاکستانی معاشرے میں فرد پر ہونے والے فرد کے مظالم کو منعکس کیا گیا ہے۔ یونس جاوید نے ترقی پسند افسانہ نگاروں کے منشوری افسانوں میں موجود جاگیردارانہ یا سرمایہ دارانہ نظام کی تبدیلی کے نعروں سے سروکار نہیں رکھا۔انہوں نے نظام موجود کے تناظر میں فرد کے طرزِ عمل کو موضوع بنایا ہے۔

یونس جاوید کی مسحور کن حقیقت نگاری میں چلی کی ناولسٹ آئزابل آلینڈی کے ناولوں میں موجود میجک ریالزم کا انداز تو نہیں ہے کیونکہ انہوں نے نیچرل کے ساتھ سپر نیچرل کو ملانے کا جتن نہیں کیا ان کی ریالزم میں اٹالو کالوینو کی پر اسرار جادوئی حقیقت نگاری کا بھی عمل دخل نہیں ہے۔وہ اپنی حقیقت نگاری میں کئی ناول نگاروں کی مانند سوریئلی اظہار، مزاحیہ اور تمسخر آمیز رویہ بھی اختیار نہیں کرتے۔ گبریل گارشیا مارکیز نے اپنے ناولوں میں فینٹسی اور ریئل کے امتزاج سے جس جادوئی حقیقت نگاری سے کام لیا ہے وہ بھی یونس جاوید کے افسانوں میں موجود نہیں ہے۔البتہ انسان کی داخلی کیفیات کا انہوں نے جس بھر پور طریقے سے اظہار کیا ہے اسے مسحور کن ہی کہا جا سکتا ہے۔اپنے لیے مسحور کن انداز کے باوجود وہ غیر حقیقی، ماورائی، غیر فطری یا سوریئلی اظہار کی کائنات میں داخل نہیں ہوتے۔

یونس جاوید نے جس ماحول میں شعور کی آنکھ کھولی وہ قیام پاکستان کے بعد کے دور کا حصہ تھا۔جب کوئی نیا ملک وجود میں آجاتا ہے تو اس کے باسی خاص طور پر دانشور، قومی تشخص اور ملکی شناخت کی تلاش میں سرگرمی سے منہمک ہو جاتے ہیں۔ان کے جذبے اور حوصلے بلند ہوتے ہیں۔وہ چاہتے ہیں کہ ان کا سماج روز افزوں ترقی کرے۔محمد حسن عسکری اور سعادت حسن منٹو نے جس پاکستانی ادب کا خواب دیکھا تھا اس کے لیے فضا بڑی سازگار تھی۔یہ الگ بات ہے کہ اس نئی مملکت کے لیے جس سیاسی نظام کا ڈول ڈالا گیا تھا اسے زیادہ عرصے تک چلنے نہیں دیا گیا۔1958ء میں مارشل لاء لگا دیا گیا اور 1971ء میں جب دوسرا مارشل لاء لگا تو ہم جغرافیائی اعتبار سے آدھے رہ گئے تھے۔مشرقی پاکستان ہم سے جدا کر دیا گیا تھا۔مغربی پاکستان میں طبقاتی نظام اپنے عروج کو پہنچ رہا تھا۔وڈیروں، فوجی جرنیلوں، قانون دانوں اور انتظامی عہدوں پر فائز نوکر شاہوں کا اتحادی ٹولہ آہستہ آہستہ عوام کو حاصل مراعات سے ہاتھ کھینچتا جا رہا تھا۔ کمرشلزم کا ڈول ڈال دیا گیا تھا۔غیر ملکی قرضوں کے لیے راہیں ہموار کر دی گئی تھیں۔درآمدی اشیا کے استعمال کے ساتھ ساتھ امرا اور متوسط طبقے کی سائیکی میں بھی تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں۔منٹو نے انگریزی دور میں سجائے جانے والے بازاروں کی تلخ کہانیاں لکھیں۔عسکری صاحب کو اپنی تہذیب کی تلاش کا سفر درپیش تھا۔انہوں نے جاتے جاتے اپنے نظریات کا گدا دریا میں پھینک دیا اور گوشہ نشینی کے ساتھ ساتھ صف نشینی کو اپنا لیا۔اب ''حرامجادی'' ان کا مسئلہ نہیں رہی تھی۔ان کے خیالات کے جزیرے مشرقی دانش کے سمندروں سے ابھرنے والے سنامی نے غائب کر دیے تھے۔ان کی زندگی میں نئی طرز کے اثبات آ گئے تھے۔پرانے انکاروں سے انہوں نے ہاتھ اٹھا لیے تھے۔جزیرے کے اختتامیے میں انہوں نے اعلان کیا تھا:

''ادب کو انسانی ترکہ کا حصہ بنانے کے لیے زیادہ عرصہ تک اپنے آپ کو زمان ومکاں میں محدود نہیں رکھ سکتے۔ادب میں ڈیڑھ اینٹ کی الگ الگ مسجدیں نہیں بنتیں۔''

تخلیق کا اصول انہوں نے یہ بتایا کہ موضوع کا پوری شدت سے احاطہ کیا جائے۔وہ خالص نفسیاتی اور تخلیقی افسانے کا منتہا جاسوسی ناول کو قرار دے چکے تھے۔ان کے نزدیک افسانوں میں کسی قسم کے روحانی آشوب کی گنجائش نہیں تھی کیونکہ ان کے بیان کردہ مقولے کے مطابق دیوتا گہرائی چاہتے تھے۔ان کا یہ بھی کہنا تھا کہ ہماری زندگی میں پلاٹ کی اہمیت نہیں رہی۔آج یہ زندگی صرف ''بھن بھن'' پر مشتمل گیت یا نغمہ پیدا کر سکتی ہے۔وہ اچھے افسانہ نگار کے لیے اندرونی تصادم کو ضروری جانتے تھے۔منٹو کا ادب زمان ومکاں کی حدود میں قید تھا۔اسے انہوں نے تسلیم کیا۔اس نے اپنے اسلوب سے ایک علیحدہ کائنات پیدا کر لی تھی۔وہ موضوع کو پوری شدت سے محسوس بھی کرتا تھا اور نفسیاتی

تفتیش و بیان کو بھی پسند کرتا تھا۔اس کا افسانہ جاسوسی ناول نہیں بنا۔اس نے اپنے عہد کے فرد کے روحانی آشوب کو باریک بینی سے کھنگالا تھا۔اس کے افسانوں میں پلاٹ بھی موجود تھا اور اس کے اندر تصادم بھی موجود تھا۔

پس یہی وہ روایت تھی جو یونس جاوید کے حصے میں آئی۔اس نے طبقاتی سماج میں انسان کی جو درگت بنتے دیکھی اسے اپنی تخلیقی تفتیش کا بنیادی مآخذ ٹھہرالیا۔''تیز ہوا کا شور''،''آوازیں''،''میں ایک زندہ عورت ہوں''،''ربا سچیا ربّ قدیر'' حقیقت پسندی کی تکنیک میں لکھے گئے افسانوں پر مشتمل مجموعے ہیں۔ان افسانوں میں انہوں نے ''اس رات کا درد''،''نروان''،''رات کی اونچی فصیل''،''سیدھا راستہ''،''دوسری کہانی''،''اناج کی خوشبو''،''نجات''،''برش اور تلوار''،''نفرت کی دیوار''،''نئے پرانے''،''پامسٹ'' اور ''دھرتی کے گھاؤ'' جیسے مؤثر افسانے لکھے۔دیوار برلن پر لکھی گئی ان کی کہانی ''اُس رات کا درد'' منٹو کی کہانیوں ''ٹیٹوال کا کتا''،''ٹوبہ ٹیک سنگھ'' اور سرحد کے آر پار محصور انسانی زندگی پر لکھے گئے دیگر افسانوں کی یاد دلاتا ہے۔دیوار برلن کو یاد کرنے کا مطلب تو یہی ہے کہ برصغیر میں بھی ایک ایسی دیوار قائم ہو چکی ہے۔اس حوالے سے ناصر کاظمی نے اپنے تجربات و کوائف کو اپنی شاعری کا بھرپور حصہ بنایا ہے۔منیر نیازی نے بھی ''قصہ دو بھرواں دا''،''یا خانپور اے خانپور'' میں اپنے علاقوں سے ''وچھوڑے'' یا ہجر کو موضوع بنایا ہے۔افسانے ''نروان'' میں یونس جاوید نے ماں جی کی خود غرضانہ نفسیات کو موضوع بنایا ہے اور پھر اشارتاً ان کو ان کی غلطیوں سے نجات دلا کر ان کی بے غرض جذبات کی عکاسی بھی کی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ یونس جاوید کے افسانے ان کے اردگرد موجود تقریباً ہر طبقے کے کرداروں کے اعمال و احوال سے متعلق ہیں۔پاکستان بننے کے کچھ عرصہ بعد ہی جس قسم کا خود غرضانہ ماحول سوسائٹی کی رگ و پے کا حصہ بنا دیا گیا تھا اس کی انفرادی سطحوں پر عکاسیوں نے یونس جاوید کو ٹھوس ماحول میں پرورش پانے والے حقیقی خیالات و جذبات کی توضیح و تشریح پر مجبور کیا۔اس سلسلے میں انہوں نے ڈراموں اور افسانوں کا سہارا بھی لیا۔

کمرشلزم کے اس بھیانک دور میں یونس جاوید نے اپنے ٹیلی ڈراموں میں بہت کچھ بیچا ہے۔لیکن ان کے افسانے پڑھ کر ان کے غیر کاروباری ہونے کا یقین آ جاتا ہے۔وہ ایسے ایسے نازک موضوعات کو چھوتے ہیں کہ ٹیلی ویژن کی مخصوص وضع دارانہ فضا اس کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ڈی ایچ لارنس کے ناول ''لیڈی چیٹر لیز لوورز'' میں مرد اور عورت کے والہانہ جسمانی تجربے کو جس ماہرانہ استعاراتی اور تشبیہی انداز میں پیش کیا گیا ہے یونس جاوید کی کہانیوں میں اس قسم کے موضوعات کے بیانیوں میں ویسی ہی چابکدستی نظر آتی ہے۔ٹیلی پلے یا فلم میں استعمال ہونے والی سمعی اور بصری تکنیکیں ان کے کئی افسانوں میں چوکھے رنگوں کے ساتھ سامنے آئی ہیں۔

ہمارے کئی نقادوں نے ترقی پسند افسانہ نگاروں کے منشوری موضوعات پر بڑی لے دے کی ہے۔لیکن اگر انہیں کہا جائے کہ چارلس ڈکنز کے ناولوں پر موپساں اور چیخوف کے افسانوں میں بھی ایسی ہی حقیقت نگاری سے کام لیا گیا ہے تو شاید پریم چند،کرشن چندر،راجندر سنگھ بیدی اور دیگر کئی ترقی پسند افسانہ نگاروں کو شرف قبولیت مل پائے۔راجندر سنگھ بیدی اور کرشن چندر کے افسانوں میں کئی مقامات پر بیانیے کی تاثیر قاری کو گہرے طور پر متاثر کرتی ہے۔یونس جاوید کے تاثیری بیانیے اتنے عمدہ ہیں کہ ان کو سحر انگیز یا مسحور کن کا نام بھی دیا جا سکتا ہے۔انہوں نے اپنے بیانیے میں جس جادو کو سمو دیا ہے وہ موضوعاتی اعتبار سے سوریئلی یا خوابگوں نہ ہوتے ہوئے بھی اثر خیزی کا جوہر رکھتا ہے۔انجانے قارئین کے لیے ان کی بعض جانی بوجھی کہانیاں غیر حقیقی ہو سکتی ہیں لیکن جوان تجربوں،مشاہدوں یا جذبوں کے بارے میں بالواسطہ یا بلاواسطہ معلومات رکھتے ہیں ان کا نقطہ نظر مختلف ہو سکتا ہے۔یونس جاوید کے تجربوں کے آتشکدے سے برآمد ہوتی متعدد کہانیاں دلکش انداز سے صفحۂ قرطاس کی زینت بنی ہیں۔میر کا انداز اختیار کرنے کے لیے ذوق نے جو زور غزل میں مارا تھا اس سے میر کی مکمل تقلید تو ہو نہ پائی تاہم ذوق کو زور بیان کے متعدد انداز میسر آ گئے۔یونس جاوید نے بھی منٹو اور بیدی سے بہت کچھ مستعار لیا ہے اور وہ بالزاک،فلوبیر،ٹالسٹائی اور دوستوفسکی کی ریالسٹ پیکر تراشی یا اوصاف بیانی سے بھی ناواقف نظر نہیں آتے۔

افسانوی بیانیوں میں جزئیات نگاری کا بڑا عمل دخل ہوتا ہے۔ منظروں کو مؤثر انداز سے منعکس کرنے کے لیے لازمی جزئیات کو اختیار کرنا پڑتا ہے۔بقول مظفر علی سید بعض منظروں میں صرف کسی ریلوے انجن کی آمد کا بیان کافی نہیں ہے اس کے نمبر کا تذکرہ بھی لازمی ہے کہ یوں فکشن رائٹر کے مشاہدے کی باریک بینی کو راہ ملتی ہے۔

یونس جاوید نے صورت حال میں مبتلا انسان کو کہیں سماجی کہیں تاریخی اور کہیں نفسیاتی بیانیوں میں منتقل کر کے اگرچہ سماجی تجزیئے یا تاریخ نویسی یا تخیل نفسی کے فرائض سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش نہیں کی تاہم اپنے تاثراتی جائزوں کو گہرائی کے سیاق و سباق میں رکھ کر اپنے توسیعی یا رمزی نقطہ ہائے نظر کی جھلکیاں ضرور دکھائی ہیں۔ان کے بیانیوں پر قاری اگر فی الفور اپنے ردعمل کا اظہار کرے گا تو شاید وہ اسے عمومی معنویت کا سراغ ہی دے پائیں گے لیکن مخصوص عصری حالات کے تناظر میں ان پر غور وخوض،تاثر اور موضوع کی توسیعی معنویت یا اختصاصی سچائی کو منکشف کرنے میں معاون ٹھہر سکتا ہے۔اس سلسلے میں ان کی مندرجہ ذیل کہانیوں کی معنویت پر غور سے قاری گہرے نتائج اخذ کر سکتا ہے۔

یونس جاوید کا افسانہ اعتراف ایسے گھر کی داستان سناتا ہے جو محلے میں ''بڑا گھر'' کے نام سے مشہور ہے۔شومئی قسمت سے یہ گھر بوسیدہ اور خستہ ہو جاتا ہے۔اس گھر کا سربراہ ایک وکیل ہے۔گھر کو جدید اور نیا بنانے کے لیے اس کی بیگم ضمیرہ ہاشمی کئی مرتبہ اس سے لڑتی جھگڑتی بھی ہے۔وکیل صاحب بینک سے قرضہ نکلوا کر عیش کرتے ہیں اور ایک کار خرید لیتے ہیں۔رفتہ رفتہ حاصل کردہ

قرض پر سود اتنا بڑھ جاتا ہے کہ اتارنا مشکل ہو جاتا ہے۔ وکیل صاحب کی بیگم انہیں بہت سمجھاتی ہیں لیکن آخرکار اسے ہار ماننی پڑتی تھی۔ باپ کے رویے سے آہستہ آہستہ اس کی اولاد بھی بدظن ہو جاتی ہے۔ سب مل کر وکیل صاحب کو سمجھاتے ہیں اس کا ان پر بڑا اثر ہوتا ہے۔ وہ کہتے ہیں تم لوگ جو چاہو ہو جائے گا۔ اس گھر کو جیسے بدلنا چاہتے ہو بدل ڈالو مجھے اچھا لگے گا۔ وکیل صاحب کے بچے تعلیم حاصل کرنے باہر چلے جاتے ہیں۔ ماحول کی تبدیلی سے وکیل صاحب کے ذہن میں بھی تبدیلی جنم لیتی ہے۔ وہ اپنی بیگم کو پرانی سمجھنے لگتے ہیں۔ اور سوچتے ہیں جب گھر کی تمام اشیا نئی ہو گئی ہیں تو ان کے درمیان پرانی اور فرسودہ شے ان کی بیوی ہی ہے اور وہ اس گھر میں اجنبی لگ رہی ہے۔ اس لیے اب انہیں نئی شریک حیات بھی تلاش کرنی ہے۔ بیگم نے گھر کو جدید بناتے بناتے شوہر کی سوچ تک بدل ڈالی اور یوں وہ اپنی بیگم کو بے کار شے قرار دے کر چھوڑ دیتے ہیں۔ نئی اور پرانی اقدار کی کشمکش اور اشیا پرست معاشرے میں انسان کو شے کے بطور استعمال کرنے کے حوالے سے یہ ایک عمدہ کہانی ہے۔ اس کے ڈانڈے صارفیت کی خودغرضانہ نفسیات سے ملتے نظر آتے ہیں۔ ''ایک بستی کی کہانی'' نور پور گاؤں کی کہانی نہیں پاکستان کی کہانی ہے۔ یہ گاؤں بدنظمی کا شکار ہے، اس میں گیارہ قتل ہو چکے ہیں۔ (پہلا مارشل لاء گیارہ برس بعد لگایا گیا تھا) ماحول میں انجانی سی کشمکش ہے۔ اس سے نجات حاصل کرنے کے لیے گاؤں والوں نے مل جل کر لڑنے کا فیصلہ کیا ہے۔ وہ گاؤں کے لیے رکھوالا مقرر کرتے ہیں جو بعد میں اسی بندوق سے پوری بستی کو یرغمال بنا لیتا ہے۔ لیکن نظام پر مسلط بے عملی ان کے ارادوں کی راہ میں حائل ہے۔ گاؤں کا ہر انسان دوسرے انسان کو دھوکہ دینے پر کمربستہ ہے۔ ہر فرد نے خود پر مصنوعی خول چڑھایا ہوا ہے اور یوں گاؤں کی آبادی جانکاہ تنہائی کا نشانہ بنی ہے۔ یہ کہانی پاکستانی معاشرے کی عکاس ہے۔ اس کی علامتی معنویت پُرتاثیر ہے۔ یونس جاوید کا افسانہ ''بوجھ'' ایک گھرانے کے گرد گھومتا ہے۔ اس گھرانے کا ہر فرد اپنی اپنی ذات میں گم ہے۔ راحیل نے بی اے کیا ہوا ہے۔ کسی حادثے میں وہ اپاہج ہو جاتا ہے۔ اس کا بڑا بھائی چائے اور مغربی دھنوں کا رسیا ہے۔ بہنوں کا حال یہ تھا کہ کشیدہ کاری کرتیں مگر کشیدہ کاری میں بھی مقابلہ تھا کہ میرا جہیز کم نہ پڑے۔ اپاہج راحیل کو گھر کا بوجھ سمجھا جاتا ہے۔ وہ مجبور ہو کر بھیک مانگنے پر آمادہ ہو جاتا ہے اور گھر والے یہ جاننے کی کوشش بھی نہیں کرتے کہ ان پر اٹھنے والے پیسے کس طرح اور کہاں سے آئے ہیں۔ اس افسانے کا لب لباب عمومی ہے کہ ہمارے معاشرے میں عزت و مقام دولت کو دیا جاتا ہے اور اس کے کمانے کے غیر اخلاقی طریقوں کو نظرانداز کر دیا جاتا ہے۔ سرمایہ پرست ماحول میں اس افسانے کی رمزی حیثیت سے انکار ممکن نہیں۔ ٹیٹنس 81 کے عنوان سے لکھا جانے والا افسانہ بظاہر ایسے شخص کی کہانی کا غماز ہے جو کسی گڑھے میں گر جاتا ہے اور ٹیٹنس کا ٹیکہ لگوانے کے لیے ہر دکان، لیبارٹری، کلینک اور ہسپتال کا رخ کرتا ہے مگر اسے کوئی ایسا ڈاکٹر یا کمپاؤڈر نہیں ملتا جو اسے ٹیٹنس کا انجکشن لگا دے۔ اسے ہر شخص یہ کہہ کر ٹال دیتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب نہیں آئے یا یہ ٹیکہ ایکسپائر ہو چکا ہے۔ اس افسانے کی علامتی معنویت پاکستان کے سیاسی ماحول کے تناظر کا رنگ دکھاتی ہے یعنی ہمارے جمہوری یا غیر جمہوری قائدین یا ان کے پسندیدہ نظام اپنے تمام تر دعوؤں کے باوجود زخم خوردہ آبادیوں کے غموں کا مداوا نہیں کر پائے۔ ''دستک'' سماجی دباؤ کے نتیجے میں پاگل ہو جانے والے پروفیسر کی کہانی جو سردی سے ٹھٹھر کر مر جاتا ہے۔ محلے دار اس کے کفن دفن کا انتظام کرتے ہیں لیکن جب وہ مر رہا ہوتا ہے تو اس کے کفن دفن کے لیے بڑھ چڑھ کر حصہ لینے والا ہر شخص اس کی مدد کرنے سے گریز کرتا ہے۔ اس افسانے میں مادیت پرست معاشرے کی بے رحمیوں کو بے نقاب کیا گیا ہے۔ یہ افسانہ کسی حد تک پریم چند کے افسانے ''کفن'' کے ایک اور تناظر کو سامنے لاتا ہے۔ ''کانچ کا پُل'' کے بنیادی کردار معراج چاچا کو یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ کس ملک کا شہری ہے۔ لیکن اس کے دل میں پاکستان کی محبت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی اور اس محبت کے نتیجے میں ہی اس کو اپنے بڑھاپے میں زور سے پاکستان زندہ باد کا نعرہ لگاتے ہی گولیوں سے چھلنی کر دیا جاتا ہے۔ معراج چاچا مشرقی پاکستان کی بستی کے ہر شخص کی دل کھول کر مدد کرتا تھا۔ اس بستی میں ایک شخص ایسا تھا جس سے معراج چاچا بات کر کے اپنا پن محسوس کرتا تھا لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ چاچا پر اس شخص کی حقیقت کھل جاتی ہے اور وہ نہ صرف حیران ہوتا ہے بلکہ اسے اس سے نفرت ہو جاتی ہے۔ پھر اچانک بستی والے اس کو بستی چھوڑنے کا کہہ دیتے ہیں اور ایک رات وہ لیٹا ہوتا ہے تو لوگوں کا ہجوم دروازے پر دستک دیتا ہے، وہ کہتے ہیں ''بولو پاکستان'' اور چاچا زور سے آواز لگاتا ہے ''زندہ باد'' نعرہ مکمل ہوتے ہی چاچا کو گولیوں سے چھلنی کر دیا جاتا ہے۔ نیا ملک بننے سے ایک ہی خطے کے رہنے والے لوگ ایک دوسرے کے دشمن ہو جاتے ہس۔ اور بنگلہ دیش وجود میں آ جاتا ہے۔ اس موضوع کو یونس جاوید نے اپنے چند دیگر افسانوں خصوصاً ''آوازیں'' میں بھی پیش کیا ہے۔ ''کتا مکھی'' میں یونس جاوید نے اس امر کی جانب توجہ دلائی ہے کہ کچھ عادتیں اور چیزیں یا خواہشیں انسان کو کتا مکھی بن کر چمٹ جاتی ہیں اور ان کا کوئی علاج بھی نہیں ہو سکتا۔ کئی معزز یا خاص افراد اپنی غیر اخلاقی مجبوریوں یا خواہشات پر قابو نہیں پا سکتے اور اوہ ان کے اذہان میں کتا مکھیاں بن کر چمٹ جاتی ہیں۔ اس افسانے کا ہیرو یوسف جوان لڑکا ہے وہ قصر آباد جانے کا متمنی ہے۔ بیگم وقار یوسف اسے اپنے اونچے اور عالی شان محل میں لا بٹھاتی ہیں۔ وہ یوسف کو لالچ دے کر اس کی روح کو اپنا مطیع بناتی ہے اور پھر اسے ناجائز کاموں پر لگا دیتی ہے۔ اس افسانے میں مرد اور عورت کے رشتے کو ایک غیر معمولی تناظر میں دیکھا گیا ہے۔ ''کراسنگ ٹو'' ہمارے مارشل لائی دور کی صعوبتوں اور سنگلاخ راستوں کی ہانپتی ہوئی کہانی ہے۔ جسے ہم محسوس تو کرتے ہے مگر ہمارے محسوسات کو زبان یونس جاوید نے دی ہے۔ انگریزی دور میں کوئی بورڈ اس طرح لکھا ہوتا تھا کہ ''سڑک کے پار یہاں سے جاؤ'' مگر اب بورڈ پر یہ لکھا جاتا ہے کہ ''سڑک یہاں

سے پار کریں'' اس میں آج کے انسان کا ذکر ہے جو سڑک کے پار جانا چاہتا ہے مگر راستہ نہیں ہے۔۔۔ وہ کس طرح ٹرین میں سوار ہو جاتا ہے مگر ٹرین کا انجن خراب ہو جاتا ہے۔ لوگوں نے آس لگا رکھی ہے کہ گاڑی ضرور چلے گی۔ اس افسانے کو مارشل لاؤں کے جبر سے رکے ہوئے انجن کے پس منظر میں اشاراتی سیاق وسباق دیا گیا ہے۔ ''آوازیں'' کے عنوان کے تحت لکھی جانے والی کہانی مشرقی پاکستان کے سقوط کے بعد لکھی گئی۔ ایک فوجی جیک میری نامی لڑکی سے محبت کرتا ہے۔ ''جیک'' جو اس افسانے کا مرکزی کردار ہے اس کا بھائی ''رابنسن'' بھی اس لڑکی کو پسند کرتا ہے۔ مگر ''جیک'' جنگ کے دوران مر جاتا ہے۔ زیرک، جیک کے گھر جاتا ہے۔ مگر اس کی ماں کو اپنے بیٹے کی موت کا بتائے بغیر وہاں سے چلا آتا ہے۔ اس کے بعد ''راجی'' کا کردار سامنے آتا ہے۔ راجی۔۔۔ جو مشرقی پاکستان سے بنگلہ دیش بننے کے دوران دہکائی جانے والی آگ میں جلی اور وردی پوش افراد کے ہاتھوں پامال کی جاتی رہی ہے۔۔۔ ایک الگ داستان کے روپ میں سامنے آکر لرزا دیتی ہے۔ زیرک ایک فوجی ہونے کے باوجود کانپ جاتا ہے اور اس برہنہ اور زخمی لڑکی کو اپنا کوٹ اوڑھا کر گھر چھوڑنے جاتا ہے۔ اس افسانے میں اس حقیقت کو بے نقاب کیا گیا ہے کہ مشرقی پاکستان میں جنگ اور فساد کے دوران کس طرح لوگ لوٹ کھسوٹ اور تشدد کا شکار ہوئے تھے۔ اس سیاق وسباق میں کرنل مجید کو ظلم وستم کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ اس میں میجر عزیز کا ذکر بھی ہے کہ جس کے سامنے اس کے بچوں کو ذبح کیا گیا تھا۔ اس افسانے میں یونس جاوید نے قومی تعصب کے بغیر انسان کے اندر موجود بلا کی درندگی کا مطالعہ کیا ہے۔ یہ افسانہ مشرقی پاکستان میں ہونے والے مظالم کی حقیقتوں کا عکاس ہے۔ اس کا کینوس بھائیوں کے مابین جنگ کے تلخ حقائق کو سمیٹے ہوئے ہے۔ یونس جاوید نے ''جہنم ایک موسم'' میں ناانصافی اور بے حسی کی بنیادوں پر استوار جدید معاشرتی سیٹ اپ کو نشانہ تنقید بنایا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ نئے معاشرتی رویوں کا خاصہ ہے کہ ان میں انسان کی قابلیت یا اُس کی شخصیت کو کوئی اہمیت نہیں ملتی۔ یہاں فرد کی ظاہری آن بان اور اُس کے سٹیٹس کو اہمیت دی جاتی ہے۔ جدید سماج میں ظاہر داریوں اور دکھاوؤں پر توجہ دی جارہی ہے۔ اس افسانے کا کردار منیر نئی ظاہر داریوں کی علامت بنتا دکھائی دیتا ہے۔ یہ کردار جس سماج کی نمائندگی کرتا ہے اس میں دکھاوے کو کسی کی عظمت کی دلیل سمجھا جاتا ہے۔

اپنی کہانی ''اڑان'' میں غریب گھرانے کی اونچی اڑان رکھنے والے افراد کے المیے کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اس میں ایک ایسے غریب اور معمولی پڑھے لکھے لڑکے کی کہانی رقم ہوئی ہے جو اپنی حد سے بہت اونچا اُڑنا چاہتا ہے۔ اس کی پرواز کے لیے اُسے مواقع بھی ملتے ہیں مگر اس میں موجود عمومی انسانی فطرت اسے ایک کے بعد دوسری خواہش کی تکمیل پر اکساتی ہے۔ اس کی کئی خواہشیں خلافِ توقع بھی پوری ہو جاتی ہیں۔ یہ امر اسے حیران بھی کرتا ہے۔ لیکن حد سے اونچا اڑنے کی تمنا میں آخر آخر وہ جان کی بازی بھی ہار جاتا ہے۔

یونس جاوید نے ''دوسرا پہیہ'' میں انسانی فطرت میں موجود دھوکہ دہی کے رویوں کو مخصوص افسانوی تناظر میں رکھ کر دکھانے کی سعی کی ہے اور بتایا ہے کہ ہمارے معاشرے میں بعض ایسی برائیاں بھی ہیں جن کی طرف ہم بخوشی رجوع کرتے ہیں مگر بہت آگے نکل جانے کے بعد واپسی کا راستہ مسدود کر لیتے ہیں۔ اس افسانے کا بنیادی کردار اوباشی کی زندگی گزارتا ہے اور لڑکیوں کو بے وقوف بناتا رہتا ہے۔ مگر جب وہ سچے دل سے محبت کرنے لگتا ہے تو اس کی محبوبہ بھی اس جیسی فلرٹ اور پروفیشنل نکلتی ہے۔

یونس جاوید نے انسانی فطرت میں موجود مثبت اور منفی رجحانات کو کہانیوں کا حصہ بنایا ہے۔ جدید سماج میں آنے والی نئی تبدیلیوں نے معروضی ماحول کے ساتھ ساتھ انسانی فطرت میں بھی پیچیدگیاں پیدا کر دی ہیں۔ ان پیچیدگیوں کے بیان کے لیے افسانوی کائنات میں بھی بہت سی تکنیکی اور اظہاری تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں۔ یونس جاوید ان سے بخوبی آگاہ ہیں اور انہوں نے اپنے تجربوں اور موضوعات کی نسبتوں سے ان سے بہت حد تک استفادہ بھی کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانے اور ڈرامے ملکی سرحدوں سے پار نکل گئے ہیں۔ مثلاً ''ایک بستی کی کہانی'' ہندی اور انگریزی (انڈیا) میں منتقل ہوئی اور رسالہ دھرم یوگ کی زینت بنی، ''اک پنڈ دی موت'' کے عنوان سے ان کا یہ افسانہ گورمکھی میں منتقل ہوا۔ ''دستک'' کا انگریزی ترجمہ ''ماڈرن شارٹ سٹوریز فرام پاکستان'' میں شائع ہوا۔ ''دوسرا پہیہ'' کا انگریزی ترجمہ پاکستان ٹائمز میں چھپا۔ یونس جاوید کی ایک اور کہانی ''اُس رات کا درد'' انگریزی اور جرمن میں ترجمہ کی جا چکی ہے۔ ''دس نمبریا'' گورمکھی میں چھپی۔ علاوہ ازیں ترکی میں بھی ان کے چار افسانے ترجمہ ہو چکے ہیں۔ ان کے کئی ڈرامے بھی پاکستان کی سرحدوں سے باہر نکل کر قارئین اور ناظرین سے داد وصول کر چکے ہیں۔ مثلاً ''رگوں میں اندھیرا'' جاپانی میں ترجمہ ہو کر ٹیلی کاسٹ ہوا۔ ''کانچ کا پُل'' کے نام سے لکھا جانے والا ان کا ڈرامہ چینی میں منتقل ہوا اور بیجنگ یونیورسٹی میں اسے دکھایا اور پڑھایا جاتا ہے۔ یہی ڈرامہ پونا اکیڈمی میں بھی دکھایا گیا۔ ''اندھیرا اجالا'' کے چھ ڈرامے چین کے لیے منگوائے گئے تھے۔ علاوہ ازیں یونس جاوید کی چند کہانیوں کے منتخب انگریزی تراجم اکیڈمی آف لیٹرز کے جریدے نے بھی شائع کیے ہیں۔

افسانہ نگار کے لیے انسانی سماج سے متعلقہ کوئی بھی موضوع شجر ممنوعہ نہیں ہوتا۔ یونس جاوید نے نہ صرف اپنے اردگرد موجود افراد کے اعمال میں جھانک کر افسانہ تلاشی کی ہے بلکہ کئی قومی اور بین الاقوامی موضوعات کو بھی کہانیوں کے سانچوں میں ڈھالا ہے۔ انہوں نے اپنی تخلیقات کا مرکز انسان کو ٹھہرا رکھا ہے۔ ان گنت موضوعات پر لکھنے کے باوجود ان کی افسانہ نگاری کی آنچ دھیمی نہیں ہوئی۔ شاید اس لیے کہ ان کے اندر، بحران اور کشمکش کو برداشت کرنے کا حوصلہ ہے۔ ان کا دماغ رنگا رنگ تجربوں کے تاثرات کو سمیٹے ہوئے ہے۔ وہ بجائے خود ایک محشر خیال ہے۔ ان کی تنہائیاں ان کے لیے انجمن کا کام کرتی

ہیں۔انہوں نے مستقل اور متواتر غور وفکر کو اپنا شیوہ بنا کر انسانی احتساب سے کامل شغف رکھا ہے۔ان کی انسانی اخلاقیات کسی بھی سطح پر ہونے والے غیر انسانی رویوں کا محاسبہ کرنے پر آمادہ رہتی ہے۔اگر کسی افسانہ نگار میں مردم شناسی کا جوہر نہیں ہے تو وہ اچھا افسانہ نگار بننے سے قاصر رہتا ہے۔ادب میں حقیقت کے استعمال کے زمرے میں محمد حسن عسکری نے کہا تھا''آرٹسٹ کے لیے تو حقیقت چھپر ہے نہ محل نہ کیمونسٹ اعلان نامہ، اس کے لیے تو حقیقت ایک احساس ہے، ایک سنسنی ہے، ایک سر مستی، ایک ہسٹریا یا بقول شیکسپیئر (Frenzy) ہے،شیکسپیئر نے جس ابال،مظاہرے، جذبے یا شعور کے بگٹٹ ہونے کی بات کی ہے وہ افسانہ نگاروں یا ڈرامہ نگاروں کی تکنیکوں اور فنی دائروں میں زندگی کا خون دوڑانے کا کام کرتا ہے۔یونس جاوید کا ابال کسی منشور کے تابع ہو کر چھپروں یا محلوں کی نقشہ کشی کے لیے نہیں ہے۔ان کے اندر موجود احساس کی بوقلموں لہریں ان کی داخلی چیخوں کو قارئین کے سامنے لانے کے لیے ہمہ وقت بے تاب رہتی ہیں۔ان کا ابال عامیانہ یا سطحی نہیں ہوتا۔وہ نازک سے نازک بیانیوں میں بھی ابتذال اور سوقیانہ پن سے مکمل طور پر بچے رہتے ہیں۔

بیانیہ کی آفاقی حیثیت مسلمہ ہے۔ارسطو نے پلاٹ کی اہمیت پر اس لیے زور دیا تھا کہ یہ بیانیے کو مخصوص حدود و قیود کا پابند کرتا ہے۔فکشن رائٹر اپنی تخلیقات میں جن نفسیاتی اور سماجی حوالوں یا آوازوں کو منعکس کرتا ہے۔قارئین ان میں اپنے تجربات و مشاہدات کی گونج سنتے ہیں۔آج جس بڑے پیمانے پر افسانوی ادب تخلیق ہو رہا ہے اس سے یہ باور کرنا کچھ زیادہ مشکل نہیں کہ کہانیاں قارئین کی ضرورت بن گئی ہیں یا بنا دی گئی ہیں۔علاوہ ازیں گنے چنے موضوعات کی از سر نو پیش کش فلموں کا بھی حصہ ہے اور افسانوی ادب کا بھی، لیکن قارئین اور ناظرین کے ذوق وشوق میں کوئی کمی واقع ہوتے نہیں دیکھی گئی۔کیا قارئین یا ناظرین ان کے ذریعے اپنی دبی ہوئی خواہشوں کو پورا کرتے ہیں یا جگ بیتی کو کسی نہ کسی سطح پر آپ بیتی کا حصہ بنا کر دیکھتے ہیں۔معاملہ جو بھی ہو لیکن بیانیوں میں آغاز، عروج اور اختتام کی مناسب حدود انہیں ایک گونہ اطمینان و مسرت بھی عطا کرتی ہیں۔

یونس جاوید کی کہانیوں میں موضوعاتی ارتکاز کا وصف موجود ہے۔وہ اپنے افسانوں کو حشو زواید سے مملو نہیں ہونے دیتے۔یعنی کہانی لکھتے ہوئے دفتر کے دفتر لکھنے کی خواہش ان کے نظریہ فن کا حصہ نہیں ہے ان کے بیانیے ان کے گرد بسی دنیا کے نفسیاتی اور سماجی حوالوں کو اپنے اندر سمیٹ کر قارئین کے دماغوں میں کرائسس کو جنم دیتے ہیں۔آج کے افسانے رحم وخوف پیدا تو کرتے ہیں لیکن ان کے وسیلے سے قارئین کا کتھارسس کرنے کا باعث نہیں بنتے۔شاید اس لیے کہ آج کی کہانیاں عمومی انسانوں کی کہانیاں ہیں اور قارئین بھی اسی عمومی سماج کا حصہ ہوتے ہیں اور اسی قسم کی کہانیوں کا سامنا کر رہے ہوتے ہیں۔

جے ہیلیز ملر (J. Hullis Miller) کا خیال ہے دنیا کو عقلی معانی دینے کے لیے ہمیں بیانیوں کی ضرورت ہے۔اس عقل کی صورت عقل کی بنیادی ترسیل ہے۔ہمیں بار بار ایک سی کہانیوں کی ضرورت پڑتی ہے تا کہ ہم اپنے کلچر کی بنیادی آئیڈیالوجی کو طاقتور طریقے سے بیان کر سکیں۔ملر یہ بھی کہتا ہے کہ یہ کہانیاں کبھی مطمئن نہیں بھی کرتیں۔ یوں وہ پال ڈی مان کے نظریہ متن کی توجیحات کی جانب آ جاتا ہے۔مان کے خیال میں''تمام متون کا پیراڈائم ایک صورت (یا صورتوں کے نظام) پر ہے اور اس کی رد تشکیل پر مشتمل۔لیکن چونکہ یہ ماڈل اپنی آخری قرأت میں بھی اختتام پذیر نہیں ہوتا یہ اپنی جگہ ایک ذیلی شکل سپر پوزیشن کو سامنے لاتا ہے جو قبل ازیں متن کی قرأت نہ کیے جا سکنے کا بیان کرتی ہے۔زبان، شعر وادب کی تخلیق کا بنیادی مسئلہ ہے۔اس کے مسحور کن استعمال سے بڑے ادب کے امکانات روشن ہوتے ہیں۔شعری ونثری اصناف کے ہیئتی تقاضوں کی بدولت زبان کے تیوروں میں تبدیلیاں رونما ہوتی رہتی ہیں۔لفظوں کے ذریعے جزوی یا کلی تمثال سازی ممکن ہوتی ہے۔شاعر اور ادیب اپنے داخلی اور خارجی تجربات، مشاہدات اور مکاشفات کو پیش کرنے کے لیے زبان کو تخلیقی سطح پر استعمال کرتے ہیں۔ہر شعری ہیئت اور ادبی صنف، اظہار کے مخصوص پیرایوں کو بروئے کار لاتی ہے۔قدیم وجدید طرز کی نظموں میں شاعرانہ بیانیوں کے جلوے دیدنی ہیں ۔نثری اصناف میں بیان کے مختلف النوع وسائل تاثیر پیدا کرتے ہیں۔داستانوں کی تصویر کشی سے لے کر ناولوں کی عکس بندی تک جو کچھ بھی کیا گیا ہے زبان ہی کے ذریعے ممکن ہوا ہے۔نئے دور میں ملٹی میڈیا تکنیکوں نے اظہار و بیان کے نئے امکانات کی نشاندہی کی ہے۔آج کے شاعر اور کہانی نویس آج تک سامنے آنے والے اظہار کے مختلف النوع سانچوں سے پورے طور پر واقف ہونے کی وجہ سے اپنے اظہار و بیان میں نئی جامعیت لانے کے لیے کوشاں ہیں۔ کیمروں خصوصاً موری کیمروں نے منظر بندیوں کو اوج کمال تک پہنچا دیا ہے۔ اداکاروں کی اداکارانہ مہارت کی عکس بندی اس سطح پر جا پہنچی ہے کہ فلم اور ٹی وی ڈرامے دیکھنے والے ناظرین نقل کو اصل سمجھ کر اپنے ردعمل کا اظہار کرتے ہیں۔نیا ناظر امیجز کے تواتر میں بہتا چلا جاتا ہے۔افسانہ، حقیقت لگنے لگتا ہے۔سامنے سکرین پر کوئی معروضی خواب روشن ہوتا ہے۔وہ جاگ رہے ہوتے ہیں مگر ان پر ایک خواب جیسی حالت طاری ہوتی ہے۔ملٹی میڈیا سائیکی کے اسیر ناظر اور کہانی کار اظہار و بیان کے گونا گوں رنگوں اور زاویوں سے بھرپور استفادہ کر رہے ہیں۔

یونس جاوید نے ریڈیائی ڈراموں سے لے کر ٹی وی ڈراموں تک بہت کچھ قلمبند کیا ہے اور''تیز ہوا کا شور''، ''آوازیں''، ''میں ایک زندہ عورت ہوں'' اور ''ربا سچیا ربّ قدیر'' تک افسانوں کے کئی مجموعے تخلیق کیے ہیں۔ان افسانوں میں انہوں نے قدیم وجدید اور سمعی اور بصری افسانوں تکنیکوں سے مکمل رابطہ رکھا ہے۔

پیرس یونیورسٹی کے پروفیسر گلیز ڈیلیوز (Gilles Deleuze) نے سینما میں امیج اور دیگر کئی تکنیکوں کے استعمال پر کئی کتابیں رقم کی ہیں۔وہ مابعد ساختیاتی فلسفے کی نمایاں شخصیتوں میں سے تھے۔ ان کی کتاب سینما ون

(Cinema I) کونظریہ فلم یافلم تھیوری میں ایک انقلابی کام سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے روبرٹو آلٹمان (Altman)، انگمار برگ مین، رابرٹ بریسوں، لوئیس سرجئی، ایسنس ٹین (Eisenstein)، جان فورڈ، ڈی ڈبلیو گرفتھ، ہاورڈ ہاکس، الفرڈ ہچکوک، فرٹز لینگ جیسے فلم سازوں کی تکنیکوں کے پس منظر میں اپنی فلم تھیوری پیش کی ہے۔ اس میں جن اصطلاحوں کا استعمال کیا گیا ہے۔ ان سے ہمارے فکشن نگار ناواقف نہیں ہیں۔ حرکت (روانی)، آنات، حرکت اور تبدیلی، موبیلٹی، مونتاج، اتحاد یا یونٹی، تمثالوں کا غیر حقیقی تسلسل، وقت کا بالواسطہ تصور، جاندار کمپوزیشن، اظہاریت، معدومیت، متحرک اور منجمد، جدلیاتی کمپوزیشن، قدرتی جست، معروضی کمپوزیشن، اظہاریت اور Dynamin سلائم، حرکت اور اس کے تنوعات، تاثر سے عمل تک، حسی تمثال، ادراکی تمثال اور داخلی اور خارجی انتہا وغیرہ کو زیر بحث لاکر ڈیلیوز نے سینما یا فلم کی دنیا میں برپا ہونے والے انقلاب کی نشاندہی کی ہے۔ ہمارے فکشن لکھنے والے مذکورہ تصورات اور تکنیکوں سے نابلد نہیں ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ فلم میں ڈائریکٹر کیمرہ تکنیکوں کو استعمال میں لاکر اداکاروں اور منظروں کے امیج کے وسیلے سے کسی کمپوزیشن کو تکمیل آشنا کرتا ہے۔ فکشن رائٹر زبان کے ذریعے تصور کشیاں کرتے ہیں۔ ان کے بیانیے، بصری و سمعی کوائف پر محیط ہوتے ہیں۔ فلم میں سفید سکرین پر سب کچھ دکھایا جاتا ہے۔ قلمی نریشن میں قارئین کے ذہنوں پر نقوش مرتسم کیے جاتے ہیں۔ داستانیں، ناول، افسانے اور ڈرامے پڑھ کر قارئین حسب استطاعت ردِ اعمال میں مبتلا ہوتے ہیں۔ لفظوں کے وسیلے سے حرکتوں، لمحوں، روانیوں، تبدیلیوں، اترتی چڑھتی کیفیتوں، مختلف النوع تمثالوں، مکمل وحدتوں، متنوع سلسلوں، زمان و مکاں کے دائروں کو جاندار کمپوزیشنوں میں ڈھالنا آسان کام نہیں ہے۔ اس کے لیے زبان پر عبور ہونا ناگزیر ہے۔

فکشن رائٹرز اپنے ہر تجربے اور مشاہدے کو قلمبند نہیں کرتے ان میں سے انتخاب کرتے ہیں۔ کچھ تجربے اور مشاہدے معدوم ہو جاتے ہیں اور کچھ وجود پا لیتے ہیں۔ وہ کہیں متحرک اور کہیں منجمد امیج کو کام میں لاتے ہیں۔ ان کی تخلیقات میں جدلیاتی عمل، وحدت تاثر پیدا کرتا ہے۔ یوں وہ قدرتی جست لگاتے ہیں۔ ان کی معروضی کمپوزیشنیں ان کے اظہاری رویوں کے نتیجے میں شکل پذیر ہوتی ہیں۔ اعلیٰ اظہار پر مشتمل بیانیے ارتقائی حرکت کے حامل ہوتے ہیں۔ ان میں آفاقی حرکتیں منعکس دکھائی دیتی ہیں۔ فکشن نگار اپنے تاثرات کو مکمل عمل کا حصہ بناتا ہے۔ اس کی تخلیق کردہ حسی اور ادراکی تمثالیں کرداروں کے داخلی اور خارجی زاویوں کی وصف نگاری میں بروئے کار آتی ہیں۔

یونس جاوید نے اپنے طاقتور بیانیوں کی مدد سے اپنے اردگرد کے منتخبہ ماحول کی اسرار کشائی کی ہے۔ ان کی ذہنی بازیافت کا عمل ان کی تخلیقی توضیحات سے زندہ اور متحرک ہوا ہے۔ انہوں نے اپنے گونگے مشاہدات و تجربات کو مختلف اظہاری تکنیکوں کی مدد سے زبان دی ہے۔ افسانہ نگار، تاریخ نویسی نہیں کرتا۔ اس کا تعلق داستان گوئی سے بھی نہیں ہے۔ وہ کسی واقعے، تاثر یا موضوع کو متکلم، واحد متکلم اور معروضی مبصر کے ذریعے بیان کرنے کا کشٹ اٹھاتا ہے۔ یونس جاوید نے اپنی کہانیوں میں کرداروں کو متحرک اور جاندار بنانے کا کام کیا ہے۔ کسی کردار کی زبانی کہانی کا بیان اس کی داخلی کشمکش کے سلسلوں کا وسیلہ ہے۔ کئی افسانوں میں کرداروں کے داخلی اور وجودی معاملوں کو پیش کرنے کے لیے خط، روزنامچے اور یادداشتوں کی تکنیکوں سے کام لیا جاتا ہے۔

یونس جاوید نے ان کے کوائف کو ذاتی بیان، مکالمے اور تصویر کشی کے سلسلوں میں منتقل کیا ہے۔ انہوں نے کئی افسانوں میں متکلم، واحد متکلم، واحد غائب کے ذریعے اپنا نقطہ نظر پیش کیا ہے۔ میتھیو آرنلڈ نے شاعر اور ادیب کی ذات کے اپنے موضوع سے لاتعلق رہنے کی جو بات کی ہے یا ٹی ایس ایلیٹ نے ادب میں نفی ذات کا جو قصہ چھیڑا ہے، وہ معروضیت کے حصول کے لیے جتنا بھی لازمی کیوں نہ ہو لکھنے والے کا موضوع تلاش کے ضمن میں حق انتخاب، اس کی نفسیات، اخلاقیات، نقطہ نظر اور سماجی رجحانات اس کے ذات کے اثرات سے معین ہوتے ہیں۔

یونس جاوید نے اپنے افسانوی مجموعے ''میں ایک زندہ عورت ہوں'' کے افسانوں میں جدید صنعتی معاشرے کے کاروباری اور اخلاقی منظر نامے کو عورتوں کے مختلف النوع کرداروں کے وسیلے سے صفحۂ قرطاس پر منتقل کیا ہے۔ انہوں نے نئے معاشرے میں موجود عورت اور اس کی نفسیاتی کیفیات کو اس کی مجبوریوں اور ناآسودگیوں کے پس منظر میں اجاگر کیا ہے۔ کوئی فرد اپنی خواہشوں کی تکمیل کے لیے کچھ کر سکتا ہے اس کا جائزہ لیتے ہوئے افسانہ نگار نے مردحاکمیت کے سماج میں مرد اور عورت کی جنس سے وابستگی کی حقیقی صورت حال کا نقش مہیا کیا ہے۔ مرد اور عورت دونوں کو بسا اوقات غلط نگاہوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے، منزل کی تلاش میں بھٹکنے اور دلدل میں داخل ہونے کے عمل سے گزرنا ہوتا ہے۔

اس مجموعے میں یہ بھی دکھایا گیا ہے کہ عورتوں اور مردوں کے مختلف اعمال پر معاشرتی ردعمل کیا ہوتا ہے؟ دولت اور طبقاتی کشمکش کے شکار افراد کی نفسیات کیا ہوا کرتی ہے؟ اس تناظر میں عورت میں ابھرنے والا ردعمل کن کیفیتوں اور صورتوں کو سامنے لاتا ہے؟ یونس جاوید نے اس حوالے سے کوئی بھی مناسب تفصیل ہاتھ سے جانے نہیں دی۔ ''میں ایک زندہ عورت ہوں'' میں مرد کی استحصالی، ظالمانہ اور منفی روش اور اس حوالے سے عورت کی کردار کشی کو موضوع بنانے کے ساتھ ساتھ انہوں نے عورت کی جائز و ناجائز حرکتوں اور اخلاقی پامالی کو بھی منصفانہ نظر سے دیکھا ہے۔ صنعتی اور مادی ریلے، ریس میں مبتلا طماع معاشرے میں انسانیت کی بربادی، سماجی تضادات کی بے رحمی، تعلقات کی متنوع کاروباری صورتیں، فطری جذبات کا والہانہ پن اور اختیارات کا غلط استعمال جیسے متعدد معاملات کو یونس جاوید نے خارجی، ذاتی، داخلی، نفسیاتی، سماجی اور معاشرتی پس منظر میں پرکھنے کا حقیقت پسندانہ کام کیا ہے۔ جدید شہروں اور قصبوں میں نئے

رنگ میں رنگے انسانوں کے رجحانات اور معاملات کو ان کے اعمال اور ردِ اعمال کے گورکھ دھندوں سمیت پیش کر کے افسانہ نگار نے انکشاف حقیقت کی روایت کو نبھایا ہے۔ یونس جاوید انسانی وجود کی پیچیدہ نیرنگیوں کو اپنے پرتاثیر بیانیوں کی مدد سے ایسی فکری جہتیں مہیا کرتے ہیں کہ قاری ان کی مدد سے اپنے سماج کی ان دیکھی جہتوں تک رسائی حاصل کر سکتا ہے۔ان جہتوں کی غمازی کے لیے افسانہ نگار نے سوسو طرح سے عمر کاٹنے کا جتن کیا ہے۔ان کے انفرادی یا شخصی مطالعے، انسان کی چھینی ہوئی شناخت کی بازیافت کی آواز یا گونج بن جاتے ہیں۔انہوں نے دل دریا سمندروں ڈونگھے کی بالائی سطحوں کو زندہ اور متحرک کرداروں کے ذریعے پیش کیا ہے۔

ہیمنگ وے نے اپنے افسانوی مجموعے مین ود آوٹ ویمن میں اگرچہ کہانیوں کے جال، مرد کرداروں کے گرد بنے ہیں تاہم قدیم و جدید عالمی ادب عورتوں کے تذکروں سے اور عورتوں کے کیے ہوئے تذکروں سے بھرا پڑا ہے۔مرد کی پسلی سے نکلی حقیقت سے آنکھیں چرانا نہ تو پہلے کبھی ممکن تھا، نہ اب ہے اور نہ آئندہ کبھی رہے گا۔اس حوالے سے عورت دشمن، مرد یا مرد دشمن، عورتیں اپنی انتہاپسندانہ آرا کے نتیجے میں نیم حقیقت کا ادراک تو شاید کر لیں پوری حقیقت تک پہنچنا ان کے لیے ممکن نہیں ہے۔یونس جاوید نے ایک افسانہ نگار کی حیثیت سے ان دونوں رویوں سے کنارہ کشی کو اپنا شعار بنایا ہے۔انہوں نے مرد اور عورت کو انسان ہونے کے ناتے سے دیکھا اور سمجھا ہے۔انہیں اپنے وجود کی گہرائیوں میں مرد کے حاکمانہ رویوں کی شورش اور عورت کی حقیقی تمناؤں کا شور بھی سنائی دیا ہے۔انہوں نے دونوں کو ایک ہی شجر کا ثمر جانا ہے۔اس حوالے سے ان کا افسانوی مجموعہ ''میں ایک زندہ عورت ہوں'' ان کے رنگارنگ تجربوں، مشاہدوں اور سوچوں کا امین ہے۔اس میں شامل چودہ افسانوں کے موضوعاتی دائرے بھی الگ الگ حیثیت رکھتے ہیں۔''میں ایک زندہ عورت ہوں'' ناری کتھا، بندگلی تین حصوں پر مشتمل افسانہ ہے۔

''بندگلی'' میں فریدہ کھل کھیلتی اور فلرٹ کرتی نظر آتی ہے جس کے پس منظر میں موجود یہ نفسیاتی وجہ بھی ہے کہ وہ چاہے جانے کا حق معاشرے اور خصوصاً مرد سے مانگتی ہے جو اسے نہیں ملتا لہٰذا عورت کے حوالے سے المیاتی، بے چارگی، مایوسی، ناامیدی مظلومیت کے میلانات ظاہر ہوتے ہیں۔ان کے افسانے ''لیکن'' میں مردوں کی مظلومیت اور ظلم کے حوالے سے عورتوں کی مجبوریوں کا کھلا بیان ہے۔فرد اپنی خواہشوں کی تکمیل کے لیے اچھے کو بُرا اور بُرے کو اچھا کہنے کے لیے نفسیاتی توجیہات سے کام لیتا ہے۔فرد کا ربط معاشرے سے ہے۔اس افسانے میں یونس جاوید نے فرد میں سماج اور سماج میں فرد کے رویوں کی عکاسی کی ہے۔

اسی طرح افسانہ نگار اپنے نظریات اور معاشرتی تضادات کا ایک اور انداز ''صرف ایک دن'' میں دکھلاتے ہوئے میاں بیوی کے کرداروں یعنی شادی شدہ زندگی کے حوالے سے بیان کرتے ہوئے ان دونوں کے مثبت و تعمیری رویوں پر روشنی ڈالتے ہوئے یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اگر یہ دونوں آپس میں تعاون، اتفاق اور چھوٹی چھوٹی باتوں پر انڈرسٹینڈنگ رکھیں تو گھر کی فضا بھی سازگار رہتی ہے اور خاص کر بچوں اور مستقبل کے حوالے سے خوشگوار نتائج حاصل ہوتے ہیں۔

''پسِ دیوارِ زنداں'' میں ایک ماں اور بیوی کے روپ میں موجود عورت کے اپنے آپ کو پھوپھی کہنے والے لڑکے سے استوار شدہ غلط رشتے کو بیان کرتے ہوئے مراسم کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے انسانی حق یا فطرتی تقاضوں پر مبنی رویوں کا بتاتے ہیں جبکہ ''رسائی نارسائی'' میں بیوہ عورت کے حقوق کا بظاہر خیال کرنے والے مرد اور در پردہ اپنا مطلب نکالنے والوں کی نفسیات اور عورت کا اعتبار اٹھ جانے کی کیفیات کا بھرپور اظہار کیا گیا ہے۔''سبز آنکھوں والی لڑکی'' میں پیسے کو ہی مسبب الاسباب بتایا گیا ہے اور سماجی تعلقات کی نوعیت اور شادی بیاہ کے معاملات کے معاشرتی پہلوؤں کے حوالے سے ذکر کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ ایک لڑکا اپاہج اور عمر رسیدہ لڑکی سے پیسے کے بدلے شادی کی شرط پر خاموش ہوتے ہوئے افسانے کے انجام کو نا تمام چھوڑ جاتا ہے۔''سوا نیزے پہ سورج'' میں پیسے یا دولت کی حرص یا مجبوری کی خاطر باہر جانے والا نوجوان اور واپسی کی منتظر بیوی اور بچی اور بعد ازاں اس کا دہشت گردی کا شکار ہو جانا جیسے قیامت آمیز مناظر اور ملکی صورت حال کا المیہ بیان کیا گیا ہے اور ''عزت نفس کے لیے'' میں، یونس جاوید پیسے اور دولت کے حوالے سے عورت کے دانا بننے کے المیے کو واضح کرتے ہوئے معاشرے کی ایک اور گھناؤنے عمل کی کارستانیاں بتاتے ہوئے حقیقت بھی آشکار کرتے ہیں کہ معاشرے میں کسی کے پاس وسائل کی کمی ہے اور کسی کے پاس بہتات۔نتیجتاً تضاد ابھرتے ہیں جن کا نشانہ عورت ہی بنتی ہے۔اسی طرح ''غریبان شہر'' میں مرد اور عورت اپنے فرائض کے دائروں میں گردش کر رہے ہیں مگر ایک دوسرے کو جو محبت دینی چاہیے وہ نہیں دے رہے۔چنانچہ افسانہ نگار اختصار کی بجائے نہایت پھیلاؤ سے اس موضوع کو بیان کرتے ہوئے اپنے ذاتی، جذباتی، رومانوی جذبات کو بھی متعارف کرواتے ہیں ''مکمل ہونے تک'' میں یونس جاوید راشدہ کے حوالے سے محبت کی حصولی پر، خیالات کی تبدیلی اور ٹیکسی ڈرائیور کی صورت میں موزوں مرد کی تلاش میں پیشے کی طرف راغب ہو جاتی ہے اور معاشرے سے ناآسودگی حاصل ہونے کی وجہ سے نہ صرف اسی کا حصہ بن جاتی ہے بلکہ دربدر کی ٹھوکریں اس کا مقدر بننے لگتی ہیں جبکہ اسی افسانے میں ایک لڑکی انیلا سچے عاشق کی تلاش میں ہے جو راشدہ کو ملا تھا مگر اس نے قدر نہ کی یا نا سمجھی سے کام لیا جبکہ دوسری طرف ایک اور عورت اسی امر کی تلاش میں پھر رہی ہے چنانچہ عورتوں کی نفسیات میں موجود تضادات اور معاشرتی رویوں ہی کے ایک پیکر کو افسانہ نگار نے اپنے افسانے کے ذریعے بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔''میں محبت کرتا ہوں'' میں محبت کرنے کی سزاؤں کو مختلف مظاہر کے حوالے سے بیان کرتے ہوئے مرد کی مظلومیت کو پیش کیا گیا ہے اور ''میں

ہوں شکست کی آواز'' میں یہی عورت مرد کا باقاعدہ استحصال کرتی نظر آتی ہے اور اسے انہیں چکنی چپڑی باتوں سے بہلاتے اور پھسلاتے ہوئے اپنا اصل چہرہ دکھاتی ہے۔ چنانچہ ان حوالوں سے افسانہ نگار کا یہ مقصد اور نقطہ نظر سامنے آتا ہے کہ معاشرے میں عورت کو محض ایک جسمانی و بدنی تصور کے حوالے سے دیکھتے ہوئے اس کی دیگر صلاحیتوں کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے اور نتیجتاً اس کے منفی اثرات معاشرے پر ثبت ہوتے ہیں۔ جو معاشرتی رویوں کو صحت مندانہ رجحانات کی بجائے پستی اور ابتذال کی طرف گھسیٹ کر لے جاتے ہیں۔ نیز ناری کتھا کا بنیادی کردار فریدہ شاہ کا ہے جو پہلے ایک مرد کے استحصال کا نشانہ بنتی ہے اور بعد ازاں بدلے کی نیت سے وہ دوسرے مردوں کو شکار کرتی ہے اور اپنے اس عمل میں وہ اس قدر شدت پسندانہ رویہ اختیار کر جاتی ہے کہ خود سے سچی محبت کرنے والوں کو بھی نہیں بخشتی۔ جبکہ دوسرے افسانے ''نامہرباں لمحہ'' میں افلاطونی محبت ایک عورت کے ساتھ اور جنسی آسودگی دوسری عورت سے حاصل کرنے والے مرد اور عورت کی توقعات اور امیدوں کا خاکہ بیان کیا گیا ہے کہ ہر لمحہ نامہرباں ہی نظر آتا ہے۔ ''آنکھوں کو اب نہ ڈھانپ'' میں اولاد کی محرومی سے ہوتے ہوئے جانوروں سے محبت اور کراچی میں دہشت گردی کے حوالے سے افسانہ نگار معاشرتی المیوں کو مختلف نقطہ نظر سے بیان کرتے ہیں Who is She ایک لڑکی کے پیسے کی حرص اور ہر حد پار کرنے اور دلدل میں اترنے کے عام سے واقعہ کو گہرائی سے بیان کیا گیا ہے۔

اردو افسانہ نگاروں کے یہاں رپورٹ نویسی، حقیقت نگاری، سماجی سکریننگ، حکمت فروشی، واقعاتی عبرت سرائی، ازمنہ ثلاثی کی تقسیم بندی، روایتی اخلاقی قدر افزائی، حیرت آسائی، شخصی اور اجتماعی ابنارملٹی کی تصویر کشی، نشتر زنی، کیفیتی منظری، حالتی کرداری مرقع کشی، علامتی، سادہ بیانی، رمزی، ایمائی، استعاراتی، کنایاتی طنزی، ظرافتی تراشیت عود عود کر آتی رہی۔ کسی نقاد نے افسانہ نگار کو ساحر، جوگی یا جادوگر قرار دیا۔ کسی نے اس کے افسانوں کی جاذبیت پر سرسری نظر ڈالی، کوئی کہہ اٹھا وہ ایک مصور اور مجسمہ ساز ہے۔ کسی کو مرتبہ شناسی کی علت نے آن گھیرا، یعنی عام افسانہ نگار بھی کھرے اور بڑے نظر آنے لگے۔ کوئی لکھنے لگا ''فلاں کی یادداشت غیر معمولی اور ذہن بے حد ادراکی ہے۔'' ہمارے نقاد نے جس بھی افسانہ نگار کو لیا کہہ دیا کہ اس نے ''مقدار اور معیار ہر دو اعتبار سے اردو افسانے کو باوقار اور شاندار بنا دیا ہے۔''، ''وہ غایت درجہ حساس فنکار ہے، انسانی جذبوں اور احساسات کی جن جہتوں تک اس کی رسائی ہے، ہمیں تو کسی دوسرے افسانہ نگار کے ہاں دکھائی نہیں دی۔''

مگر یونس جاوید نے سماج کی معروضی حقیقتوں کو کردار کی صورت حال کا حصہ بنا کر پیش کیا ہے۔ اس سیاق و سباق میں ان کے افسانے کئی سطحوں پر معنوی پھیلاؤ کے حامل ہو جاتے ہیں۔

یونس جاوید کے افسانے ''یہی عورت ہے''، ''عورت بھی کیا شے ہے''، ''ربا سچیا ربّ قدیر''، ''محبت اس کو کہتے ہیں'' اور ''زوال'' میں بطور خاص جن حقائق کو پیش کیا گیا ہے اس سے قاری جمالیات کی نئی جہات سے آشنا ہو کر آسودہ اور باخبر ہو جاتا ہے۔

جدید تھیوری پرست نقادان پر اپنی اپنی تھیوری کا عکس ڈال کر کچھ بھی کہیں۔ یونس جاوید، خود نقاد ہونے کی نسبت سے اس حقیقت سے مکمل آگاہی رکھتے ہیں۔ انہوں نے انسانی سرشت کو جس دردمندی سے دیکھا اور لکھا ہے جس طرح وہ اپنے کرداروں کے باطن میں اتر کر جھانکتے ہیں۔۔۔ جس نگاہ سے انسانی دکھوں اور روحانی صعوبتوں میں گھرے، وہ محکوم لوگوں کے ساتھ ہیں۔ خصوصاً آج کی تنہا، ستم رسیدہ مگر بے بسی کی فضا سے باہر نکلتی ہوئی عورت کے لیے جتنا درد یونس جاوید کے دل میں دھڑکتا ہے، کہا جا سکتا ہے کہ وہ ہر مظلوم اور ہر تنہا اور بے بس کردار کے محسوسات کو زبان دینے میں کامیاب ٹھہرے ہیں۔۔۔

یہی بات ان کو دیگر کہانی کاروں سے ممیّز کرتی ہے۔۔۔

تابناک

آپ کا خط مل گیا ہے۔ خط کی ہر سطر سے جو خوشبوئیں اُڑ کر دل کے دروازے پر دستک دے رہی ہیں وہ دل کے اندر پھیل گئی ہیں۔ اُس زمانے میں آپ اچھے خاصے خوشخط تھے مگر اب میں نے خط پڑھا تو احساس ہوا کہ وہ خوشخطی کا ایک دور تھا اب یونس جاوید میری طرح بد خط ہو گئے ہیں۔ میں ادبِ لطیف کے زمانہ ادارت میں کوئی امتیازی خوبی نہیں رکھتا تھا مگر پہچان کی نظر سے ضرور بہرہ مند تھا۔ میں نے محسوس کر لیا تھا کہ یہ یونس جاوید جو ''دیوارِ برلن'' کا مصنف ہے اور جس نے ایک افسانے میں پانی کو بغاوت کا سمبل بنایا ہے۔ چپکے چپکے ایک ایسی دیوار بھی تعمیر کر رہا ہے جو بلند سے بلند ہوتی جائے گی۔ یہ اس کے فن کی دیوار تھی۔ کیا آج ٹی وی ڈرامے نے جو مسلسل مراحل طے کیے ہیں اس عمل میں یونس جاوید کا بہت نمایاں حصہ نہیں ہے۔

ٹیلی ویژن ڈرامے کی تاریخ یونس جاوید کے نام کے بغیر مکمل ہو ہی نہیں ہو سکتی۔ مجھے اپنے عزیز دیرینہ پر فخر ہے جس نے مجھے ہمیشہ محبت سے نوازا ہے۔ یونس جاوید میرے دل کی گہرائیوں میں زندہ و تابناک نام بن چکا ہے اور ہمیشہ بنا رہے گا۔

میرزا ادیب

کنجری کا پل اور یونس جاوید

ڈاکٹر سلیم اختر
(لاہور)

''**مجھے** ہر روز کہانی کی جستجو رہتی ہے۔ میں آج بھی کہانی کی تلاش میں یہاں تک آ گیا ہوں۔''

یونس جاوید نے ناول ''کنجری کا پُل'' کا جن الفاظ سے آغاز کیا ایک طرح سے وہ اس کا فنی آدرش قرار پاتا ہے۔

آج ماضی پر نگاہِ بازگشت ڈالنے پر احساس ہوتا ہے کہ یونس جاوید میرے قدیم ترین ادبی دوستوں میں ہے۔ گذشتہ صدی کی چھٹی دہائی میں ہم دونوں ادب میں نووارد تھے اور ''ادب لطیف'' کے دفتر میں میرزا ادیب کی زلفِ گرہ گیر کے اسیر، حق تو یہ ہے کہ اس وقت تک خود بھی یہ علم نہ تھا کہ ہمیں کیا کرنا ہے۔ بس لکھنے کی تمنا تھی۔

یونس جاوید نے فکشن اور ڈراما میں نام کمایا اور افسانوں کے متعدد مجموعوں نے اسے معاصر افسانہ نگاروں میں معتبر بنا دیا۔۔۔ ان مجموعوں میں ''تیز ہوا کا شور''، ''آوازیں''، ''میں ایک زندہ عورت ہوں'' اور ''ربّا سچیا، ربّ قدیر'' آج بھی ایک مقام رکھتے ہیں جبکہ میں تنقید کے خارزار میں جا نکلا اور عمر خواری میں بسر کی۔

یونس جاوید نے جب ڈراما نگاری کا آغاز کیا تو اس وقت اشفاق احمد، بانو قدسیہ، منو بھائی، انور مقصود، امجد اسلام امجد اور حسینہ معین جیسے ڈراما نگاروں کا راج تھا، مگر یونس جاوید نے ان سب کی موجودگی میں، اپنے پہلے طویل دورانیے کے ڈرامے ''کانچ کا پُل'' سے ہی اپنے لیے مقام بنا لیا۔ پی ٹی وی کی تاریخ میں یہ پہلا طویل دورانیے کا کھیل تھا جس نے ڈراما ۸۱، ڈراما ۸۲، ڈراما ۸۳۔۔۔ سے ڈراما ۸۸ کی بنیاد رکھی۔ اس کے یادگار ڈراموں میں کانچ کا پُل کے علاوہ ''دھوپ دیوار ۸۲۔ ساون روپ ۸۳ وادیِ پرخار ۸۳، پھولوں والا راستہ ۸۳ اور اس کے بعد ''رگوں میں اندھیرا'' کی حیثیت سنگ میل قرار پائی۔ اس کے بعد بھی ''ایک محبت کی کہانی''، ''تکمیل''، ''زادِ راہ''، ''سٹیٹس''، ''صبحِ جمال''، ''عشق سے تیرا وجود''، ''دیارِ عشق'' اور ''عہدِ وفا'' جیسے ڈراموں سے ڈرامے کو سنجیدہ ادب کا حصہ بنا دیا۔ ''کانچ کا پُل'' تو چین میں بیجنگ یونیورسٹی کے نصاب میں ابھی تک شامل ہے یہ معیاری اور مقبول ڈرامے تھے کہ ''اندھیرا اُجالا'' جیسی سیریز بھی لکھی۔ جو آج بھی نہ صرف لوگوں کو یاد ہے بلکہ یونس جاوید کی شناخت بھی ہے۔

فکشن اور ڈراموں کے ساتھ ساتھ اس نے احباب کے خاکے بھی قلم بند کیے۔ متوازن انداز میں۔ یونس جاوید، منٹو کی طرح واشگاف انداز میں شخصیت کا پوسٹ مارٹم نہیں کرتا، خاکہ نگاری میں اس کا اپنا اسلوب خاص ہے حالانکہ افسانہ نگار ہونے کی بنا پر اسے خاکہ کو افسانے میں تبدیل کرنے کی سہولت بھی حاصل ہے۔

یونس جاوید نے اگر ایک طرف احمد بشیر کے منتشر خاکے تلاش کر کے ''جو ملے تھے راستے میں'' کے نام سے خاکوں کا مجموعہ مرتب کیا وہیں اس نے ''کلیات ناسخ'' کی تدوین تین جلدوں میں کر کے اس پر محققانہ مقدمہ بھی قلم بند کی اور پھر ہم جیسے ڈاکٹروں کو دیکھ کر اس نے سوچا کہ ڈاکٹر بننا کیا مشکل ہے۔ چنانچہ حلقۂ اربابِ ذوق پر تحقیقی مقالہ لکھ کر ڈاکٹریٹ کی ڈگری بھی حاصل کر لی۔

یونس جاوید کی متنوع جہات کی حامل تخلیقی شخصیت میں فکشن صرف ایک جہت ہے اور اب تو خیر سے وہ شاعری بھی کر رہا ہے۔

یونس جاوید کی شخصیت میں جو ٹھہراؤ ہے اس کے باعث وہ کھڑکا وڑکا کیے بغیر خاموش لگن سے خامہ فرسائی کرتا رہتا ہے۔ اس لیے شہرت اس کے لیے کبھی بھی کمپلیکس نہ بنی، اسے بولنے کی ضرورت نہیں، اس کا قلم بولتا ہے۔

ناول ''کنجری کا پُل'' کی صورت میں اس نے ایسا آئینہ تیار کیا ہے جو معاصر معاشرہ کے مسخ شدہ نقوش دکھاتے ہوئے Distorting Mirror میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ ناول کے کردار کسی طلسماتی دنیا میں سانس نہیں لیتے وہ میرے آپ کے جانے پہچانے ہیں۔ کسی سڑک پر، کسی گلی میں، کسی کوٹھی کے خوبصورت دروازے کے ساتھ، کہیں نہ کہیں سامنا ہو جاتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ہم انہیں پہچان نہ سکیں۔۔۔ ان کے باطن میں جھانک نہ سکیں اور ان کی زیست کے تضاد در تضادات کو سمجھ نہ سکیں۔۔۔ ان کی شناخت کے لیے کسی یونس جاوید کی ضرورت ہوتی ہے جبکہ میں اور آپ یونس جاوید نہیں۔

یونس جاوید ڈراما نگار ہے اس لیے اس نے غیر شعوری طور پر ناول کو ڈراما کے انداز پر قلم بند کیا، خصوصاً ناول کا پہلا حصہ ''کن فیکون'' تو سکرین پلے محسوس ہوتا ہے وہ Cut to Cut فریم تبدیل کرتا جاتا ہے۔

''سوٹے لگاتا مشتاق مالی، اس کی بیوی ظہرہ کے ذکر کے ساتھ'' کسی VVIP کی کار کے لیے روکی گئی ٹریفک کے باعث عوام کی ناراضگی، غصے اور خشونت کا اظہار صرف ایک آدھ مکالمہ سے بُنا گیا ہے۔ پھر ازبکستان کے ہنگاموں میں ہلاک ہونے والے پاکستانی طالب علم علی رضا کی ایمبولنس میں رکھی لاش۔ ویگن سے نکل کر سڑک پر کھڑی پریشان لڑکی، سڑک کراس کرنے کی منتظر اور ہوسناک نگاہوں کا مرکز ہے، ویگن سے نکلی پریشان لڑکی اور لش لش کرتی کار سے برآمد ہونے والی فہمیدہ فیروزے اور پرائیویٹ ہوسپٹل میں رات کی ڈیوٹی دینے والی زرینہ۔۔۔ یونس جاوید سکرپٹ کے اسلوب میں ان سب سے متعارف کراتا جاتا ہے۔ یوں کہ لمبی چوڑی تفصیلات میں جائے بغیر ان سب کی شخصیت ہویدا ہو

جاتی ہےMiniatures کی صورت میں!

''کنجری کائل'' اس منطقہ کی کہانی ہے جہاں تک جانے کے لیے جس پاسپورٹ کی ضرورت ہے وہ نہ میرے پاس ہے اور آپ کے پاس۔ یہ منطقۂ جنس ہے جہاں ماڈلز کے روپ میں کال گرلز ہیں۔ پوش علاقہ کی وہ شاندار کوٹھیاں جہاں رات کو جنس کے شکاری دادِ شجاعت دیتے ہوئے (یونس جاوید کی پسندیدہ تشبیہ) پتھریلی چھاتیوں اور کسے جسموں سے رس کشید کرتے ہیں اور یہاں وہ مرد بھی ہیں جو مجازی خدا ہوتے ہوئے بھی بیوی کے شبستان کے دروازہ پر دُم ہلاتے ہیں۔۔۔یقیناً مجھے اور آپ کو اس منطقۂ جنس میں داخلہ نہیں مل سکتا۔ ہمیں کھل جا سِم سِم کہنا نہیں آتا۔

یہ وہ کوٹھیاں ہیں جہاں ظہرہ کا پرانا عاشق اس کی چودہ سالہ بیٹی کا سودا کرتے ہوئے معاوضہ میں ایلچی اور کینو کے دوا یکڑ کے باغات دینے کا اعلان کرتا ہے تو دونوں میں یہ گفتگو ہوتی ہے:

''کچھ زیادہ مہربان نہیں ہورہے آپ؟ اتنا تو اُن دنوں میں بھی نہ ہوا جب ہم آپ ایک ساتھ رہا کرتے تھے۔''

''اصل میں۔۔۔'' دیوان عاشق حسین کچھ لمحے خود کو یکجا کرتے رہے اور پھر بے دھڑک کہہ دیا ''ہم مہرالنساء کے عاشق ہیں۔''

فلموں میں ایسی سچویشن کے تاثر میں شدّت پیدا کرنے کے لیے پس منظر میں زور سے آرکسٹرا بجتا ہے۔ مگر یہ کوٹھی حقیقی ہے۔ فلم کا سیٹ نہیں ہے۔ افراد حقیقی ہیں فلم کے کردار نہیں۔ لہٰذا۔۔۔''دل کے ہیروشیما پہ پہلا ایٹم بم گرنے کے باوجود''۔۔۔اور جس کا ''زہر، نازک ترین شریانوں میں'' پھیلنے کے باوجود بھی گفتگو رواں رہتی ہے۔

''آپ نے کب دیکھا تھا اس کو؟'' ظہرہ کو کچھ بھی سوجھ نہیں رہا تھا۔

''ہم نے تھری بیلز کلب (Three Bells Club) کی کیٹ واکس میں اُسے دیکھا اور فیصلہ دے دیا تھا'' رک کر انہوں نے کہا ''اپنا سب کچھ قربان کرنے کا فیصلہ''

یہ دوسرا جملہ تھا جس نے ظہرہ مشتاق کے سارے لہو کی حرارت سلب کر لی تھی۔

''وہ تو۔۔۔ وہ تو چودہ سال سے بھی دو ماہ کم کی ہے دیوان صاحب۔'' وہ کسمسائی۔

''اسی لیے تو'' وہ اصرار سے بولے ''یہی تو وہ نو بہار ہے جو جنت کے دروازے ہوتے ہیں کیونکہ یہ ''پروفیشنلز'' ہیں۔

''کنجری کائل'' بنیادی طور پر نسوانی کرداروں کا ناول ہے اس میں مرد برائے نام ہیں۔ یا پالتو شوہر (مشتاق) کے طور پر یا جسموں کی پرکھ کرنے والے امیر مرد (دیوان عاشق حسین) کہ اچانک حضرت بابا جی عطار کی صورت میں ایسے مرد سے تعارف ہوتا ہے، ظہرہ مشتاق جس کی عقیدت مند ہے، جو استخارہ بھی کرتا ہے مگر اسی ظہرہ کی بھرپور اور سنہری چھاتیوں کے ساتھ جس کی نگاہ چپک بھی جاتی ہے۔۔۔۔ بہت بڑی مسجد کی تعمیر کے لیے خطیر رقم ظہرہ سے لیتا ہے مگر تحائف قبول نہیں کرتا کہ اس کے سالم جسم کی طلب ہے۔

جسم کی دلدل میں دھنسی ظہرہ، قلبِ ماہیت کے عمل سے گزر رہی ہے۔ اس لیے وہ حضرت بابا جی عطار کو روحانیت کا شجرِ سایہ دار سمجھتے ہوئے کومل بیل کی طرح اس کے سہارے کی متلاشی ہے۔ روپے پیسے کی اس کے پاس کمی نہیں اور اسی کے ذریعے سے وہ سکونِ قلب کی متلاشی ہے۔

''میں بغیر کسی پتھر کے، کسی شہرت کے بغیر۔۔۔ مسجد کے علاوہ ہوسٹل اور نیا مدرسہ جیسا کہ آپ سے تفصیلاً طے ہوا تھا اور جہاں بچوں کو کمپیوٹر کی تعلیم دی جائے گی۔'' رک کر اُس نے کہا ''حضرت۔۔۔ میں وہ سب کچھ کرنا چاہتی ہوں جس سے میرا ربّ مجھ سے خوش ہو جائے، جس سے میرا بوجھ کم ہو جائے، پشیمانیوں کا، گناہوں کا، آلائشوں کا۔ میں اپنی نیت کو شفاف لے کر آئی ہوں حضرت جی۔۔۔ اور نیتّوں کا بھید ربّ کریم ہی جانتا ہے اور اسی پر تمام اعمال کی بنیاد ہے جیسا کہ آپ نے مجھے تعلیم دی ہے۔''

یہاں ظہرہ اس طبقہ کی نمائندگی کر رہی ہے جن کے پاس بہت کچھ ہوتے ہوئے بھی کچھ نہیں ہوتا لہٰذا بے روح کھوکھلی زندگی میں کاذب روحانیت سے ''ترفع'' پیدا کرنے کی سعی کی جاتی ہے۔ پچاس ہزار کے قالین پر بیٹھ کر تصوف، اخلاق، روحانیت اور مذہب کی باتیں کی جاتی ہیں۔ مزاروں کا رخ کرتے ہیں اور جھوٹے پیروں کے مرید بن کر دین و دنیا کی ''فلاح'' تلاش کرتے ہیں۔ یہاں وہ عورتیں ملتی ہیں جن کی زندگی چمکیلی کاروں، مہنگے ہوٹلوں اور پُرتعیش بیڈ رومز میں بسر ہوتی ہے۔ ان کے جسم پر جتنے شب خون مارے جائیں وہ اتنی ہی نکھرتی ہیں۔ جنس کے خودکش حملے ان کی جنسی برداشت میں اضافہ کا موجب بنتے ہیں۔

ظہرہ حضرت عطار کو جسم تو نہیں دے سکتی لیکن جس کی کمائی نیک کاموں کے لیے بے دریغ خرچ کرنے کو تیار۔۔۔

ظہرہ نیک کاموں میں مصروف تھی کہ پرانے عاشق دیوان عاشق حسین کے صاحبزادہ سے لندن میں بیٹی (مہرالنساء) کی شادی کے ارادہ کا علم ہوتا ہے، جس کے باپ سے بچانے کی خاطر بیٹی کو لندن روانہ کیا تھا۔ اُسی کا بیٹا اب اس مہرالنساء کا خواستگار تھا۔

ظہرہ کے متوازی فیروزے کا کردار ہے جسے جام مصدق نے ''مصنوعی مہربانوں کے لیے جواہرات میں تول کر پابند کر رکھا تھا، وہ جام صاحب کی ضیافتوں کی سب سے بنیادی ڈش تھی'' جس کی فرمائش اکثر میزبانوں کی طرف سے ہوتی تھی۔۔۔'' لیکن ''پروفیشنل'' ہونے کے باوجود بھی فیروزے۔۔۔ سلمان گوہر کی محبت میں گرفتار ہو کر سب کچھ ہارنے کو تُلی بیٹھی ہے جس کے نتیجہ میں ''شراب کے ساتھ میں نے اسے وہ میڈیسن بھی دے دی جو مرد کے لیے چار

گنا زیادہ مشقت سے بھی نہ تھکنے کی ضمانت تھی۔۔۔بس دوطوفان تھے، جو دو مختلف سمتوں سے امنڈ امنڈ کر ایک دوسرے میں مل رہے تھے، گھل رہے تھے اور عجب ہے کہ دوطوفانوں میں تیسری بھی میں ہی تھی جو عاشق تھی۔''

یہی فیروزے جام مصدق کے لیے دشمن کو ختم کرنے کا جنسی ہتھیار ثابت ہوتی ہے کہ عین وصال کے دوران میں دشمن اس کے جسم پر ڈھیر ہو جاتا۔

ایک دشمن نہیں بلکہ کئی دشمن فیروزے کی تیز جنسی بھٹی میں راکھ ہو کر نابود ہوئے کہ سب کے سب دل کے مریض تھے۔

ناول کا یہ باب خاصہ خوفناک ہے اور یونس جاوید نے بڑی مہارت سے فیروزے کے حوالے سے جام مصدق جیسے وڈیروں کی چالوں کو بے نقاب کیا ہے۔ جام مصدق اس لحاظ سے دیگر وڈیروں کے مقابلے میں نسبتاً زیادہ بہتر سمجھا جا سکتا ہے کہ وہ دشمن کو لذیذ موت دیتا ہے۔ بہیمانہ طریقے سے قتل نہیں کراتا۔ لیکن پھر یہ جنسی آلہ/ہتھیار، فیروزے تائب ہو کر روپوش ہو جاتی ہے۔

صبازادی البتہ مختلف ثابت ہوتی ہے جو کاشف کے منہ پر پورے زور سے تھپڑ مار کر ''پھٹی نائٹی، لیرو لیر نائٹی اٹھا کر کندھے پر ڈال کر دروازہ کھول کر الف ننگی باہر نکل جاتی ہے۔''

عزت صبازادی کے مقدر میں ہے جو خودکشی کی صورت میں حاصل ہوتی ہے۔

ناول ''کنجری کا پل'' دراصل اس جیسی کئی عورتوں کی روداد ہے۔ سلمیٰ، خالدہ، زرینہ، آمنہ، نیلوفر، الفت۔۔۔ان کے نام کچھ ہی کیوں نہ ہوں مگر مقدر سب کا ایک ہی ہے۔ ایک رات کی دلہن، کمرہ نمبر 413، اصل حقیقت ہے۔ باقی سب باتیں، افسانے، حکایات یا پھر المناک انجام۔

''ایک پھٹی ہوئی نائٹی سمیت۔۔۔ہوٹل کے مرکزی لاؤنج کے عین درمیان وہ پورے زرر سے چلاّتی ہوئی گری، ہڈیاں چٹی چٹی ہونے کی آواز کے ساتھ ہی۔۔۔اُس کی اپنی آواز بند ہو گئی۔ چمکتے ہوئے پالش شدہ شفاف فرش پر اس کی ہڈیاں ریزوں میں بدل گئی تھیں اور لہو کی لکیریں، چیونٹیوں کی طرح فرش پر رینگنے لگی تھیں، سب سے نمایاں کنپٹی سے بہنے والی لہو کی لکیر تھی جو فرش پر ایک ''انکار'' کو رقم کرتی چلی جارہی تھی۔''

ناول کا یہ حصہ اداس کر دینے کو کافی ہے۔ کہ جس لڑکی کو عزت کی نیلامی مقصود نہ ہو وہ جان دے کر عزت کا تحفظ کر لے۔

جبکہ کاشف کے روپ میں اس کا گمشدہ سگا بھائی بھی اس کی عزت اور عصمت کا خریدار بن کر اس کے سامنے برہنہ کھڑا تھا۔

یوں بہ حیثیت کردار صبازادی، ناول میں کم جگہ پانے کے باوجود بھی قاری کے دل پر گہرا نقش چھوڑ جاتی ہے۔

یونس جاوید قاری کو اس وقت بھی جھٹکا دے کر گنگ کر دیتا ہے جب ظہرہ کی مرضی کے خلاف اس کی بیٹی مہرالنساء شادی کر لیتی ہے۔ عالمِ کرب میں ظہرہ سوچ رہی ہے۔

''میں اس تصور سے، عمر بھر گناہوں میں ڈوبے رہنے کے باوجود لرزنے لگتی ہوں کہ دیدار حسین ولد دیوان عاشق حسین نے میری ہی کوکھ سے جنم لے کر جڑواں بہن سے شادی کر لی ہے۔ شاید میری سزاؤں میں یہ سب سے کڑی اور تلخ سزا ہے جو ایک تسلسل سے مجھے مل رہی ہے۔''

Incest جو جنسی گناہوں میں سب سے گھناؤنا اور قبیح فعل ہے۔

ناول میں گناہ کے پودے کا سب سے کڑوا ثمر ہے لیکن اس سے نہ زلزلہ آتا ہے نہ سرخ آندھی چڑھتی ہے اور نہ قہر کی بجلی گرتی ہے۔ سب کچھ ویسا ہی رہتا ہے جیسا کہ تھا۔

ظہرہ کی مانند قاری کو بھی اُس وقت ایک زوردار جھٹکا لگتا ہے جب حضرت عطار یہ اعلان کرتے ہیں۔

''ہم تجھے اپنے عقد میں لینا چاہتے ہیں۔''

نیک آدمی، بدکار عورت کی مدد کرتے کرتے خود اس کے جسم کا خواستگار ہو جاتا ہے۔ مجھے تو یہ عالمی وقوعہ محسوس ہوتا ہے کیونکہ کئی اور زبانوں میں اس تھیم پر شاہکار ناول، افسانے تحریر کیے گئے ہیں کہ خراب عورت کو راہ راست پر لانے کے عمل میں مرد خود سیدھے راستے سے بھٹک جاتا ہے۔

دراصل۔۔۔جنسی زندگی بسر کرنے والی/ بدمعاش/ فاحشہ/ جسم فروش عورت کی جنس اس میں جو کشش پیدا کر دیتی ہے اور اس کا جسم جس طرح سے ترغیب کی لذت کے دعوت نامے میں تبدیل ہو جاتا ہے اس سے بچ نکلنا آسان نہیں ہوتا۔ اُدھر نیکوکار کی نیکی کی جڑیں، اگر ذات میں پیوست نہ ہوں اور زہد وتقویٰ اس کی شخصیت کا اساسی جزو نہ ہو تو ایسا مرد جنس کی تیز آنچ کے سامنے تنکے کا مرد ثابت ہوتا ہے۔ لہٰذا عطار بھی جنس سے مغلوب ہو جاتا ہے کہ اس کے پند و نصائح محض اندازِ گفتگو ہیں۔ یوں نیک اعمال ظاہری اعمال کے مترادف قرار پاتے ہیں۔ اسی لیے ظاہر داری کا لبادہ اترتے ہی اندر سے ویسا ہی منقسم مرد برآمد ہوتا ہے جیسا کہ جنسی بھوک کا مارا کوئی مرد ہو سکتا ہے۔ سوانکار سننے کے بعد عطار وہی غدر برپا کرتا ہے جو اس طبقہ کے لوگ کیا کرتے ہیں۔ اس کی جوشیلی تقریر کے زیر اثر لوگ جسم کی کمائی سے تعمیر کردہ مسجد ڈھا دیتے ہیں اور درسگاہ کو آگ لگا دی جاتی ہے۔ تب بپھرا ہجوم ظہرہ کی گاڑی کا رخ کرتا ہے جو گاڑی کے اندر مقید اپنے رب کو یاد کر رہی ہے۔

ایک نے آگے بڑھ کر کہا:

''کنجری''

سب چیخنے لگے۔۔۔''کنجری۔۔۔کنجری۔۔۔کنجری'' اس دوران میں حضرت عطار اپنے عمامے کے ساتھ نمودار ہوئے۔

ظہرہ کو بچانے کے لیے جب احمد خاں (اس کا ڈرائیور) آیا تو مشتعل ہجوم اسے قتل کر دیتا ہے۔ بابا عطار نے نوجوانوں کو بلایا اور احمد خاں کی

چیتھڑے لاش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا''اسے جلد اٹھا دو نماز کا وقت نکلا جا رہا ہے'' ظہرہ کو پولیس بہ مشکل بچالے جاتی ہے۔تب اس کی گاڑی جلا دی جاتی ہے۔

ناول کا اختتام کئی برس بعد کے زمانے میں ہوتا ہے جب ظہرہ جلی ہوئی مسجد کی سیڑھیوں پر بیٹھی موم بتیاں جلا کر اپنے خدا کو یاد کر رہی ہے اس کا جسم کھنڈر میں تبدیل ہو چکا ہے، دل کی مریض ہے، بلڈ پریشر بھی ہے۔

اداس کر دینے والا یہ ناول لکھ کر یونس جاوید نے ہمیں احساس کرانے کی کوشش کی ہے کہ ہمارا معاشرہ جنگل میں تبدیل ہو چکا ہے۔حُسن کے شکاری مرد اور شکار بننے والی وہ عورتیں جنہیں ہر ممکن طریقے سے سنگسار کیا جاتا ہے۔

عطار ایسے طبقہ کی نمائندگی کر رہا ہے، منافقت جن کا شعار و زیست اور تکفیر سب سے بڑا اہتھیار ہے۔

کہنہ مشق افسانہ نگار ہونے کی بنا پر یونس جاوید اس امر سے آگاہ ہے کہ کس واقعہ یا کردار کو کیسے اور کتنے الفاظ میں بیان کرنا ہے اسی لیے وہ غیر ضروری تفصیلات میں جائے بغیر جزئیات نگاری کے ذریعے کرداروں اور مناظر کو زندہ کر دیتا ہے۔

''کنجری کا پُل'' میں بہت زیادہ کردار نہیں ملتے۔ چند مرد، چند عورتیں اور ایک حضرت عطار۔لیکن یونس جاوید نے ان چند کرداروں کو جنسی معاشرے کے زندہ استعاروں میں تبدیل کر دیا ہے۔

یونس جاوید کی ایک اضافی خوبی یہ ہے کہ وہ جذباتی ہوئے بغیر، جذباتی مواقع کے فنی تقاضوں سے عہدہ برا ہو جاتا ہے اسی لیے نہ وہ کرداروں کو مطعون کرتا ہے نہ ان سے نفرت پیدا کرتا ہے اور نہ ہی ان پر ترس کھاتا ہے۔۔۔ بس حقیقت نگاری کے اسلوب میں کردار نگاری کرتا ہے لیکن اس کے باوجود وہ لیبارٹری کے سائنس دان کی مانند لاتعلق بھی نہیں رہتا۔اسے ان جسم فروش عورتوں سے محبت ہے وہ اپنی محبت کا اظہار ان کے المیوں سے کرتا ہے جس سے شدّت تاثر جنم لیتی ہے۔

''اندھیرا اُجالا''

''اندھیرا اُجالا'' پاکستان ٹیلی ویژن کی وہ طویل ترین سیریز ہے جو اپنے انداز اور نفسِ مضمون کے اعتبار سے بہت ہی کامیاب ٹھہری۔آپ نے ان ڈراموں کو ٹیلی ویژن پر دیکھ کر پسند کیا لیکن جب آپ ان کو پڑھیں گے تو ان کے وہ باریک پہلو بھی آپ پر عیاں ہوں گے جن پر آپ کی نظر تب نہیں گئی تھی۔

یونس جاوید نے اپنے تخلیقی عمل میں کسی شعوری کوشش کے بغیر ڈرامہ نگاری کے سب سے بڑے عمل کو راہ دے کر اپنی تمثیلوں کو بہت اونچے مقام پر پہنچا دیا ہے۔ڈرامے کی بنیاد کہانی ہو، کسی خاص کردار کی عکاسی ہو، مکالمہ بندی ہو یا مصنف کے فلسفے یا اس ''سخن'' کی ترجمانی ہو، ڈرامے کے ''بڑا ڈرامہ'' بننے کے لیے ضروری ہے کہ اس کے کردار ناظرین کی موجودگی میں بلاواسطہ طور پر ایک دوسرے سے بات نہ کریں بلکہ ان کے مکالمے پہلے ناظرین کو پہنچیں (خواہ ایک سیکنڈ کے ہزارویں حصے کی حد تک ہی پہلے پہنچیں) اور پھر اس کے مخاطب کو موصول ہوں۔مثلاً کردار الف کردار ب سے مخاطب ہو تو اس کا فقرہ ناظرین میں سے ہو کر ب کو پہنچے اور جب ب اس کا جواب دے تو اس کا فقرہ پہلے ناظرین کو صوتی اثر کی طرح چھو کر پھر الف تک پہنچے۔گویا کرداروں کی آپس کی گفتگو میں ناظرین کا چینل ہر حال میں قائم رہے۔ جہاں یہ چینل قائم نہیں رہتا وہاں فقرے فقروں سے باتیں کرنے لگ جاتے ہیں اور ان کے ادا کرنے والے کردار مردہ ہو جاتے ہیں۔''اندھیرا اُجالا'' کے یہ ڈرامے آپ کو یقیناً اسی وجہ سے اتنے پسند آئے تھے کہ ان میں یہ چینل مستقل طور پر قائم رہا اور ہر کردار کا ہر فقرہ پہلے آپ تک پہنچ کر پھر اپنے مخاطب کو موصول ہوتا رہا۔

مجھے خوشی ہے کہ ہمارے بعد کے آنے والے ادیبوں میں چند ایسے ڈرامہ نگار پیدا ہوئے جنہوں نے تمثیل کی دنیا میں وہ خلا پُر کئے ہیں جو ہم سے ہماری پوری کوشش کے باوصف پُر نہ کیے جا سکے تھے۔ان ڈرامہ نگاروں میں یونس جاوید کا بہت اونچا مقام ہے اور ان کے ساتھ اردو ڈرامے کی بہت سی امیدیں وابستہ ہیں۔

اشفاق احمد

کنجری کاپُل

پروین عاطف
(لاہور)

بوجوہ میں اور یونس جاوید کبھی ایسے دوست نہ تھے جو ٹی ہاؤس کے کسی کونے میں بیٹھ کر فلسفہ موت وحیات کی تندیں پھدولتے یا چائے کی ایک ٹھنڈی پیالی پر گھنٹوں بیٹھ کر شاعروں، ادیبوں کے تازہ سکینڈلوں کے چسکے لگاتے۔ہم دونوں ایک طرح کے بیلی ہیں۔یعنی ہم پیشہ اور ہم عصر۔میں ان سے عمر میں سینئر اور وہ مجھ سے ادب یا تخلیق سفر میں بہت آگے یا سینئر ہیں۔یونس جاوید کا تعلق کسی ایسے جدامجد سے نہیں جس کے ڈانڈے ابن عربی، ابن خلدون یا حافظ سعد وغیرہ سے ملتے ہوں۔یہ رب برتر خالق دوجہاں کی مرضی یا موڈ ہے کہ سنگلاخ پہاڑوں سے میٹھے چشمے پھوٹیں یا بے کراں تپتی ریت کے صحرا میں ہرے بھرے نخلستان پیدا ہو جائیں۔حافظ یونس جاوید کے بچپن کے سات برس انسانوں پر زندگی کے بیشتر دروازے بند کر دینے والے گھٹن مارے مدرسے میں گزرے اور نتیجہ یہ کہ اپنے بزرگوار کی خواہشات پر پانی پھیر کر بجائے اس کے کہ محترم پیٹ پر بم باندھ کر ہم سب کفار کو واصل جہنم کرتے تخلیق کی باغیچیاں کھلانے میں جت گئے۔یعنی والد محترم کے کیے دھرے پر پانی پھیر دیا۔محفلوں، سڑکوں، تقریبات یا ٹی ہاؤس میں سرسری سا چہرہ لیے زندگی کے مشاہدات کو اپنے لیزر بیم قلم سے یوں چیر پھاڑ کر سکتے ہیں شروع میں اندازہ لگانا ناممکن تھا۔

اس کی فنکاری کا اندازہ تو شروع شروع میں کوئی نہ لگا سکا۔دکھنے میں بھی دھیما اور بات میں بھی بظاہر مٹا مٹا سا۔پر پان کی دکانوں پر لگے ٹیلی ویژن سیٹوں (Sets) کے گرد جب ہجوم یونس جاوید کے لکھے ڈرامے ''رگوں میں اندھیرا''''کانچ کا پُل'' اور ''خواب عذاب'' وغیرہ کی طرف بڑھنے لگے اور پی ٹی وی اس کے پیچھے بھاگنے لگا تو ادیب برداری چونکی۔کون ہے؟ کہاں ہے؟ جب میں نے اردو ادب کی بے بے ممتاز مفتی سے پوچھا۔۔۔اسی کسی موسم میں مَیں اور میرا اہالی ووڈ ٹرینڈ بھائی احمد بشیر جو صرف اپنی مرضی سے جینا جانتا تھا۔ایک مختلف سی، بھائی احمد بشیر کی ذاتی پسند کی فلم نیلا پربت بنا کر بری طرح پٹ چکے تھے اور میرا پائی پائی جوڑا ہوا پیسہ سوفی صد مٹی میں مل گیا تھا۔تب مفتی جی بولے کاکی ٹیلی ویژن ڈرامہ شبِ بارت کی شرلی ہے۔تیلی لگی، شوں شڑک، آسمان تک اڑی اور پل میں ٹھُس ادب کی قابلِ قدر صنف نہیں ہے۔قابل قدر ادب ہے اور ادیب ہے۔ڈرامہ دودن کی چاندنی اور پھر اندھیری رات۔اشفاق احمد پیدائشی ادیب تھا اس نے اپنا آپ سکرین کی گلیمر میں تباہ کر لیا۔میں نہیں مانتا۔۔۔''تو پھر ٹھیک ہے۔پردہ کرے گا تو تالیاں از خود بند ہو جائیں گی۔یونس جاوید اصلی یا لافانی تخلیق کار نہیں ہے'' میں نے اپنے اندر کے حسد یا رشک کے جذبے کو تھپتھپایا۔۔۔کچھ اس امر پر بھی حیرانی تھی کہ سات برس مدرسے کی جکڑ بندی محدود اور ایک رُخی تعلیم و تربیت کے بعد یہ شخص ڈاڑھی، تسبیح اور اونچی شلوار کی انانیت اور حورانِ خلد کی بندگی چھوڑ کر معاشرتی برائیوں اور انسانی رشتوں کو کیونکہ آ نکنے بیننے میں جُت گیا۔مدرسے کی کرم نوازی تھی کہ ذہن و دل پر لگے تالوں نے اس کی جبلی ہنرمندی میں بارود کی فلیتی سلگا دی۔ڈرامے کے میدان میں یونس نے ایسا نام پایا کہ بڑے تخلیق کاروں میں اس کا نام شامل ہو گیا۔اس سے پہلے کہ ممتاز مفتی کی ڈرامہ نگاروں کے بارے میں دلیل مستند ثابت ہوتی یونس جاوید نے نیا دھوبی پڑا مارا اور اپنی خداداد تخلیقی قوت کو ایسی قوس قزح میں تبدیل کر دیا کہ افسانہ، ناول، انشایئے اس میں ادب کے ساتوں رنگ جگمگانے لگے۔میری ذاتی تخلیقی کاوشوں تو دوستوں سے ڈھکی چھپی نہیں۔مثالاً لاد کر گاؤں کی کچی پگڈنڈی پر ڈھچکوں چلنے والی بیل گاڑی سمجھئے۔کسی زرخیز عورت کے ساتھ شرط بدھ کر کہانی جنوں تو اس کا نو مہینے میں جمنے والا بچہ بستہ لے کر سکول جانے والا ہو جائے اور میری کہانی ستماہے بچے کی طرح پالنے میں ریں ریں کرتی رہ جائے۔ادھر شفق کی لالی پھوٹتے ہی یونس جاوید کے افسانوں کا مجموعہ خاکی لفافے میں لپٹا میرا دروازہ کھٹکھٹاتا ہے۔پھرُ ولتے پھرُ ولتے سورج ممٹی سے ڈھلنے لگے تو ڈاکیا یونس جاوید جیسی دھیمی اور سنجیدہ مسکراہٹ ہونٹوں پر سجائے ان کا نیا ناول پکڑا کر چلا جاتا ہے۔شام ڈھلے رحیم کریم پالن ہار کبھی دو چلیاں بجلی گھر میں بھیج دے اور ٹی وی ڈرامے کے آخر میں ادیب والے خانے میں بھی یونس جاوید لکھا ہو تو میں تو سڑ بل کر کوئلہ ہو جاتی ہوں۔یا اللہ یہ ادیب ہے یا روشنی کی رفتار سے اڑنے والا سیارہ۔قاسمی صاحب تھے تو ہم عاشقِ رسالہ فنون اپنی اپنی تخلیق ہاتھ میں تھام کر ان کے کلب روڈ والے دفتر جایا کرتے تھے۔بارہا میرا اندرونی تجسس مجھے اس عمارت کی تیسری منزل پر یونس جاوید کے 8x8 کے دفتر میں لے جایا کرتا تھا۔ابھی شہر کی رگوں سے بجلی سو فیصدی نہیں نچوڑی گئی تھی مئی جون کے دوزخ مہینوں میں یونس کے بلیک ہول دفتر میں لارڈ وولزلے ''Lord Woolzlay'' کے وقتوں کا ایک سیلنگ فین چلتا تو تھا لیکن مسلسل دردِ زہ میں مبتلا۔یونس اپنی تخلیق کے نشے میں سرشار ماحول سے بے خبر قلم اس تندہی سے رواں دواں رکھتا تھا کہ اسے دیکھ کر مجھے وہ ککی کیڑی یاد آتی تھی جو وقت کی تیز تر سونامیوں سے بچنے کی خاطر آٹا کمر پر لادے اپنی منزل کی طرف گولی کی رفتار سے بھاگتی ہے۔بھید تو یہی ہے کہ یونس جاوید نے اپنی ہنرمندی کے کاکے کو کمبل میں لپیٹ کر کبھی پالنا نہیں جھلایا۔ماؤزی تنگ کے چینی مزدوروں کی طرح چوبیس گھنٹوں کی مشقت میں جوتے رکھتا ہے۔

یونس جاوید کی دسیوں کتابوں میں سے جو چند ایک میری خام نگاہ سے گزری ہیں۔ان میں جن دو جذبوں یا حقائق کی چکی میں وہ پستا ہے اس میں

ایک تو اس کی جنم بھونی پاکستان ہے اور دوسری آدم کو خوشۂ گندم سے لبھانے والی حوا اس چکی کے پتھریلے پڑوں کے درمیان اس کی حثیت دال کے اس کوکڑ جیسی ہے جو بالکل بے بس ہو۔ پاکستان کے آج کے بارے میں وہ تڑپتا ہے۔ ''قحط کی چاپ سنتی ہو؟ میری زندگی تو نہ بہت قیمتی ہے، نہ ویادہ میں تو نئے لوگوں کے لیے تڑپتا ہوں نئی نسل کے لیے آنے والے ذہین ترین بچوں کے لیے پتا نہیں یہ سوال یا شرمندگی کہ ہم انہیں کیا دے سکے۔ گندہ پانی، ویرانی بھوک پیٹ کی جنس کی علم کی اوران کی نوجوانیوں کے ساتھ ان پروار د ہونے والا اشدید قحط۔''

تو پھر ہم عرق انفعال سے بھیگنے کے سوا کر بھی کیا سکتے ہیں بھائی۔ اگر ہمارا خون پینے والوں، ہماری عزتیں لوٹنے والوں کے ہاتھ نہیں روک سکتے تو پھر ہمیں خوشی خوشی تاریخ کے فولادی پہیوں تلے کچل جانا چاہیے۔ جب وہ تھکتا ہے سستاتا ہے تو اچانک قاری کا دھیان کنجری کے اس بھید بھرے پل کی طرف پلٹاتا ہے جہاں شاہوں کی پگڑیاں بھی اُچھلتی ہیں اور یونس جاوید جیسے تخلیق کار بھی گھات میں بیٹھے ملتے ہیں۔ جیسا میں نے کہا وطن کے بعد عورت اس کی زندگی کا دوسرا ''ونڈر لینڈ'' ہے۔ اس کی زندگی کا دوسرا اہم جذبہ لہسن کی بساند میں بسی گھر والی تو جو ہے سو ہے وہ کہتا ہے۔ بدن چھابڑی میں لگا کے بیچنے والی کے سامنے تو سُلفے کی لاٹ بھی دم توڑ دیتی ہے دین تو ساری اس صدیوں پُرانے پدرسری نظام کی ہی ہے۔ جو عورت کے طلسم سے کبھی باہر نہیں نکل سکا اور اس کے بارے میں بے یقین بھی رہتے ہیں۔ ہند پاک کے مذہبی معاشروں میں تو مرد نے اپنے آپ کو خدائے مجازی اور بھگوان کے روپ میں دھار رکھا ہے۔ خود ہی سوچئے کرشن ہو اور اردگرد رقص کرنے والی لاتعداد گوپیاں نہ ہوں تو بات بن نہیں پاتی۔ یوں بھی اس خطے کے مرد ستاروں پر کمندیں ڈالنے والی مٹی سے نہیں بنے۔ ''جو ہے جیسا ہے'' کی زندگی جینے میں مطمئن ہیں۔ چتاؤنی یا زندگی کا کوئی بھی بڑا چیلنج یا کھوج انہیں بے اطمینان کرتی ہے۔ عورت کو زیر کرنا اُس کے حسن سے کھیلنا، اُسے پٹاری میں بند رکھنا۔ یہاں کے مرد کی قابل ستائش ہنر مندی ہے۔ کہاں زیر زمین لیبارٹریوں میں Stem Cell، نیوٹران ، پروٹون کلوننگ جیسے بورنگ اور کھردرے کام اور کہاں فیروزے، صبازادی، زہرہ کے دگ دگ دمکتے تروتازہ بدن، گوپی کرشن راس، بانسری کی تانیں، ہیر رانجھے بسنت بہار، قیامت کی چال چلنے والی دنیا جائے بھاڑ میں۔ ہم اپنے چھتنارے پیڑوں تلے وقت کا پلو تھام کر بیٹھے رہیں گے۔ ہجر ووصال کے قصے لکھیں گے۔

اوزون کی آسمانی سطح لیرلیر ہوگئی۔ انسان کا متبادل انسان ساخت ہو گیا۔ اندھوں کو مشینی آنکھیں لگا دی گئیں۔ یونس جاوید کے اکتارے بجانے والے ہم وطنوں کو کیا۔ وہ بیچارے تو ہجر و وصال کے عذابوں میں گھرے ہیں۔ قاری یونس جاوید بھی ہماری ہی برادری سے ہے زندگی کی بانسری کے تمام سروں کا رسیا مدرسے کی طویل گھٹن سے نکلا تو سیدھا کنجر منڈی جا پہنچا۔ ناول ''کنجری کا پُل'' نہ لکھتا تو کیا کرتا۔ نام بھی انوکھا اور موضوع بھی ٹائٹل پڑھنے کے بعد ''بس کا مسافر ہو، نوخیز طالبہ، تسبیح بردار بابا، پُر اسرار حجابا'' کوئی بھی ایسا نہیں جو اس کتاب میں جھانک کر اپنے پھیکی پھاک زندگی میں کوئی چاٹ مصالحہ نہ بھرے۔ مجھ جیسی باسی کڑھی میں بھی ٹائٹل دیکھ کر اُبال آ گیا تھا۔ یونس ''کنجری کا پُل'' دیکھنے کا مجھے بھی شوق ہے۔ میں نے فون پر کہا ''خود نکلو اور تلاش کر لو'' چار دہائیاں پہلے عورت کی ذلت کا یہ مونو گرام صرف ساس بہو کو گالی دیتے وقت استعمال کرتی تھی۔ سوتن سوتن پر غصہ نکالنے کی خاطر یا شوہر بیوی کو گھر سے باہر نکالتے وقت کنجری کنجری پکارتا تھا۔ شرفا کی محفلوں میں یہ لفظ یا اس کا وجود مکمل طور پر متروک سمجھا جاتا تھا۔ ہمارے ہاکی کے عظیم کھلاڑی، لمبے اونچے شوہر، جی دار مرد تھے۔ چھوٹے بھائی کی شادی پر ناچ گانے کی خاطر کہیں سے دو نوخیز نوچیاں اٹھا لائے تھے۔ جن کے جلو میں دو میلے کچیلے مفلس و نادار طبلچی اور سازندے بھی تھے۔ ہماری مومنہ صادقہ ساسو ماں اس شعبے کی عورت کا نام لینے کے بعد چھ کلیاں کرتیں تھیں اور ۲۷ بار با آوازِ بلند ''نعوذ باللہ'' پڑھتی تھیں۔ رسم حنا کی شام انہوں نے موتیے کی کلی جیسی نوچی کو پاؤں میں گھنگرو باندھتے دیکھا تو یااللہ کہہ کر زمین پر اس طرح گریں جیسے بیچاری معصوم گھگی شکاری کی غلیل لگ جانے سے گر جاتی ہے۔

ساڑھے چھ فٹ کا فوجی بیٹا یعنی ہمارے خدائے مجازی احساس جرم سے تھر تھر کانپنے لگے۔ چہرہ عرق انفعال میں تر ہو گیا۔ جب تک اس دوزخ کے ایندھن کنجریوں کو دروازے سے باہر نہیں دھکیلا خالہ جان کے مومن پھیپھڑوں میں آکسیجن رواں نہ ہوئی پر صاحبو پُرانا سب کچھ ہوا ہو گیا۔ اب تو ''سٹیلتھ بم'' جب تک خلقت کو لحاف کے اندر گھس کے بھسم نہ کر دے چیتھڑے نہ اڑ جائیں کان وکان کسی کو خبر نہیں ہوتی۔ اقدار اور تہذیبوں کے ساتھ بھی ایسے ہی واردات ہے۔ وقت کا سٹیلتھ بم چپکے چپکے ہمارے دل و ذہن پے وار کرتا ہے۔ اور بستر بستر گھومتی کنجری ایسا مقام حاصل کر لیتی ہے جہاں جبہ و تسبیح سے لے کر اعلیٰ انگریزی سوٹ بھی اسے جی جی کرنے پر مجبور ہو جائیں۔ اور اسے میرے تیرے مقدروں کی منصفی کا حق بھی دے دیں۔ عہد شباب مال و زر اقتدار پھر مملکتِ اسلامیہ اللہ اللہ۔ بس ایک ہی معتمد ادبی جاسوس یونس جاوید ہے جو عیاری سے کیمرہ ساؤنڈ لائٹ اپنے قلم کے اندر چھپا کر اُن سب کے کینڈل لائٹ تخلیوں میں جا پہنچتا ہے۔ ایسے تخلئے جہاں بڑے بڑے ملحد اور دہریئے بھی قدم رکھنے سے ڈرتے ہیں۔ اصل نسل وہ ہے تو ڈرامہ نویس، تضاد، ٹکراؤ اور واقعات کی نیرنگی بھی اُس کے سین کی جان ہوتی ہے۔

یعنی کنجری کے پُل ناول میں آپ کی ملاقات وہ ایسے حجر اسود نما پیر صاحب سے کراتا ہے جن کی ایک پھونک سے روح کی کثافت، شعلہ طور میں بدل جائے۔ کنجری کے ترشے سنوارے بدن کی میل دھوتے دھوتے پیر صاحب بھڑک کر اُس پر اس طرح جھپٹتے ہیں جیسے راجہ گدھ کسی مردہ بدن پر جھپٹتا ہے۔ پیر صاحب کے بدن کے بند کوئیں میں کنجری کی چھو سے ایسا دھا کہ ہوتا ہے کہ ہست

نیست میں بدل جائے۔تب یونس شرارت سے قاری کی طرف دیکھتا ہے۔کنجری کے پُل کا نظارہ کیا؟ قاری کے سانس اکھڑ جاتے ہیں،کھوجی خوشی سے اُچھلتا ہے اور چسکے لگاتا ہے اور اپنا جاسوسی لینز اُس طرف گھماتا ہے۔جہاں دیکھنے،سونگھنے، سمجھنے والوں کے پر جلنے لگیں۔ پھر ستار العیوب تاریکی برستی ہے۔اور میرے تیرے مقدروں کے مالک،میرے تیرے وجودوں کی بوٹیاں،صدقے کے حرام قتلوں کی طرح راوی کے بڈھے پل سے پھینکتے ہیں۔طاقت کی ڈگڈگی بجا کر ماضی، حال، مستقبل سبھی کو بندر ناچ نچانے والے معززین ، مقتدر، چودھری، خان، جرنیل، وزیر خود تاجدارِ وطن مولانا، ظہرہ ، صبا زادی، فیروزے کے چکنے چمکیلے اجسام پر لوٹ پوٹ ہوتے ہیں۔میرے تیرے منہ سے چھینی ہوئی روٹی کا آخری نوالہ بھی ان کے حسن پر لٹاتے ہیں۔تعیش کی اس آڑھت منڈی میں دونوں پارٹیاں لین دین میں کوئی بخالت نہیں برتتیں۔یونس کا سی سی ٹی وی کیمرہ جی بھر کر دیکھتا بھی ہے اور دکھاتا بھی ہے۔قابل تحسین حقیقت یہ ہے کہ نا وہ قاضی بنتا ہے نہ ناصح جو آج کل مملکت اسلامیہ کی سر زمین پر جنگلی بوٹیوں کی طرح اُگ رہے ہیں۔سچ تو یہی ہے گلوبل ویلیج تہذیب یا کارپوریٹ کلچر نے جب ہر جنس،سچائی، وقار،عزت، حب الوطنی، کمٹمنٹ کو منڈی میں دھر لیا تو وجودِ زن کی تشریح مختلف کیسے ہوسکتی ہے۔اپنے جسمانی حسن کے بل بوتے پر مفلس عورت کی طبقاتی تبدیلی کی شدید خواہش کی نفسیات کو وہ تنگ تنگ تو کرتا ہے اور دلجمعی سے کرتا ہے لیکن لاکھ تعلق ہونے کے باوجود اس کی لائینوں کے درمیان کہیں اس کی مردانہ چڑ بھی دکھنے لگتی ہے۔ برصغیر کے ''ہڑپن'' مرد کی ایغو کے ایکسرے تو بڑھیا ہیں پر کہیں کہیں لگتا ہے ڈائریکٹر خود سین کا حصہ بننے کا خواہش دار ہے۔

یونس کی ایسی ہی تحریر تھی جس نے مجھے لاہور شہر کی اندرونی گلیوں سے لے کر شاہی ایوانوں کی جھلملیوں تک کنجری پُل ، ڈیرہ یا ان کا گردہ تلاشنے پر مجبور کر دیا۔مشہورِ زمانہ ہیرا منڈی تو کب کی موہنجوڈارو بن چکی بھید کوئی اور ہے کھٹ مٹھا لذیذ۔ مجھے خود بھی دیکھنا چاہیے۔کانچ کے کرسٹل بدن کہاں اور کس طرح بکتے ہیں۔

اپنی مینی مینہ مو، چوک میں پہنچ کر میں نے خود سے کہا دائیں رخ چلتی ہوں مسلمان دائیں رخ کو بابرکت مانتے ہیں۔ دائیں رخ مڑی تو میں ضرور! لیکن اُس کے بعد جو ہوا وہ آپ خود دیکھ لیجیے۔ بڑے چوک کے چاروں طرف دائیں بائیں،اوپر نیچے سور پھونکا جا چکا تھا۔اور نیم مردہ، نیم زندہ انسانوں پر مشتمل جم غفیر اس طرح کھڑا تھا جیسے جہنم کے باہر کھڑا ہو کر اپنے اپنے دراجات اور سزائیں معلوم کرنے آیا ہو۔ خشمگیں نگاہوں اور بھری پستولوں والے محافظ سینکڑوں ، ہزاروں کا کروچ نما انسانوں کے راستے بند کر کے کھڑے تھے۔رام نام ست ہے۔رام نام ست ہے۔فنا کی دفلی بجی۔ جو قدم آگے بڑھائے گا جہانِ عدم روانہ کر دیا جائے گا۔ ہر ایک پیشانی پر اپنے پاکستانی ہونے کی چارج شیٹ چسپاں تھی۔میری بائیں طرف رکشا میں بیٹھی شٹل کاک برقعے والی عورت کی فلک شگاف چیخیں ہجوم کے شور میں مدغم ہو رہی تھیں۔اس کا سیاہ داڑھی والا نوجوان شوہر وردی والے محافظ کے آگے عاجزی سے ہاتھ جوڑ رہا تھا۔ بھائی صاحب میری بیوی دردِ زہ میں مبتلا ہے۔میری عورت کی عزت کا سوال ہے۔خدا کا واسطہ ہے مجھے ہسپتال جانے دو۔''میرے گردے میں شدید درد ہے میں مر جاؤں گا'' ---میری ماں کا جہاز اڑنے والا ہے'' وہ عمرہ کرنے جا رہی ہے۔خدا را مجھے ہوئی اڈے جانے دو---۔ پر راستے مقفل رکھنے والے فولادی سپاہیوں کے نہ کان تھے نہ زبان بس آنکھیں تھیں جو چاروں کوٹ پھیلی چمکیلی ساٹن جیس سڑک پر لگیں تھیں کہ شاہی سواری کی ریشمی دھول اس طرف سے اڑ کر آنے کا وقت ہو چکا تھا۔ مجھے کنجری کے پُل کی کوئی خوشی نہ تھی۔میرا ناتواں بدن ہجوم کی دھکیل کا شکار تھا۔غصے سے بھرے ہجوم کی چوتھی دھکیل نے مجھے جس ایمبولنس کے پاس لا کھڑا کیا وہ مسلسل الارم بجا رہی تھی اور اس کے اندر آکسیجن سے سانس کشید کرتا نوجوان زندگی موت کی کشمکش میں مبتلا تھا۔اور اس کی سینہ کوبی کرتی ماں پورے جہاں کو تبرے بول رہی تھی۔خدا کے لیے راستہ دے دو میرا بیٹا مر رہا ہے۔میں نے بھی آگے بڑھ کر سپاہی کی منت سماجت کی پر وہ کانوں پر رکھے کنٹوپ میں سے کچھ بھی نہیں سن سکتا تھا، نہ ہی وہ سننا چاہتا تھا اور نوجوان کے سانس ایک ایک کر کے ٹوٹ رہے تھے۔

''سڑک تیرے باپ کی ہے؟؟''

باپ کے پتر تیرے دانت توڑ دونگا۔

میں تمہارا پیٹ پھاڑ دونگا۔

کون بند کرتا ہے یہ سڑکیں۔

میں چیف جسٹس کو لکھوں گا۔

لوگ پاگل ہو چکے تھے۔

پھر ہوٹر گونجتے ہیں۔زمین و آسمان پر لرزہ طاری ہو جاتا ہے۔

شاہ کی آمد آمد ہے۔اماں ایک گھنٹے تک سڑکیں کھُل جائیں گی۔

ماں سڑک کھلتے ہی میں گھر آ جاؤں گا۔فکر مت کرو۔کوئی موبائل پر چیخا۔یا اللہ میں کس رخ جاؤں۔کنجری کا پُل میرے اعصاب پہ سوار تھا۔شٹل کاک برقعے کے اندر گٹھڑی نما عورت رکشا میں بچے کو جنم دے کر نیم جان پڑی تھی۔اُس کی کوکھ سے برآمد ہونے والا آٹھواں کا کروچ آنولہ گلے میں پھنسا کر واپس جہانِ عدم روانہ ہو چکا تھا۔اُس کی عذابِ زہ سے پسی کچلی ماں بچے کی نعش اور اپنا برہنہ بدن ڈھانپنے میں مصروف تھی۔

ایمبولنس میں زندگی موت کی جنگ لڑنے والے نوجوان کی ماں بھی ایمبولنس کے شیشوں سے سر پھوڑ رہی تھی۔شاید وہ شاہی سواری کی بلی چڑھ گیا تھا۔ ایمبولنس کا الارم بند ہو چکا تھا۔کون، کیوں---؟ میں حواس باختہ تھی۔ یہ سب سیاست کا کھیل ہے۔پاور گیم---بی بی پاور گیم۔یونس جاوید کی ناتواں آواز بے کراں ہجوم کے اندر سے مجھے سنائی دی، کنجری کا پُل تمہاری پہنچ سے باہر ہے

واپس چلی جاؤ یا غور سے دیکھو ہم لوگ ایسے ہی پلوں سے لٹک رہے ہیں۔ بس یہی سانجھ ہے میری اور یونس جاوید کی مرگی میں تڑپتا، وینٹی لیٹر پر لگا پاکستان ہم سے برداشت نہیں ہوتا۔ لوگ اس تابوت میں کیل ٹھونکتے ہیں ہم آپس میں لپٹ کر بین ڈالتے ہیں۔ بے بسی سے کرلاتے ہیں۔

پھر وہ پچھلا صفحہ پلٹتا ہے۔

پروین عاطف، دیکھو اپنے پیارے شہر کو دیکھو اس تاریخی یادگار سڑک کی طرف نگاہ دوڑاؤ۔ یہ وہی ٹھنڈی سڑک مال روڈ ہے۔ کچھ دہائیاں پہلے جہاں سرِشام چاند کی روپہلی کرنیں پھوٹتے ہی خوش لباس جاذب نگاہ، جوڑے چہل قدمی کو نکلا کرتے تھے۔ نوجوان لڑکوں کی ٹولیاں اور سکھی سہیلیوں کی منڈلیاں ریگل اور پلازہ سینما میں ''بن ہر'' ''An Affair to Remember'' ''Ben Hur'' جیسی فلمیں دیکھنے جاتی تھیں۔ اسی سڑک سے منسلک اوپن ایئر تھیٹر ہماری کلاسیکی موسیقی کے عظیم ورثے کی شامیں رچاتا تھا۔ بائیں طرف سے بچوں کی دُرگا ماتا موہنی حمید ریڈیو اسٹیشن سے بچوں کا پروگرام ختم کر کے باہر نکلتی تھی۔ بس سٹاپ کی طرف رواں دواں۔ مڈل کلاس کے پسندیدہ لورینگ ہوٹل کے اندر سے وائلن سے رسیلے سُر بہتے تھے۔ (جہاں آج کل کارسیٹوں کی مارکیٹ ہے) ہم سہیلیوں کے ساتھ شیزان میں چائے پینے جاتیں تھیں۔ شاہی سواریوں نے ابھی رشکوں کے اندر جتے ہوئے بچے اپنی شان و شوکت کی، بلی چڑھانے کا رواج نہیں ڈالا تھا۔ میراب شاہوں کی بلٹ پروف کاروں میں نہیں سنت نگر اور بھاٹی لوہاری کی بے ریا گلیوں میں رہتا تھا۔ اب یہ مشہور ٹھنڈی سڑک شاہوں کے عوام دشمن قافلوں اور ان کے محافظوں کے قہر سے زلزلاتی ہے۔ یہاں کی ازلی طور پر بد دل مخلوق چوہوں کی طرح بلوں میں گھسی ہے اس کے ہونٹ سلے ہیں۔ ''یہ سارے سوال مجھے ہی کیوں ستاتے ہیں'' یہ ساری اذیتیں، ساری لہو رنگ تصاویر میرے ہی لیے کیوں۔ یونس بلبلاتا ہے۔

ایک لمحہ پیچھے مُڑ کر دیکھو بھائی ہم من حیث القوم صدیوں سے سروں پر ریت اوڑھ کر بیٹھنے والے لوگ ہیں۔ سینکڑوں ہزاروں جنموں سے شاہی سواریوں کی راہوں میں آنکھیں بچھانے والے، سکندر اعظم، نادر شاہ، محمد بن قاسم، مغل، انگریز، ٹوانے، دولتانے، ملا، بھٹو، جرنیل، شریف، تم کیوں کڑھتے ہو۔ چھترول، بھوک یا ذلت ہماری روحوں کی خوراک ہے۔ تمہارے میرے جیسے ٹاویں ٹاویں لوگوں کے پاس صرف ایک ہی چارہ ہے۔ تم میری دیوارِ گریہ بنو اور میں تمہاری۔ اور آج ۲۰۱۵ء کے موسم بہار میں جب میرے پاس سر چھپانے کے لیے اپنی کوئی معمولی چھت ہی نہیں ہے اور میں جمشید دستی، رحمان ملک اور شہباز شریف کی تیز رفتار کاروں کے گھوکر سے خوفزدہ ہوں۔ مجھے اپنی اور اپنے خاندان کی محبّ الوطنی اور ایمانداری پر بے حد شرمندگی ہے۔ صفر بٹا صفر ہونے کا احساس ہے۔ بڑی بڑی ڈگریاں ہاتھوں میں تھامے میرے بچے مجھے سوالیہ نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ کیونکہ شاہی سواریوں اور ان کے محافظوں نے کوئی ایسا راستہ نہیں چھوڑا جہاں سے وہ گزر سکیں گے۔ باوقار زندگی جی سکیں گے۔

کنجری کے پُل کا راستہ بتا دیں بھائی صاحب۔۔۔؟ میں نے ایک بار پھر پاس کھڑے ایک سفید ریش مرد سے پوچھا۔ دیکھ نہیں سکتی خاتون یہ قافلہ قریش ہے۔ فساد کی خاطر میدانِ اُحد کی جانب رواں دواں ہے۔ میں خود ایک بے شناخت پرچھائیں ہوں۔ تمہیں کنجریوں یا ان کی خواہشوں میں جلنے والوں کے بارے میں کچھ نہیں بتا سکتا۔ وہ غصے سے بولا، صرف ایک بات کنجری پلوں کی رخ شاہی سواریاں خود کبھی نہیں جاتیں۔ رات کے اندھیروں میں اپنے شبستانوں میں حاضر ہونے کے احکام جاری کرتی ہیں۔ جب بھوکی ننگی قوم اپنی اپنی متعفن کھولیوں میں دفن ہو جائے۔ تھکے ہارے شکست خوردہ مرد اپنی مدقوق بیویوں کی کوکھ میں اپنے بدن الٹائیں تب شاہی سواریاں کنجریوں کے سجیلے اجسام پر اپنی ہوس برساتی ہیں۔ اپنی ایغو کی کلغی پھلاتی ہیں۔ سفید ریش مرد نے مجھے زہر بھرے لہجے میں کہا۔ میں بُری طرح بوکھلائی ہوئی تھی۔ گمشدہ بچے کی طرح میں نے بے سمتی میں چلنا شروع کر دیا پر ''شاید کوئی مددگار مل جائے، کوئی راستہ کھلنے لگے۔ میں ایک دم چونکی یہ تو وہی آواز تھی ''بچپن میں سنی ہوئی وہ انوکھا شخص ہر تیسرے چوتھے روز شیشے کی کھڑکی والا صندوق کمر پر لادے گلی میں آ کر ہوکے لگاتا تھا'' بارہ من کی دھوبن بھی دیکھو، نیولے اور سانپ کی لڑائی بھی دیکھو، موت کے کنوئیں میں سکوٹر چلانے والی میم کو دیکھو، مکہ مدینہ دیکھو' اور ہم سب بچے اپنے اپنے آنے دوانیاں مٹھی میں ڈال کر اس سنسنی خیز نظارے دکھانے والے کی طرف سرپٹ بھاگتے تھے۔ اور وہ صندوق کے پہلو میں نصب پھرکی گھما گھما کر ہم پر حیرتوں کے در وا کرتا تھا۔ اور یہ تو وہی تھا۔ ہجوم کی طرف دیکھ کر ہوکے لگانے والا۔ آواز بھی ویسا اور انداز بھی وہی۔ دکھاتا بھی، بتاتا بھی ہے اور ہٹیلی سجیلی بدن فروشوں کو خوفزدہ بھی کرتا ہے۔ وہ ان سے کھل کر کہتا ہے۔ ''صبا، زہرا، فیروزے، نگینہ تمہارے بدنوں کی قوسیں کساوٹیں محض موسم کا پھل ہیں۔ ان کی ادوائین ڈھیلی پڑتے ہی چودھری، وزیر، جرنیل، مولوی تو ایک طرف تبلے اولے استاد جی بھی کبھی مڑ کر نہ دیکھیں گے۔ گھنگھروؤں کی جھنکار اور تمہارے بدن کی شاعری کے ذریعے شعلہ طور کا نظارہ کرنے والے تمہیں دوزخ کا ایندھن قرار دیں گے۔ پھر وہ خطرے کی گھنٹی بجاتے بجاتے اچانک تلملانے لگتا ہے۔ بھرے بازار میں کھڑا ہو کر پوچھتا ہے۔ ان بکاؤ بدنوں پر وارے گئے مروارید کیا ہمارے گھروں کی لوٹ ہے؟ کیا میری بیٹی کا جہیز ہے؟ پھر اُس کے اندر کا فنکار بُری طرح تھک جاتا ہے۔ اس کے حروف کی اندرونی تہیں بکنے والی عورت سے الجھتی ہیں۔ اسے گھٹیا ثابت کرتی ہیں۔ تب وہ مجھ سے کہتا ہے بڑی بہن ''مائیکل اینجلو'' کے تراشے ہوئے عورت کے مجسمے تو صدر کلنٹن، بلھے شاہ، اکبر بادشاہ کو بھی سولی پر لٹکاتے تھے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ کلنٹن وائٹ ہاؤس میں مونیکا کے سجیلے بدن سے کھیل کے دوران بھی سوچتا ہے کہ امریکی عوام کی بہبود کی خاطر کس کس قوم کو فنا کرنا ہے۔ کس کس قوم کی رگوں سے خون کشید کر کے امریکی بچوں کے بدن میں انڈیلنا ہے۔ پر میرے مقتدر لوگ

تو صبا زادی کے بدن کے مساموں میں گُھل جانے کے لمحے بھی امریکی ڈالر کی جھنکار میں گم رہتے ہیں۔ یونس جاوید بطور تخلیق کار اپنے اندر کی بہت سی گرھوں اور تعصّبات سے مکتی حاصل کر چکا ہے۔ پھر بھی پدرسری نظام میں کسی بھی مرد کی مکمل مکتی ممکن ہیں۔ میں خود بھی وقت کی جکڑ سے آزاد نہیں ہوں۔ مجھے جدیدیت کے طوفان کا کوئی ادراک نہیں۔ بدن منڈیوں کی بھڑتی ہوئی مانگ ''ون نائٹ سٹینڈ'' کی بکری ''گڈ ٹائم'' کی گلوبل تشریح، قوم لوط کی نئی صورتِ حال۔۔۔ دُلہن بھی مرد اور ڈولی ڈال کر لے جانے والا بھی مرد۔ گناہ وثواب کے تیزی سے بدلتے حاشیے۔ جی ہاں! زندگی کی ریل کی کھڑکی میں بیٹھ کر منظر تو سارے ہی دیکھ لیے لیکن ''کنجری کا پُل'' ناول میں یونس جاوید کے قلم کا کیمرہ جب اچانک ماں جائے، بہن بھائی یا جنم دینے والے باپ اور بیٹی کے درمیان قائم ہونے والی جنسی تعلق پر زوم ان کرتا ہے تو میرا بوسیدہ وجود دوزخ کا ایندھن بن جاتا ہے۔ اپنے جیتے جاگتے بدن میں سے مردہ سور کی بدبو آنے لگتی ہے۔۔۔ جی چاہتا ہے وقت ایک دم اپنے منطقی انجام تک پہنچ جائے۔ زمین لاوا اگلنے لگے اور میں جل کر راکھ ہو جاؤں۔ اللہ اکبر! حالانکہ یہ ماننے پر بھی مجھے کوئی عار نہیں جنرل کاکڑ کی کمانڈر۔ ان۔ چیفی کے دوران جب عاصمہ جہانگیر ابھی مکمل اور بے لوث پاکستانی تھی میں کاکڑ کے ایک جرنیل صاحب کی Incest کہانی لے کر ان کے پاس گئی تھی مداوے کی خاطر تب مجھ میں سہہ جانے کی قوت ابھی باقی تھی۔

اب مجھے لگتا ہے۔ یونس کا قلم شدید غصے میں ہے۔ اُس کی کسی دل شکستہ محبوبہ نے اس کے قلم پر کالا جادو کر دیا ہے۔ رشتوں کی تقدیس پر خون تھوکنا اس کی شخصیت کا حصہ نہیں ہے۔ پسماندہ اقدار کے مالک سماج میں ایک مڈل کلاس عورت ہوں۔ خونی رشتوں کی بے حرمتی برداشت کرنا میرے بس میں نہیں۔ پر یہ بھی مکمل سچ ہے کہ ''کنجری کا پُل'' ایک رسیلا، چمکیلا اور بسنتی ناول ہے۔ ہزار داستانیں یونس جاوید اپنی صندوقچی کے ڈھکن پر دیکھنے والا شیشہ نصب کیے گلی میں ہو کے لگا رہا ہے۔

''چودھری اور وزیر کی سیج پر سجے حوّا کی بیٹیوں کے بکاؤ بدن دیکھو''

''اپنے گھروں کی لوٹ کا ذمہ دار مافیا بھی دیکھو''

''سر بازار انصاف کی بے حرمتی دیکھو''

''ننھی معصوم بچی کا ریپ اور قتل بھی دیکھو''

''بھوک، افلاس، اندھیرا، بیماری کی پس چلمن رنگینیاں اور ہجوم کی بزدلی دیکھو''

اگر آپ نے اس کی پکار سن لی تو اکنی، دونی جیب میں ڈال کر اس کی طرف بھاگئے کہیں وہ اپنا ''انٹرٹینمنٹ'' صندوق لے کر واپس نہ پدھار جائے۔

- بقیہ -

''جوگی''

''باقی بچے بریگیڈیر عاطف اور عبدالمجید بھٹی'' میں سوال وجواب سے اکتا رہا تھا۔۔۔ ''نہیں نہیں نہیں'' میرے انکار نے مجھے طاقت دے دی میں کسی کو نہیں چھوڑ سکتا ابھی تو دوستی ہوئی ہے ان سے۔۔۔ میں نے انہیں بہت زاویوں سے سمجھا ہے پرکھا ہے۔ بہت سی باتوں نے مجھے باخبر بنا دیا ہے۔۔۔ باخبر ہونا سب کا حق ہے ان میں اکثر لوگ بڑے بلکہ بہت بڑے تھے۔ شہاب کے خاکے ''پیرومرشد'' سے تو احمد بشیر کی گاڑھی گالیوں کی تصدیق ہوئی۔ جس کا میں خود راوی ہوں۔ میجر اسحاق کے پنڈی سازش کیس اور کشمیر کے حوالے سے ہمارے شروع کی حکومتوں کی پالیسیوں کی تصویریں۔۔۔ ایک شہادت ہیں۔ ایسی تاریخ کی شہادت جو سامنے ہونے کے باوجود اوجھل ہے۔ واقعی ایک نہیں۔۔۔ یہاں کئی شہادتیں ہیں۔۔۔ جو سند کا درجہ رکھتی ہیں جو ہمارے مورخ کے لیے سیاسی یا ادبی تاریخ مرتب کرتے وقت مددگار ہو سکتی ہیں۔ یہ ہیرے جواہرات ہیں۔ جواہر پارے ہیں۔ جو لگ بھگ آدھی صدی پر محیط رسائل واخبارات میں پڑے کرم خوردگی کا شکار ہونے کو تھے کہ میں نے انہیں چن لیا اس لیے کہ تخلیقی سطح کے یہ جواہر پارے اپنی تکمیل چاہتے تھے۔

دوستو۔۔۔ احمد بشیر نے میرے لیے، آپ کے لیے، اس وطن کے لیے۔۔۔ سب کے لیے اتنا کچھ کہا، سنا، اور لکھا ہے کہ مجھے اس کے لیے تھوڑی سی خدمت کرتے ہوئے مسرت ہو رہی ہے ایسی مسرت جو کسی تخلیقی کاوش کے بعد نصیب ہوتی ہے۔

<u>حواشی</u>

ا۔ ٹلہ جوگیاں جہلم کے قریب ایک چھوٹی سی پہاڑی پر ایک ڈیرہ ہے جس میں اب الو بولتے ہیں۔

۲۔ احمد بشیر کے لیے احترام کا تقاضا تو یہی تھا کہ میں ان کا ذکر ہر جگہ صیغہ جمع میں ہی کرتا مگر جانے کیوں قلم سے کہیں ان کے لیے ''اس'' اور کہیں ''ان'' نکلا اور میں نے اصلاح کی ضرورت نہیں سمجھی۔ (یونس جاوید)

روایت کا باغی

آغا گل

(کوئٹہ)

بہت سے بے رحم تخلیق کاروں میں یونس جاوید بھی شامل ہے۔ دوا بھی ایک مقررہ مقدار میں دی جاتی ہے، اس کا فیصلہ بھی طبعی ماہر ہی کرتا ہے، زیادہ روشنی آنکھوں کو خیرہ کرتی ہے اور زیادہ سچ انسان کو مار ہی ڈالتا ہے۔ اس کے عقیدے متزلزل ہو جاتے ہیں، وہ بکھر جاتا ہے اور عقیدوں کی افیون چاٹنے والا قاری دین کا رہتا ہے نہ ہی دنیا کا۔ یونس جاوید جیسے قلم کار جب علمی لاٹھی چارج کرتے ہیں تو سارے بُت توڑتے چلے جاتے ہیں۔ جس کے باعث عقیدوں کے پجاری مارے جاتے ہیں۔ یونس جاوید کا ناول ''کنجری کا پُل'' دیکھ کر مجھے منٹو کا خیال آیا۔ وہ اپنے افسانوں کا نام پنجابی فلموں والے رکھتا تھا، سنسنی خیز، چونکا دینے والے، کالی شلوار، کھول دو، سرکنڈوں کے پیچھے، ٹھنڈا گوشت، گنجے فرشتے۔ لیکن درہ بولان میں بھی ''رنڈی کا پُل'' تھا جو کسی رنڈی نے تو خیر نہیں انگریز انجینئر نے ڈیزائن کیا تھا مگر وہ اس قدر بے ڈھنگا پل تھا کہ بھاری بھرکم ٹرک گزرانا کارِ محال تھا۔ جس کے باعث ڈرائیور یہ نام اُگل دیا کرتے۔ رنڈی یوں بھی تکلیف دہ اذیت ناک زندگی اور یوٹوپیا کے درمیان ایک پُل کا کام دیتی ہے، کسی نامعلوم طاقت کے ذریعے وہ گاہک کا رنج و غم کشید کر لیتی ہے۔

فوج اور چکلا دنیا کے قدیم ترین ادارے ہیں۔ فوج کشی اور جنگوں کے باعث چکلے وجود میں آتے ہیں۔ فوج چکلے پر موٹ کرتی ہے۔ محاذ جنگ کے عقب میں یہ ادارے جرنیلوں کی سرپرستی میں قائم رہتے ہیں۔ یونس جاوید نے تو طوائفوں کی کہانی میں، ان کے مکالموں میں وہ وہ سبھی کچھ کہہ ڈالا جو مقالے یا مضمون کی صورت (Format) میں لکھتے تو انہیں Office of Inquisition میں طلب کیے بغیر ہی سزا سنا دی جاتی۔ یوں تو طوائفوں کا ذکر قدیم الہامی کتابوں میں بھی ملتا ہے مگر عمومی طور پر ان سے نفرت کی جاتی ہے۔ کہیں بیسویں صدی کے آخر میں انہیں Sex Worker کے نام سے Labour اور مزدور قرار دیا گیا حالانکہ ان کی مزدوری ابتدا سے ہی Laborious ہے۔ یونس جاوید چونکہ ڈراما نگار ہیں، منظر کشی، جزئیات نگاری ان کی تحریر کا خاص حسن ہے، بیانیہ ناول میں وہ ڈرامے والی دل کشی بھر دیتے ہیں اور یہ سب کچھ وہ غیر ارادی طور پر کرتے ہیں۔ Treatment of Story کمال کی ہے۔ درباری قصیدوں کی مانند تشبیب سے آغاز کرتے ہوئے مذمت یا مدح تک یوں قاری کو ساتھ لیے چلتے ہیں جیسے دریائے ہنگول کی روانی۔ ان کے Strokes بلیڈ کی مانند کاٹے ڈالتے ہیں۔ عہد حاضر میں یہ فن ڈاکٹر شیر شاہ سیّد کے افسانوں میں ہی دکھائی دیتا ہے جبکہ یونس جاوید قدرے زیادہ خون آشام دیوتا ہیں۔ گرز مارتے ہوئے عقیدوں کے بت بھی پاش پاش کر ڈالتے ہیں۔ ان کے پاس اس قدر وسیع ذخیرہ الفاظ ہے ایسی سپیچ (Vocabulary) نظیر اکبر آبادی اور رتن ناتھ سرشار کے بعد قرۃ العین کی تخلیقات میں جھلکتی ہے۔ یوں لگتا ہے کہ اس بازار کی Lexicon یونس جاوید نے سمجھ رکھی ہے۔ یونس جاوید نے عمیق مشاہدہ کیا ورنہ ایک آنچ کی کسر رہ جاتی۔ افریقہ کے جنگلوں میں پلنے والا ٹارزن ایڈگر رائس بروز نے لندن میں بیٹھ کے لکھ مارا تھا جبکہ یونس جاوید نے لگتا ہے کہ اس بازار کی خاصی کوچہ گردی کی ہے۔ ورنہ اتنے اعتماد کے ساتھ ایسی جزئیات نگاری خاصا دشوار مرحلہ ہے۔ اس کوچہ و بازار کے ذکر سے بھی احتراز کیا جاتا ہے۔ طوائفوں کا انداز نشست و برخاست، اسلوب گفتگو، لفظوں کا انتخاب، مدعا بیان کر ڈالنا کچھ آسان نہ تھا۔ منٹو کی وہاں تک رسائی نہ ہو سکی تھی، وہ نکیائیوں سے آگے نہ بڑھ پایا جو دو چار روپے میں بک ہو کر تانگوں میں جایا کرتی تھیں۔ آج کی زبان میں Sex Labour سے شائستگی حاصل کرنے کے لیے نوابین (Elite) آدابِ نشست و برخاست سیکھنے کے لیے طوائفوں کے ہاں جایا کرتے تھے۔ بیسویں صدی کے پہلے پچیس برس تک یہ سلسلہ تعلیم و تربیت زعما میں جاری رہا جس کے دیرپا ثمرات ہماری Ruling Class میں اب تک موجود ہیں۔ مرزا ہادی رسوا کے بعد یونس جاوید نے سنجیدگی اور متانت سے طوائف کو موضوع بنایا۔ مرزا ہادی رسوا کو حقیقی امراؤ جان ادا ملی۔ لہٰذا ناول لکھنے میں آسانی رہی جبکہ یونس جاوید کی فیروزے، صبا زادی، ظہرہ مشتاق سبھی تخیلاتی ہیں۔ یہ چند عورتوں کی کہانی نہیں بلکہ ایک تہذیب، ایک سماج کی کہانی ہے۔ منافقت کی بنیاد پہ کھڑے سماج کا نوحہ ہے۔ اس ناول میں بلوچستان کے قتل عام سے لے کر خاکسار شہیدوں تک کا ذکر ہے۔ ۳۱۳ مجاہدوں کے قتل عام پر آگ لگ گئی جس کے شعلوں کو سرد کرنے کے لیے مسلم لیگ کو استعمال کیا گیا جس نے اپنے رہنماؤں کے حکم پر لاہور میں فوراً ۲۳ مارچ کو ایک جلسلہ عام منعقد کرتے ہوئے قراردادِ مقاصد کی راہ دکھائی اور سبھی اس قتل عام کو بھول بیٹھے۔ عوام کی یادداشت یوں بھی کمزور ہوا کرتی ہے۔ یونس جاوید نے ناگفتنی باتیں بھی حسین پیرائیہ میں بیان کر ڈالیں۔ اگرچہ اس نے نئی Conotaions دیں۔ مگر مبہم اور دور از کار علامتوں کا سہارا نہ لیا جو کچھ کہنا چاہا دھڑلے سے کہہ ڈالا۔ ریت کو بطورِ خاص علامتی طور پر کئی ایک مواقع پر استعمال کیا۔ ظہرہ مشتاق اور بابا عطار کی گفتگو تو شاہکار ہے۔ اس مکالمے میں بابا عطار کی مکاری اور ظہرہ مشتاق کی فراست، الفاظ کا برمحل استعمال قابلِ تعریف ہے۔ وہ قابلِ گرفت الفاظ استعمال نہیں کرتی جو فراست کی دلیل ہے۔ یونس جاوید اپنے کرداروں کے ساتھ خود بھی Lynching کرنے لگتے ہیں۔ یہ انداز ڈپٹی نذیر احمد کا بھی تھا۔ ناپسندیدہ کرداروں کو بدانجام سے ہمکنار کرتے۔ جبکہ یونس جاوید نے ایسے جوڑوں کو Incest کی بھٹی میں جھونک دیا۔ بہنوں بھائیوں کو Incestum سے داغدار کر دیا تاکہ ان کی روح بھی چین یا مکتی نہ پا سکے۔

ناول کی تکنیک دیکھتے ہوئے اس پر ایک طویل ڈرامے کا گمان ہوتا

ہے۔ ناول کا روایتی طور پر ایک Logical End ہوا کرتا ہے جبکہ ''کنجری کا پُل'' میں ہئیت کے لحاظ سے افسانے والا انداز ہے، کہانی رفتہ رفتہ آگے بڑھتے ہوئے قاری کو یاد دلاتی ہے کہ پندرہ بیس لاکھ برس قبل ظہور پانے والی یہ مخلوق جو سیدھا چلنے کے سبب اب تو Homo Sapiem کہلاتی ہے بنیادی جبلی عادتوں سے چھٹکارا نہیں پا سکی اس کا نظام انہضام بھی نہیں بدلا۔ جنس، بھوک اور پیاس بدستور اس کی بنیادی جبلتیں ہیں۔ قدیم Village Magicians نے پیروں کا روپ دھار لیا۔ ڈیلفی کے مندر کے بجائے وہ پیر خانہ میں خواتین کو تجبہ گیری پر راغب کرتے ہیں۔ یہ ناول خصوصی طور پر نظریات پر بحث کرتا ہے جس کے زمرے میں تاریخ، سیاست، ریاست اور Feed Back کی ریت دیوار پر قائم عقیدے بھی شامل ہیں۔ یونس جاوید کو کسی سے خوف نہیں آیا۔ اس نے مختلف Pressure Groups کو ننگا کر کے رکھ دیا۔ اس نے بہن بھائی اور باپ بیٹی کو ٹکرا دیا۔ ایسے میں وہ کچھ بنیادی عقائد کا پرچارک دکھائی دیتا ہے جو کیتھولک نظریات سے متاثر ہو کر جنس کو بھی گنہ قرار دیتے ہوئے ایسے انسانوں کو اذیت ناک کچوکے لگانا چاہتا ہے۔ تاہم ایسے Wider Spectrum کے لیے وسیع معلومات، ثقافت، تہذیب، معیشت اور سائیکی پر گہری نظر بھی لازم و ملزوم ہے۔ یونس جاوید جیسے ناول نگار زبان کو وسعت دیتے ہیں۔ اس نے حسبِ ضرورت اظہار کے لیے عربی، فارسی، انگریزی اور پنجابی سے لفظ منتخب کیے اور خوبصورتی سے انہیں برتا۔ اس نے نئی تراکیب بھی متعارف کرائیں اور حسین انداز بھی اختیار کیے جیسے ''چاندر تبے جیسے لحات کا حسین عرصہ'' یا ''میں ان کی رسیلی موت ہوں'' اور کیفیات کے لیے ''اندر باہر اترتی ریت''۔

بائبل مقدس کے قول گناہ کی مزدوری موت ہے کے مصداق اس نے گنہ گاروں کو کوہلو میں پلوا دیا۔ مہر النساء اور حسین کے جنسی روابط جو حقیقی بھائی بہن تھے۔ کاشف اور صبا زادی کی وہ رات جس کا داغ دھونے کے لیے صبا زادی ہوٹل کی بلندی سے باہر کود پڑی۔ ظہرہ مشتاق سے بابا عطار کی جنسی طلب اور ناکامی کی صورت میں وہ پیر سے انسان بنا اور اس کے بعد Hyaena بن گیا۔ اس Nocturnal Carnivonous نے زہرہ مشتاق کو چباڈالا۔

اس ناول کو سمجھنے کے لیے ایک عرصہ درکار ہے۔ یہ کئی ایک پرت کا ناول ہے۔ اردو ادب میں ایسا اظہار یہ کم ملتا ہے، کبھی اخلاقیات کی دھجیاں بکھرتی ہیں تو کہیں انسانی سائیکی پہ بحث ہوتی ہے، کسی موقع پر صوفی ازم کا پردہ چاک ہوتا ہے۔ وطنِ عزیز کا دو قومی نظریہ پوری قوت سے بولتا ہے۔ بلا دکار اور بکنے والی عورتیں، لوٹنے والے Urban Elite اور لٹنے والے انسان۔ جوتے کھانے والے عوام اور جوتے مارنے والے امراء، یہ ناول دو قومی نظریے کا مکمل ثبوت ہے۔ واقعی یہاں دو قومیں ہی بستی ہیں اور یونس جاوید نے ان دونوں قوموں کو مکمل نمائندگی دی ہے، دونوں کا سچا نقشہ کھینچا، مکمل عکاسی کی ہے۔ اس نے یہ بھی واضح کر دیا کہ دونوں قوموں کے پاس کوئی نظریہ حیات نہیں ہے۔ جنسی آسودگی اور ایک پرتعیش زندگی کا خواب دیکھنے کے علاوہ ان کے ہاں کوئی بڑا مقصد نہیں ہے جس کی جیب میں تصویر والے کاغذ ہوں وہ قتل بھی کر سکتا ہے۔ جسموں کے سودے بھی کر سکتا ہے اور روحانیت کا لبادہ اوڑھ کر Super Man بھی بن سکتا ہے۔ کنجری کا پُل ایک بڑا ناول ہے مگر جہاں شرح تعلیم زکوٰۃ کی مانند ڈھائی فیصد ہو وہاں ایسے ناول کو پڑھنے والے کم کم ہیں۔ ورنہ اس کا شمار Uncle Toms Cabin یا Roots جیسے ناول کے ساتھ ہوتا جنہوں نے انسانی ذہنوں کو ہلا کے رکھ دیا۔ سوچ کے دھارے بدل دیئے، اندازِ فکر بدل ڈالا۔ یہ ایک انقلابی ناول ہے جبکہ یونس جاوید ایک باغی ہے جس نے قدیم فصیلیں توڑ ڈالیں۔

اشرف جاوید

(لاہور)

سب آشنا ہیں دانے سے، پانی سے، جال سے
ہاتھ آئیں گے پرندے کسی اور چال سے
رسنے لگا لہو مری چشمِ گلال سے
بھرتا نہیں یہ زخم کسی اِندمال سے
بے جا تکلفات کی عادت نہیں رہی
کچھ اور ٹوٹ جاتا ہوں میں دیکھ بھال سے
لگتا ہے درد جائے گا اب زندگی کے ساتھ!
تنگ آ چکے ہیں چارہ گر اِس کی سنبھال سے
مہرِ مکالمات سے پگھلے گی برف بھی
موسم کہاں بدلتا ہے جنگ و جدال سے
یعنی کوئی دراڑ ہے اب کے دلوں کے بیچ!
آئینے میں لکیر کھنچی آئی بال سے
جانے کہاں یہ کُہر چھٹے، شب کہاں کٹے !
لا حاصلی محیط ہوئی ماہ و سال سے
اعصاب شَل ہوئے ہیں، مرے خواب شَل ہوئے
خالی پڑا ہے کیسۂ لذت وصال سے
دستِ طمع سمیٹ کے رکھا تمام عمر !
پاسِ اَنا عزیز رہا عرضِ حال سے

○

دل کا جانا ٹھہر گیا ہے!

غلام حسین ساجد
(لاہور)

یونس جاوید کے ناولٹ ''دل کا دروازہ کھلا ہے'' کو میں نے ایک سے زیادہ دفعہ پڑھا ہے مگر اس کے بارے میں گفتگو کرنے میں، میری ہچکچاہٹ ابھی تک دُور نہیں ہوئی۔ اس جھجک اور اس عارضی زبان بندی کی بنیادی وجہ اس ناولٹ کا اسلوب ہے اور ضمنی وجہ اس ناولٹ کی کتھا اور کردار۔

دراصل اپنی کُنہ میں یہ ناولٹ کچھ کچھ سہل ممتنع کی شاعری جیسا ہے۔ بظاہر زبان و بیان میں وضاحت او رُاستادی کے تاثر سے پاک مگر اپنے باطن میں کئی رمز اور بھید لیے۔ اس طرح کی تحریر کو اپنی خوشبو بانٹنے اور اپنی مہک پھیلانے کے لیے کسی طرح کی توضیح کی ضرورت نہیں ہوتی۔ جیسے عطر خود بولتا ہے نہ کہ عطّار۔ یہ ناولٹ بھی خوشبو سے بھرا ایک جھونکا ہی ہے مگر اس اختصاص کے ساتھ کہ اس جھونکے کا بنیادی جوہر اس کی لطافت ہے ورنہ شدّت سے بھری ہوا اور اپنی تاثیر میں بوجھل خوشبو کسے خوش آ سکتی ہے۔ ''دل کا دروازہ کھلا ہے'' کے دل پسند ہونے کا بنیادی سبب یہ ہے کہ یہ کتاب اپنی پہلی سطر سے آخری سطر تک ایک ایسی لطیف مگر سریع الاثر خوشبو سے لبریز ہے جس میں کہیں کہیں زہر کی تاثیر بھی ہے۔

اس ناولٹ کا مرکزی کردار صفدر ہے، جس کے مقدّر میں روزِ اوّل سے صرف ہارنا ہے۔ ناولٹ کے آغاز میں وہ پہلی محبت کا زخم کھا کر اپنی رضا اور ارادے کے بغیر، ایک نرس کی خصوصی توجہ اور ضد کے باعث، سینی ٹوریم سے صحت یاب ہو کر اپنے گھر پلٹتا ہے اور ناولٹ کے اختتام پر وہ دوسری محبت کے وار سے گھائل ہو کر سینی ٹوریم گئے بغیر موت کو گلے لگا لیتا ہے۔ بادی النظر میں دیکھا جائے تو اس ناولٹ کا مرکزی کردار موت ہی ہے جو دل کے کھُلے دروازے سے کبھی آ کر جاتی اور کبھی جا کر پلٹتی دکھائی دیتی ہے اور اپنے اصل روپ کو ناقابلِ شناخت بنانے کے لیے ناولٹ کے مختلف کرداروں کے کھوٹے پہنتی رہتی ہے۔

انگریزی زبان کی ایک ترکیب ''Hardily terrible'' ہے۔ جس کا ترجمہ ہمارے ایک دانشور دوست نے ''بمشکل خوفناک'' کیا تھا۔ چلئے یہ ترجمہ کسی حد تک سوقیانہ سہی مگر یہ ترکیب اس ناولٹ ''دل کا دروازہ کھلا ہے'' کے اسلوب کو سمجھنے میں کافی مددگار ہو سکتی ہے۔ دراصل یہ ترکیب ناممکنات کو چھوتے ہوئے امکان کی خبر دیتی ہے۔ ''دل کا دروازہ کھلا ہے'' کا اسلوب بھی اسی نوعیت کا ایک تجربہ ہے۔ اس اسلوب کا بنیادی وصف سادگی ہے جو استعارے، علامت، زبان و بیان کی پیچیدہ ہم آہنگی، ماورائیت اور عجوبہ تجربات سے پاک ہے۔ پھر بھی وہ اپنے باطن میں گہری رمز لیے اور بیسیوں بھید چھپائے ہوئے ہے جو زندگی کے متعدد پہلوؤں اور مرحلوں کی خبر دیتے ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ محبت اپنی اصل میں موت ہی کا دوسرا نام ہے۔ جادوئی حقیقت نگاری (Magic Realism) کی اصطلاح غالباً اسی طرح کے اسلوب کے لیے برتی جاتی ہے۔ سو یہ ناولٹ جادوئی حقیقت نگاری کا ایک دلکش نمونہ ہے۔

یونس جاوید ہمارے بڑے لکھنے والوں میں سے ایک ہیں۔ اتنی دیر تک لکھتے رہنا، اُن کے حادثاتی ادیب نہ ہونے اور اتنی آسانی اور سادگی سے اپنے قاری کو زندگی کی اتنی ساری تلخ حقیقتوں کے روبرو لا کھڑا کرنا، اُن کے گُنی اور ماہرِ فن ہونے کا ثبوت ہے۔ فنونِ لطیفہ سے وابستہ کسی بھی شعبے میں قدم جمانے کی پہلی شرط ریاضت ہے۔ مسلسل اور بے آرام ریاضت۔ اس کے بغیر تاروں سے الوہی سُر پھوٹتے ہیں نہ لفظوں سے غیر مرئی حقیقتیں۔ ایسی حقیقتیں جن کی بنیاد جذبوں پر ہے مگر جن کی جڑیں وجود میں کہیں زندگی سے جُڑے ریشوں میں پنپتی رہتی ہیں اور لمس بن کر بدن کے ایک ایک مسام کو انگیخت کرتی ہیں۔ کبھی زندگی کی طرف کھینچ لانے کو اور کبھی موت کی طرف پسپا کرنے کو۔

اس ناولٹ میں صفدر کا کردار ایک ایسی ہی کش مکش کی خبر دیتا ہے۔ وہ اپنی کُنہ میں دیوتا بھی ہے اور اَسُر بھی، مہاتما بھی ہے اور شیطان بھی۔ اُس نے تیاگ کو ڈنڈ اور کرم کو سزا کے ساتھ جوڑ دیا ہے اور اس طرح اپنے ایک عام آدمی ہونے کی خبر دی ہے۔ تپ دق کے آخری مرحلے پر اپنے پیئے ہوئے پانی کو صراحی میں واپسی انڈیل کر اور اس عمل کو مسلسل پندرہ دن جاری رکھ کر۔ رضیہ کی سانسوں میں اپنے جراثیم زدہ سانسوں کو شامل کر کے اور اس عمل کو جاوید کے لیے دُہرا کر اُس نے وہی کیا ہے جو ایک عام آدمی کو کرنا چاہیے یہ شاید ہمیں کچھ عجیب لگے مگر اس کا سبب صرف یہ ہوگا کہ ہمارے ادیبوں نے ہمیں فکشن میں عام آدمی سے ملانے کی کبھی کوشش ہی نہیں کی۔ ہم اپنے ناولوں میں دیوتاؤں سے ملتے ہیں یا شیطانوں سے۔ اور اسی لیے ہمارے ناول مثالی کرداروں کی بُہتات سے بُو دینے لگے ہیں۔ یونس جاوید کا یہ ناولٹ کم از کم بُو دینے کی اس علّت سے پاک ہے کیونکہ اس ناولٹ کے کردار حقیقی بھی ہیں اور علامتی بھی اور ہمارے عہد کے دوغلے پن اور باطنی رذالت کے نمائندہ بھی۔ اسی لیے مرے نزدیک اس ناول کو پسند کرنے کے تو بہت سے اسباب ہو سکتے ہیں مگر ناپسند کرنے کی غالباً کوئی وجہ نہیں ہو سکتی۔

مگر یہ ہم نے ایسی تحریروں کو پسند اور ناپسند کرنے کی کسوٹی سے کیوں جوڑ رکھا ہے؟ خصوصاً جب صاحبِ تحریر نے اس طرح کی کسی آرزو کا عندیہ تک نہ دیا ہو۔ کیا ہمارے دماغ میں کہیں یہ بات تو جڑ نہیں پکڑ چکی کہ ہم جو پڑھیں، وہ ہمیں پسند بھی آئے۔ اگر ایسا ہے تو یہ بحیثیت قاری ہمارے خام ہونے کی دلیل ہے۔ کیوں کہ اعلیٰ درجے کی تحریریں عموماً پہلی قرأت میں ناپسندیدہ ہوتی ہیں۔ کیوں کہ ان کے رموز و علائم اور ان کے باطن میں چھپی صداقتیں بہت دیر سے اور

بہت دھیرے سے اپنا پتا دیتی ہیں۔ دور سے آتی ہوئی آواز کی طرح، باہر سے اندر پھیلتی ہوئی خوشبو کی طرح۔ ''دل کا دروازہ کھُلا ہے'' کا ایک وصف یہ بھی ہے کہ اپنے ظاہر میں یہ تحریر جس قدر سادہ ہے، اپنے باطن میں اتنی ہی تہ دار اور گنجلک ہے۔ اس لیے میں نے اس تاثر کے آغاز میں اسے سہلِ ممتنع کی شاعری سے مشابہ قرار دیا تھا۔ ایسی شاعری جسے محسوس تو کیا جاسکتا ہے مگر چھو کر دیکھنا ممکن نہیں ہوسکتا۔

میں یہاں اس ناولٹ کے کرداروں کا نفسیاتی تجزیہ کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔ صفدر کے کردار کی پیچیدگی، سلطانہ بیگم اور خالہ امّاں کے کرداروں کی عمومیت اور رضیہ اور جاوید کے کرداروں کی منافقت۔ کچھ بھی تو ایسا نہیں جو کسی پیچیدہ تجزیے کا محتاج ہو۔ جس طرح مشروبات اپنے پہلے قطرے سے آخری قطرے تک ایک ہی ذائقہ کے امین ہوتے ہیں۔ اسی طرح یہ سب کردار بھی یک رُخے اور عمومی ہیں اور اسی لیے یہ ہماری عمومی دنیا کے بدلتے ہوئے باطن کے ساتھ ساتھ بدلتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ حقیقی کردار وہی ہوتے ہیں جو ارتقا پذیر رہتے ہوں۔ اس لحاظ سے یہ سبھی کردار حقیقی ہیں اور ان سے مُجوی زندگی اور ماحول بھی۔ یوں ''دل کا دروازہ کھُلا ہے'' ایک حقیقت پسند ناولٹ ہے جو حقیقت پسند لوگوں کے لیے لکھا گیا ہے۔

''دل کا دروازہ کھُلا ہے'' ایک بیانیہ ناولٹ ہے۔ یہ کوئی نئی بات نہیں کہ دُنیا بھر میں لکھے جانے والے ننانوے فیصد ناول بیانیہ ہی ہوتے ہیں۔ اس ناولٹ کی نئی بات ہے، اس بیانیے اور قاری کی سماعت کو یک جا کرنا۔ سبھی جانتے ہیں کہ ہم کسی تحریر کو پڑھتے ہوئے اپنے باطن میں اُن لفظوں کو سماعت کر رہے ہوتے ہیں جن سے وہ تحریر معرضِ وجود میں آئی ہو۔ مگر عموماً ایسا ہو نہیں پاتا یا اگر ہو پاتا ہے تو بہت کم کم۔ وجہ اس ثقلِ سماعت کی یہ ہوتی ہے کہ وہ تحریر ہمیں اپنے ساتھ لے کر چلنے سے منکر ہوتی ہے۔ مثلاً فلسفے کی کتاب یا کسی فلسفیانہ ناول کا سامع ہر کوئی نہیں ہوسکتا اور بعض اوقات تو عجزِ بیان کے باعث بہت سی عامیانہ تحریریں بھی اپنے قاری کی سماعت پر اثر انداز نہیں ہو پاتیں۔ اس تناظر میں ''دل کا دروازہ کھُلا ہے'' سماعت کو بہت سہولت، شگفتگی اور آسودگی کے ساتھ چھونے والی کتاب ہے اور یہ توفیق ہر کسی کو نصیب نہیں ہوتی۔

مجھے کہنے دیجیے کہ یونس جاوید ایک حسّاس منصف ہیں۔ اُن کی یہ حسّاسیت کئی پرتیں رکھتی ہے۔ اس کی ایک سطح اپنی تحریر کو سادہ و پُرکار رکھنا ہے تو دوسری سطح اُس میں قاری کی سماعت کو شامل کرنے کی ہے۔ ایک اور پرت کرداروں اور ماحول کے باطن کی نقش گری کرنا ہے اور اس پر مستزاد یہ کہ وہ زبان کی سطح پر ابلاغ کی مکمل ترین سطح کو چھوتے دکھائی دیتے ہیں۔ آپ اس کتاب کو مزہ لینے کے لیے تو دوبارہ پڑھ سکتے ہیں مگر سر سے گزر جانے کی معذوری کے باعث نہیں۔ یہ کام دیکھنے میں آسان مگر کرنے میں بہت مشکل ہے۔ یونس جاوید ایک مشکل پسند ادیب ہیں مگر اُن کی تفہیم میں سب سے بڑی دشواری یہ ہے کہ وہ اپنے قاری کو اتنے ہی سہل پسند دکھائی دیتے ہیں۔

یونس جاوید ادب کے ڈاکٹر ہیں اور میں محض ایک ''ادبی مریض''۔ میرا یہ منصب نہیں کہ میں اُن کی یہ کتاب لوگوں کے مطالعے کے لیے نسخوں میں تجویز کرتا پھروں۔ پھر بھی میں یہ ضرور کہوں گا کہ اسے ایک بار پڑھ لینے میں کوئی حرج نہیں کیوں کہ اسے پڑھ کر آپ کو منصف کی جادو بیانی اور کم نُما مہارت پر رشک آئے گا اور انشاءاللہ یہ کیفیت اسے بارِ دگر پڑھنے کے بعد بھی برقرار رہے گی۔

مہندر پرتاپ چاند

(انبالہ، بھارت)

چاؔند! کون آیا؟ مجھے مجھ سے چُرا کر لے گیا
کر گیا دیوانہ، عقل و ہوش اُڑا کر لے گیا!

کس کو راس آئی دیارِ حُسن کی آب وہوا؟
اس نگر سے کب کوئی سَر کو بچا کر لے گیا؟

عقل تو تلقین کرتی رہ گئی، لیکن ہمیں
دل ہمارا پھر اُسی دَر پر اُٹھا کر لے گیا!

سٹپٹاتی، سر پٹکتی رہ گئی تتھی کلی
مَن چلا بھنورا مگر خوشبو چُرا کر لے گیا!

لازماً کچھ تو کمی ہوگی مرے اخلاص میں
ورنہ اِک اِک یار کیوں دامن چھڑا کر لے گیا؟

اہلِ محفل بس تماشا دیکھتے ہی رہ گئے
اور دیوانہ سبھی جلوے چُرا کر لے گیا!

شہرِ دل میں بَس رہی تھیں چاؔند! کیا کیا صورتیں
وقت کا دریا مگر سب کچھ بہا کر لے گیا!

○

منتخب افسانہ

سوا نیزے پہ سورج

یونس جاوید

''میں نے اس طرح ضد کی تھی۔۔۔ بھلا کس طرح؟ بالکل تمہاری طرح! ہوں ناں ضدی۔۔۔؟ نتیجہ کینال ویو میں شفٹ ہو گئے ہم۔ یہ تمہارا بھی خواب تھا اور میں نے تو تمہیں پسند ہی کیا تھا کہ تم میرے خواب چرا لیتے تھے۔ تمہارے لوٹنے سے پہلے کتنا ضروری تھا کہ نہر کے کنارے بھیگی بستی میں ایسی ہی انیکسی والی کوٹھی ہو اور ہماری ہو جس کے بڑے حصے میں ماما پپا اور چھوٹی بہن رہتے ہوں اور انیکسی میری، تمہاری اور اپنی کی ہو۔ الگ بھی رہیں ساتھ بھی۔ یہی چاہتے تھے ناتم؟ سو آؤ گے تو محسوس کرو گے کتنی فرحت ہوتی ہے شام اترنے پر۔ ہاں واقعی شام کے ساتھ ہی خنکی اترتی ہے اور میں اپنی کو تھپکتے ہوئے، سب کے درمیان ہوتے ہوئے تنہا ہوتی ہوں۔ مگر اس تنہائی میں بھی تم ہوتے ہو۔ تمہارے آنے کے وقفے میں ایک دن کی کمی میرے اندر کیسا تہلکہ مچاتی ہے۔ جس کے لیے میرے پاس تو لفظ ہیں نہیں۔ تم مرد لوگ محسوس کرنا کیا جانو۔ یہ محسوساتی مسرتیں صرف مجھ ایسی انتظار کرنے والی روحوں کے نصیب میں ہوتی ہیں۔ میرا معمول ہے میں، اپنی اور اپنی کا ڈوگی ''بنٹی'' شام اور خنکی کے ساتھ اپنے درمیان والے کمرے میں آ جاتے ہیں۔ اگر اپنی جاگ رہی ہو تو میں تمہاری ''بک بک'' والا ٹیپ چلا دیتی ہوں جس میں تم نے بحث کی تھی اور اس کے بعد گانا گایا تھا۔ اپنی سنتی ہے۔ مسکراتی ہے۔ جیسے تمہاری آواز سے مانوس ہو رہی ہو۔ حالانکہ اسے کسی نے نہیں بتایا کہ یہ اس کے پپا کی آواز ہے۔ مگر وہ اس آواز سے خوشی کشید کرتی ہے۔ کیا بچوں میں الہامی کیفیات ہوتی ہیں؟

میں بار بار تمہارا گانا ری وائنڈ کرتی ہوں اپنی سنتے سنتے اونگھنے لگتی ہے سو جاتی ہے۔

درمیان میں ہونے کے سبب یہ کمرا گرم ہے اس میں دو روشندان، دو کھڑکیاں اور ایک لمبا کارنس ہے۔

اس لمبے کارنس پر صرف تمہاری تصویر ہے اور پھولوں سے بھرا بڑا سا گلدان جسے میرے پپا چین سے لائے تھے۔ پتہ نہیں یہ گلدان اور پھول تمہاری تصویر سے سجے دکھائی دیتے ہیں یا پھولوں کی وجہ سے تم تروتازہ دکھائی دیتے ہو۔ بہرحال میں پہروں، دونوں کو تکتی اور تلملاتی ہوں۔ بھلا اتنی خوبصورت زندگی کا آغاز کرنے کے بعد کوئی جدید ٹیکنالوجی اور علوم کی ڈگریاں اکٹھی کرنے اس طرح بچھڑتا ہے؟ کیا ضرورت تھی سپیشلائزیشن کی؟ کہ آدمی اپنا بچپن پھر سے طلوع ہوتا بھی نہ دیکھ سکے؟ میں نے تو دیکھ لیا۔ مگر تم اپنی کو نہیں دیکھ سکے۔ تصویر کو چھوڑو۔ بھئی ہمکتا ہوا کلکاریاں مارتا بچہ۔۔۔ تمہیں کیا خبر کتنا بڑا ڈکٹیٹر۔۔۔ کتنا بڑا طوفان اور کتنا انوکھا اور حسین خیال ہوتا ہے۔

ہاں بھئی۔ اب تمہیں اپنی کے بھیا یا بہنا کا انتظار کرنا پڑے گا۔ کیونکہ تمہارے آنے تک اپنی اتنی سیانی ہو چکی ہو گی کہ طلوع ہوتے سورج کی پہلی کرنوں جیسا چہرہ اور مسکراتی آنکھوں سے چھلکتی ہمکتی تروتازگی تو سال بھر کے بچے ہی سے نصیب ہو گی۔ جسے تم نے اپنی کے حوالے سے Miss کیا ہے تمہاری پسند کے پھولوں سے گلدان کا پیٹ بھرو تو اپنا پیٹ خالی کر لو۔ پتہ ہے کتنے میں آتے ہیں اتنے سارے پھول۔۔۔ ہر روز؟ چلو چھوڑو پیار میں حساب ہی تو نہیں ہوتا۔ مگر اس بات سے اب اینٹھ نہ جانا کہ میں نے ایک ایک سانس گن کر گزارا ہے تمہاری جدائی میں۔ پہلے میں نے ایک گھنٹے کے سانس گنے۔ پھر انہیں دنوں مہینوں اور پھر سالوں پہ ضرب دیا! اُف خدایا کیا میں نے کروڑوں اربوں دفعہ تمہیں یاد کیا ہے۔

کیا کوئی دل کی دھڑکنیں اور سانس بھی گن سکتا ہے۔ بھلا؟ ہاں! میں نے یہ کیا ہے۔ ایک منٹ میں بیس اور ایک گھنٹے کے بارہ سو مرتبہ سانس لینا مجھے ہی یاد ہو سکتا ہے۔ چوبیس گھنٹے میں اٹھائیس ہزار آٹھ سو سولہ، ایک ماہ میں (اگر مہینہ تیس دن کا ہو) چھ لاکھ چونسٹھ ہزار مرتبہ۔۔۔ دیکھو میں کس قدر پاگل ہوں۔ مسام مسام میں تمہیں پرور رکھا ہے نا؟ مرد کو معلوم ہو جائے کہ کوئی اسے اتنا چاہتا ہے تو کبھی کبھی وہ چھچھورے پن پہ اتر آتا ہے۔ پر سنو۔۔۔ تم ایسا نہ کرنا۔۔۔ یہ بری بات ہے۔

سنو سنو۔۔۔ اپنی اب مجھے ''آپ پھ۔۔۔ ی'' کہنے لگی ہے۔ میری چھوٹی بہن سارہ مجھے آپی کہتی ہے ناں۔۔۔ اپنی اس کی نقل اتارتی ہے۔۔۔ مگر کل رات میں نے اسے ایک اور لفظ سکھایا۔ بھلا کیا؟ ''آب۔۔۔ بو۔۔۔'' اس نے آبو کہتے کہتے دو مرتبہ ''ابوا۔۔۔ اب وا۔۔۔'' بھی کہا جو مجھے زیادہ اچھا لگا۔ پتہ نہیں کیوں مجھے پاپا سے ابو یا ابوا اچھا لگتا ہے۔ اپنا سا۔۔۔ محبت سے لبریز۔۔۔ اب وہ تمہاری تصویر کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ سیدھی انگلی سے۔۔۔ پھر انگلی کو منہ میں ڈال کر چوستی ہے اور پھر میری طرف دیکھتی ہے اور کہتی ہے ''آبو۔۔۔ ابوا۔۔۔''

اس وقت میرے دل کی کیا کیفیت ہوتی ہے۔ یہ ایک الگ داستان ہے۔ جو ملنے پر ہی سنائی جا سکتی ہے۔ میں کیا کیا گنواؤں کیا کیا بتاؤں تم نے میرے ارمانوں سے لبالب لمحات کو جدائی کی چھری سے کس بے دردی سے ذبح کیا ہے۔ علوم سے آراستہ ہونا دانش اور عقل تو بڑھا سکتا ہے۔ جذبوں کے سمندر نہیں دے سکتا جو میرے اندر جل تھل ہیں اور رہیں گے۔ چلو چھوڑو۔۔۔ یہ تصویر دیکھو۔

ایک ہمہماتے لمحے میں اپنی کی کھلتی مسکراہٹ کے دوران میں نے یہ تصویر اتاری ہے۔ غور سے دیکھو۔ آنکھیں تمہاری ہیں باقی سب کچھ میرا ہے۔ ہے نا؟ وہی سنہری بال، جنہوں نے تمہیں میرے ساتھ شروع میں باندھا تھا۔ انیس بیس کا بھی فرق نہیں۔

پیچھے جو لڑکی پردے کے پیچھے کھڑی ہے کون ہے بھلا؟ خاک بھی یاد

نہیں تمہیں۔ یہ زرینہ ہے۔ وہی زرینہ جو میرے خطوط اور تحائف تمہیں پہنچایا کرتی تھی۔ وہ کمسن سی زری۔۔۔ کتنی جوان ہوگئی ہے دس سالوں میں۔۔۔ توبہ ہے۔۔۔لڑکیاں کتنی جلدی جوان ہو جاتی ہیں۔

اب آتی ہوں تمہاری بدذوقی پر۔۔۔ تم نے اس اپنی کو تو ایک لاکھ پیار لکھ بھیجے جسے تم نے دیکھا تک نہیں۔ اور جس روشنی کے لیے برسوں تڑپتے ترستے رہے اسے ایک بھی پیار نہ لکھا۔ یہ نا جل جانے کی بات؟ تم سمجھتے کیوں نہیں، اینیما (Anima) اینمس (Animus) سے کیا چاہتی ہے۔ تم میرے وجود کے دوسرے ٹکڑے ہی نہیں ہو۔ میری پیاسی روح کا بھی بھرم ہو، ہر چند کہ اپنی میرے جگر کا ہی ٹکڑا ہے۔ میری روح ہے۔ دل ہے، میرے لہو میں ہے۔ مگر تم نے اسے مجھ پر فوقیت دے دی ہے۔ مجھ پر جس کے اندر تم سانس لیتے ہو۔ جو تمہارے بال بال کی پرورش کرتی ہے، بقول تمہارے جو تمہاری مسکان ہے، حوصلہ ہے، زندگی ہے اور پتہ نہیں کیا کیا کچھ ہے، اسے جھوٹ موٹ ہی سے پیار پیار لکھ دیتے تو نب ٹوٹ جاتا تمہارے قلم کا۔؟؟

توبہ!۔۔۔ ہوں نا پاگل؟ وہ تو میں ہوں!۔۔۔ یہاں تک آئی ہوں تو پاگل پن کا دوسرا قصہ بھی سن لو۔ تم نے خط میں کیسا بارود بھر دیا تھا۔ کیا لکھ دیا تھا تم نے۔۔۔ کیا تم چاہتے تھے کہ میرا ہارٹ فیل ہو جائے۔ یقیناً تم مجھے احمق اور چغد لگے بعد میں۔۔۔ تمہارا یہ بے ساختہ پن مجھے ذرا اچھا نہ لگا تم نے کھل کر لکھ دیا کہ ''پڑوس میں رہنے والے مسٹر اور مسز احمد کی اکلوتی بیٹی سکون مجھے اچھی لگتی ہے۔ اور میں ویک اینڈ پہ گھنٹوں ان کے ہاں گزارتا ہوں۔''

سکون نے مجھے کتنا بے سکون کیا، ہے اندازہ کچھ؟

رات بھر روئی۔ کچھ کھایا ہی نہ جاتا تھا۔ پیاس تک بجھ گئی۔ اپنی کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھا نہ ہی کوئی فون اٹنڈ کیا۔ اپنی دودھ کے لیے بلکتی رہی۔ آیا نے جو چاہا اس کے ساتھ کیا میں نے اسے سینے سے نہیں لگایا۔ اندر سے جہنم جیسے احساسات نے پھونک دیا تھا مجھے۔۔۔ اور میں ریت میں چٹختے دانے کی طرح بھن چکی تھی۔ ایک مرتبہ سوچا زہر کھالوں پھر خیال آیا تم ایسے بے وفا اور بے شرم کے لیے مروں۔ اسی کشمکش میں چار ہی دن گزرے تھے کہ تم نے سکون کی تازہ تصویر بھجوا دی۔ تصویر نہ تھی۔ تعویذ تھا۔ میں جی اٹھی۔ پہلے اپنی حماقتوں پر روئی، پھر ہنسی اور کھلکھلاتی ہوئی اپنی کو چومنے چلی گئی۔

بے وقوف۔۔۔ تم نے پہلے کیوں نہ سکون کی تصویر بھجوا دی۔

لیکن۔۔۔ میں سب سمجھتی ہوں۔ یہ تمہارا مذاق تھا۔ ورنہ ایک سال کی سکون کے بارے میں کھل کر لکھ سکتے تھے۔ اب تصویر دیکھتی ہوں تو بالکل مجھے اپنی کی طرح لگتی ہے اور پیاری بھی۔ حالانکہ کل تک سو مرتبہ ''سکون سکون'' کاغذ پہ لکھتی تھی اور پھر جلاتی تھی۔ ہزاروں مرتبہ اس نام کو جلایا مگر اندر کی آگ ذرا سرد نہ ہوئی۔ اب تو کلیجے میں جیسے شبنم آن گری ہو۔ تم نے بڑا ظلم کیا ہے تمہیں کیا خبر۔ اندر جو خراشیں مجھے چیر گئی ہیں ان کا علاج اس دنیا میں تو ہے نہیں۔۔۔ ہاں اگر تم اپنے شیڈول کے مطابق لوٹ آئے تو پھر شاید روح کے اندر رِسنے ہوئے کچھ کے کم تر ہو سکیں۔

تم ہونا لاپروا؟۔۔۔ میں نے کئی مرتبہ سمجھایا، لکھا کہ اپنا خیال رکھا کرو مگر تمہیں کیا پروا۔ میں جو ہوں ہر دم تمہاری پروا کرنے والی۔ اگر رات کو تھیٹر جانا ہی ہو تو جیٹر کیوں نہیں ساتھ لیتے؟ تم نے تو وہاں جا کر سویٹر بھی کھلے گلے کا پہننا شروع کر دیا ہے۔ لاکھ ولایتی سہی مگر میرے ہاتھ کا بُنا ہوا تو نہیں ناں؟ تمہیں خبر ہی نہیں کہ میونخ کسے کہتے ہیں۔ ہر وقت جوانی کو ناک پہ رکھتے ہو اور پاکستان کے دودھ مکھن کو یاد کر کے اینٹھتے ہو۔ دنیا میں اب دودھ مکھن صرف بچوں کے لیے رہ گیا ہے تم نے جو کھایا کھا لیا اب اس کھائے ہوئے پہ مت اتراؤ۔ اور سیدھی طرح کے گرم کپڑے پہنو۔ میں نے ابھی پندرہ روز پہلے بند گلے کا موٹا سویٹر بنا کر بھیجا ہے وہ مل چکا ہوگا۔ اس کے بغیر کہیں جاؤ۔ نہ آؤ۔ بلکہ مفلر کو چاروں طرف سے لپیٹ کر باہر نکلو۔ مفلر ضروری چیز نہ ہوتا تو ایجاد ہی نہ ہوتا۔ سنا؟؟۔۔۔ اب اگر تم نے ایسی لاپروائی (بے وقوفی) کی تو مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔ ایسی سزا تجویز کروں گی ایسی سزا تجویز کروں گی۔۔۔ تمہیں پتہ ہے نا میں تمہارے لیے سزا تجویز نہیں کر سکتی۔ اسی لیے خط پڑھتے ہوئے مسکرا رہے ہو۔ دیکھو میں دلوں کا بھید جانتی ہوں۔ ہاں سچ پرسوں میں نے خواب میں کیا دیکھا۔ کیا تمہارے طور تھے اور کیا اطوار تھے کیسا طمطراق تھا اور کیسی آن بان تھی۔ میں نے دیکھا پورنمائشی کے چاند کی روشنی روشندان سے کمرے میں اتری ہے اور صرف تمہاری کارنس والی تصویر پر جم گئی ہے۔ پھر یوں لگا کہ تم ایک بادل کے ٹکڑے پر بیٹھے ہوا کے دوش پر اڑتے ہوئے صحن میں آ اترے ہو مگر قدم زمین پر نہیں رکھا۔ اپنی کمرے میں سو رہی ہے۔ میں برآمدے میں کھڑی تحیر میں گم ہوں کہ کہکشاں نیچے آ گئی ہے یا ہم آسمانوں میں ہیں۔ ہر چند کہ میں زمین پر ہی کھڑی ہوں مگر چاہوں تو ستاروں کی لڑی کو ہاتھ سے چھولوں مگر میں نے ستاروں کے بجائے تمہارا ہاتھ چھونا چاہا مگر وہ میرے ہاتھ میں آ آ کر نکل گیا اور بالآخر بادل بھی افق کی طرف پرواز کر گیا۔ ہائے اللہ۔ کتنا اچھا ہو کہ تم ہر رات اسی طرح مجھے خوشیوں سے گدگدا کر جایا کرو۔ بس اور کچھ نہیں بتاؤں گی۔۔۔ ناں۔۔۔ لاکھ کریدو۔ نہیں بتاؤں گی کہا ناں نہیں۔ لو۔۔۔ اپنی نے کروٹ لی اور جاگ کر اٹھ بیٹھی ہے اور اٹھتے ہی بار بار میرا قلم پکڑ لیتی ہے۔ جب بھی میں لکھنے لگتی ہوں وہ اسی طرح میرا تسلسل توڑ دیتی ہے آج تو وہ حیران ہے کہ میں اتنی رات تک کیوں جاگ رہی ہوں۔ اب وہ صبح تک مجھے جگائے گی، کھیلے گی۔۔۔ تمہاری تصویر کی طرف اشارہ کرے گی، میں تصویر کے پاس لے جاؤں گی۔ تو اسے ''پپ'' کرے گی اور پھر کھلکھلا کر ہنسے گی۔ بلی کا بچہ کہ اب کتنا بڑا ہو گیا ہے جسے تم دودھ پیتا چھوڑ کر گئے تھے۔ وہ صوفے پر گیند بنا سو رہا ہے اور بنٹی کونے میں مجھے تکے جا رہا ہے۔ میں سو جاؤں یا جاگوں وہ رات بھر جاگتا اور دن بھر سوتا ہے۔ جیسے اس کے بغیر تو پتا نہیں ہل سکے گا۔ حالانکہ اگر سکو دو کلو کا ہوگا تو یہ تین کا ہے۔ پھر بھی دُم اکڑائے یوں ٹہلتا ہے جیسے ذمہ دار رکھا ہو۔

مجھے عذرا باجی نے بتایا تھا کہ تم چار مہینوں میں کسی وقت بھی آ سکتے

ہو۔ای میل پہ خوش خبری دے کر۔ پلیز ایسا نہ کرنا اچانک یہ خوشی مجھ سے برداشت نہ ہوگی تم خط لکھنا۔ جسے میں لفظ لفظ رک رک کر پڑھوں اور پھر انتظار کی کسک پالتی، گھڑیاں گنتی رہوں۔تم کیا جانو وہ لذت جو اس کسک میں ہے یہ تو وہی محسوس کرسکتا ہے جو چاہت کا سمندر سینے میں سما کر جی سکتا ہے۔۔۔میری طرح!!!

ہاں سنو!۔۔۔خط لکھ کر نہ تو فرینکفرٹ جانا ہے نہ ہی لندن پیرس میں شاپنگ کی ضرورت ہے۔سب کچھ ملتوی ہوگا۔اچھے بچوں کی طرح خط لکھو گے۔یہ خط بدخطی کا شاہکار ہو تو اچھا ہے مجھے سہج سہج کے رک رک کر پڑھنے میں بڑا مزہ آئے گا۔

اس خط کو پوسٹ اپنے ہاتھ سے کرنا اور اس کے بعد شیڈول کے مطابق چھم سے آ اترنا۔بس یوں کہ

ہم بند کیے آنکھ تصور میں پڑے ہیں
ایسے میں کوئی چھم سے جو آ جائے تو کیا ہو

ہوگا کیا؟ بس دل ایک (بیٹ)(Beat) ہی تو مس(Miss) کر جائے گا۔زیادہ سے زیادہ دو دھڑکنیں بھی بھول سکتا ہے۔

لیکن۔۔۔سونو۔۔۔جب میں سوچتی ہوں کہ تم جدید ٹیکنالوجی سے میرے اور اپنے وطن میں نیا سورج طلوع کرنے والے ہو تو میرے اندر فخر کا سورج طلوع ہونے لگتا ہے۔ ہر شہری کی طرح، جو تمہارے کارناموں پہ فخر کرے گا۔ مجھے کیوں فخر نہ ہوگا؟ فخر سے زیادہ طمانیت۔۔۔کہ آنکھیں، سوچ کر ہی روشن ہو جاتی ہیں میری، آنکھیں ہی نہیں۔روشنی تو اندر باہر ایک لو کی طرح پھیل جاتی ہے کیوں روشن ہیولے میرے لہو میں نہ اتریں؟ کہ تم نے یہ صعوبتیں، یہ جدائی، یہ بے مزہ دن رات محض اس لیے گزارے اور مجھے سولی پہ لٹکایا کہ وطن کے باسیوں کے لیے الیکٹرانکس کی دنیا میں انقلاب برپا کر سکو۔ ان کے لیے آسودگیوں کی نوید بن سکو۔غربت کی لکیر کو نیچے لے جا سکو۔یہی سوچ کر، ہر روز صبر جیسا کڑوا گھونٹ حلق سے اتارتی ہوں۔خوش کن جوانی کے تیز تیکھے لمحات، منجمد بنا کر، سرد راتوں میں پسینے میں نہا کر۔۔۔اور گرم دوپہروں میں ٹھٹھرتے ہوئے لمحہ لمحہ میں نے گزارا ہے جان۔صرف تیرے خوابوں کی تکمیل کے لیے۔جو میرے بھی ہیں۔جو یہاں کے ہر شہری کے ہیں۔

میرے لیے ایک اور بھی انبساط کی بات ہے کہ تمہاری کامرانیوں اور ملک کی خوش حالیوں میں میرا بھی تو برابر کا حصہ ہوگا؟ کیوں سونو؟ بتاؤ ناں؟ میں اپنی دعاؤں کے ثمرات جب اپنی آنکھوں سے دیکھوں گی تو تمکنت سے تن جانا فطری ہوگا نا؟

اچھا۔۔۔اب سو جاؤں ناں۔۔۔آنکھوں میں سلگن سلگ اٹھی ہے اور بدن، بخار کے بغیر ہی بخار سے دہک رہا ہے۔ٹائم پیس بارہ بجنے میں دو منٹ پہ کیوں رک گیا ہے؟ حالانکہ کلاک پر صبح کے تین بج کر دس منٹ ہیں۔شاید ٹائم پیس کا سیل ختم ہو چکا ہے۔تم تو جانتے ہو۔رکی ہوئی گھڑیوں سے مجھے وحشت ہوتی ہے۔اب میں اتنی رات گئے سیل کہاں سے لاؤں؟ وقت کا رکنا مجھے کبھی اچھا نہیں لگتا کہ وقت تو خدا ہے۔یہی اضطراب مجھے وہم میں مبتلا کر دیتا ہے۔اسی لیے بار بار تمہیں یاد دلاتی ہوں کہ شیڈول سے ایک لمحہ بھی ادھر اُدھر ضائع کیے بغیر آ جاؤ۔اب سہا جاتا ہے۔۔۔نہ رہا جاتا ہے۔کوئی تسلی کے لیے بھی یہ کہہ دے کہ تم پرسوں آ جاؤ گے تو مجھے یہ برسوں پرسوں ہی لگے گا۔اللہ کرے صبح اٹھوں تو تمہارا خط ملنے کی نوید سامنے کھڑی ہو۔

''صرف تمہاری روشن''

ایک جمگھٹا سا تھا، سب لوگ جھگڑ رہے تھے۔گفتگو تھی۔لڑائی یا بحث۔۔۔گنجل ڈور کی طرح سب کچھ الجھا تھا۔سب بولتے تھے، سُنتا کوئی نہ تھا۔

کسی کے ہاتھ میں اٹیچی تھا کسی کے ہاتھ میں پرفیوم کے ڈبے۔کوئی گھڑی دبوچے آ نک رہا تھا۔ایک آدھ کاغذات بھی ٹٹول رہا تھا۔مگر کسی کے چہرے پر کوئی تاثر نہ دکھ نہ خوشی۔جیسے روز کا معمول ہو۔

''ہوا کیا ہے؟'' میں نے ہر ایک سے جھنجھوڑ کر سوال کیا۔سب بیزاری میں ڈوبے تھے مجھے ایسی نگاہ سے گھورا جس میں تیزی، تندی اور تلخی برابر کی تھی۔جیسے میں نے چڑھتے سورج کو دیکھ کر پوچھا ہو کہ ''سورج نکل آیا ہے کیا؟'' سب ہی مجھے اگنور کر رہے تھے۔کیسی بندر بانٹ تھی کہ کسی کو ہوش ہی نہ تھا۔نظر انداز کر دیئے جانے کی تلخی نے میرے اندر طاقت بھر دی۔میں آگے بڑھا۔ہجوم کو چیر کر مرکز میں پہنچا۔

یہ کراچی تھا۔ میں نے مڑ کر دیکھا سامنے محمدی بلڈنگ کھڑی تھی۔اور اس کے قدموں میں ہی گمنام گولی سے خونوخون ہونے والا خوبرو نوجوان کھلی آنکھوں میں حیرت لیے آسمان کو تک رہا تھا۔میں نے چھو کر دیکھا۔ وہ برف کی طرح ٹھنڈا تھا۔

کاغذات ٹٹولنے والا بولا ''جرمنی سے لوٹا تھا۔آج ہی۔۔۔تعلیم مکمل کرنے کے بعد'' کسی نے اس کا نوٹس نہ لیا۔میں نے بھی نہیں۔

پوری قوم کی طرح کا ہجوم، سامان کا بٹوارہ مکمل نہ کر سکا تھا کہ سائرن بجاتی پولیس پہنچ گئی۔

میرے ہاتھ بھی کچھ نہ آیا۔سوائے اس خط کے جو روشن کا تھا۔

''پیرکا گھرانہ''

ملکہ برطانیہ الزبتھ دوئم آئندہ برس ۲۱۔اپریل کو ۹۰ برس کی ہو رہی ہیں اس سلسلے میں بکنگھم پیلس نے ملکہ کی سالگرہ عوام کے ساتھ منانے کے لیے مختلف تقریبات کا اہتمام کیا ہے جن میں موسیقی، رقص، گھڑسواری، نیزہ بازی، ڈسکس تھرو، لانگ جمپ، ہائی جمپ اور دیگر تقریبات شامل ہیں۔ تقریبات کے پچیس ہزار ٹکٹس چند گھنٹوں میں فروخت ہو گئے۔

''ذکر کا انعام''

حمدِ باری تعالیٰ

جب پُکارا تری رحمت نے لیا تھام مُجھے
رنج پہنچا نہ سکے دہر کے آلام مجھے

اہلِ دنیا سے جو ملتا ہے کبھی درد تو پھر
اک ترے نام سے آ جاتا ہے آرام مجھے

آخرت کی بھی ہر اک فکر سے آزاد کیا
ذکر کا تُو نے عطا کر کے یہ انعام مجھے

جب ترے گھر کی زیارت کا ملے اِذنِ سفر
اک تجلّی ہے جو ملتی ہے ہر اک گام مجھے

کعبۃ اللہ کو تکتے جو گزاری میں نے
بھولتی ہی نہیں مکّہ کی وہ اک شام مجھے

تُو نے کیا کیا نہیں بخشا ہے گنہگاروں کو
یاد رہتے ہیں ہمیشہ ترے اکرام مجھے

گونجتا ہے جو یہاں نام خدایا تیرا
اچھے لگتے ہیں بہت گھر کے در و بام مجھے

نورین طلعت عروبہ
(راولپنڈی)

منقبت اہلِ بیت

والشمس اور طٰہٰ بنی چادرِ تطہیر
خیر النساءؑ کی چاہ بنی چادرِ تطہیر

حسنینؑ و مُصطفیٰ ﷺ وعلیؑ اور بتولؑ کے
صدقے میں سجدہ گاہ بنی چادرِ تطہیر

اِس در سے کوئی بھی کبھی واپس نہیں گیا
یزداں کی بارگاہ بنی چادرِ تطہیر

چشمہ ء کائنات بھی سیراب ہو گیا
اِنسانیت کی راہ بنی چادرِ تطہیر

کیا خوب پنجتنؑ کی شفاعت لئے ہوئے
ایمان کی پناہ بنی چادرِ تطہیر

سِدرہ سے آگے تک کا معمہ بھی حل ہوا
واللہ یداللہ بنی چادرِ تطہیر

خود رکرد گار کہنے لگا جبرئیل سے
صلو علیہ واہ بنی چادرِ تطہیر

ایم زیڈ کنولؔ
(لاہور)

نگہدارئی ناموس

شہناز خانم عابدی
(کینیڈا)

علی احمد کا تعلق ریاست امیر پور کے میر خاندان سے تھا۔امتیاز ہائی اسکول میں تعلیم ختم کر کے وہ امریکہ روانہ ہوگیا۔وہاں اس کا جی نہ لگا۔وطن کی مٹی اسے واپس کھینچنے لگی۔پڑھنے لکھنے سے تو یوں بھی اسے کوئی سروکار نہ تھا۔اپنے طور پر اس نے یہاں کچھ عرصہ ٹکے رہنے کے لئے بڑے جتن کئے کیونکہ والدین کا کہنا ماننا اس کے خمیر میں تھا۔یہ ہمارا تہذیبی ورثہ ہے۔ان جتنوں میں ایک جتن یہ بھی تھا کہ وہ شہہ سواری کے ایک مشہور کلب ''بریورائڈرس'' کا رکن ہوگیا گھڑ سواری بھی اس کے خون میں تھی۔گھوڑا سندھ کے رئیسوں کے لئے لازم وملزوم بنا۔علی احمد پیدائشی شہہ سوار تھا چنانچہ بہت جلد ''بریورائڈرس'' کا ہیرو بن گیا۔اس نے امریکہ کی زمین پر گھوڑے دوڑائے اور امریکی لڑکیوں کے دلوں میں جھنڈے گاڑ دیئے۔رئیسوں کے ہاں دلوں کے معاملے نہیں ہوتے۔مزے لوٹنے اور جیب لٹوانے کو ہی وہ دل کا معاملہ سمجھتے ہیں۔مزے لوٹنے والا معاملہ اس کے والدین پر کھلا یا نہ کھلا البتہ جیب کا لٹنا ان پر بہت جلد کھل گیا، پیسے تو وہی بھیجتے تھے۔لاچار والد کی بیماری کی اطلاع دے کر علی احمد کو واپس بلوا لیا گیا۔اس کی آدھی پکی اور آدھی کچی امریکی محبوبہ ٹریسا والکر وہیں رہ گئی۔گھر لوٹ کر اس نے اپنے والد کو معمولی سا بیمار پایا۔والدہ کی محبت بھری باتیں اس کے دل میں اتر گئیں۔اس کے دونوں بچوں نے اس کے دل کو گرما سا دیا۔بیوی جو بچپن کی شادی کے نتیجے میں اس کے گلے باندھ دی گئی تھی ہمیشہ کی طرح ناقابل برداشت نہیں لگی۔یہ اور بات کہ ایک منظر آپ ہی آپ دوسرے منظر سے گڈ مڈ ہو جاتا۔ٹریسا تو ٹریسا، مونیک ،شیبا اور نہ جانے کس کس کا کیا کیا یاد آجاتا۔''مشرق بہر حال مشرق ہے'' اس نے سوچا اگر چہ وہ سوچنے والے ذہن کا حامل آدمی نہیں تھا۔سوچنا رئیسوں کی شان نہیں لیکن اس کا ذہن اسے تصویریں دکھاتا رہتا۔جو کچھ گزرا، اس کی تصویریں، جو نہیں گزرا، لیکن شدت سے اسکی چاہت ہوئی، اس کی تصویریں۔ساتھ ساتھ ایسی تصاویر جن کو وہ دیکھنا نہ چاہے اور وہ بھی جنہیں دیکھ کر ہول آجائے۔ان دنوں جو تصویریں وہ دیکھ رہا تھا ان میں زیادہ برف گرنے، برف سے کھیلتے ہوئے مُردوں ،عورتوں اور بچوں کی۔کچھ گوری اور کچھ بے انتہا کالی لڑکیوں کی۔اونچی اونچی عمارتوں، چوڑی چوڑی سڑکوں۔طرح طرح کی کاروں میں لانگ ڈرائیو کی، تفریحی پارکوں، مختلف زاویئے سے دیکھے گئے نیاگرا (آبشار) کی مبہوت کرنے والی اور سب سے زیادہ ٹریسا کی تصاویر۔۔۔اس کا رقص کرنا، برف پر اسکیٹنگ کرنا، گھوڑے دوڑانا۔ان تصویروں میں مسلسل بے ربطی اور ربط کا تعلق۔۔جو اس کی سمجھ کبھی نہ آسکا۔

ابھی علی احمد وطن کے ماحول سے دوبارہ اپنے آپ کو مربوط کرنے کی کوشش میں مصروف تھا کہ اس کے باباسائیں (والد) دیکھتے ہی دیکھتے شدید بیمار ہوگئے۔حیدرآباد سے ڈاکٹر بلوائے گئے'قدم مبارک' پر منت مانی گئی۔خاندانی امام باڑے میں منت کے دھاگے باندھے گئے، مزاروں پر لنگر تقسیم کئے گئے لیکن بابا کی حالت میں فرق نہیں آیا۔جام شورو کے ہسپتال میں بجلی لگوانے سے بھی کچھ نہ ہوا، پھر کراچی لے جایا گیا، آپریشن ہوا لیکن بے فائدہ، حلق کا ٹیومر تھا تو بنائن (Benign) لیکن (Malignant) سے بھی زیادہ لاعلاج ثابت ہوا۔سب جتن بے کار گئے اور علی احمد کے باباسائیں اس دنیا سے رابطہ توڑ گئے۔باباسائیں کے جانے کے بعد علی احمد کی آنکھوں کے سامنے ان کی تصویر آتی تو تادیر نہیں ٹھہرتی، دوسری تصویریں اس کی جگہ لے لیتیں، عام طور پر ان رشتے داروں کی تصویریں جو اس کے باباسائیں کی چھوڑی ہوئی جائیداد کو بھوکی نظروں سے گھور رہے ہوتے۔ رئیسوں اور جاگیرداروں میں جب کوئی رئیس یا جاگیردار مرتا ہے تو لوگ روتے کم اور اور لڑتے جھگڑتے زیادہ ہیں۔گھروں کے اندر، جرگوں میں اور بالآخر عدالتوں میں۔

والد کی موت نے علی احمد کو مصروفیتوں کے ایک دلدل میں اتار دیا۔ اس دلدل میں ہاتھ پیر مارتے ہوئے علی احمد نے یہ بھی دیکھا کہ شہر کا ضعیف العمر ڈاکٹر اپنا منحوس بکس سنبھالے کوٹھی میں داخل ہوا۔پہلے وہ اس کی دوسدا کنواری بہنوں کو مارفیا کے انجکشن لگانے آیا کرتا تھا، بظاہر درد گردہ سے افاقہ پہنچانے کے لئے لیکن درحقیقت ہسٹیریا کے دوروں کی شدت کم کرنے کے لئے۔اس بار وہ اس کی سوتیلی ماں کے لئے بلوایا گیا تھا۔۔۔کون سی بات اس کو زیادہ بری لگی یا کم بری لگی وہ یہ سب سوچنے سے قاصر تھا۔شاید اس کا دماغ بند اور ذہن مفلوج ہو گیا تھا۔چنانچہ ٹریسا کا پہلا خط جب خلافِ توقع اسے ملا تو وہ حیران ہوا یا خوش ہوا اس کا اندازہ لگانا آسان نہیں۔خط میں لکھا تھا کہ وہ علی احمد کو بہت مِس کرتی ہے۔اس کے علاوہ رسمی باتیں بھی لکھی تھیں۔ایک تصویر بھی بھیجی تھی جس میں وہ پورے دانت نکالے ہنس رہی ہے اور سلاخوں کے پیچھے شیر کھڑا ہے۔تصویر کو دیکھتے دیکھتے علی احمد نے ایک پل کیلئے چاہا کہ وہ امریکہ بھاگ جائے۔لیکن وہ پل دبے قدموں گزر گیا۔

ایک دن عجیب اتفاق ہوا کہ فیاض اس کے پاس آیا اور اسکو باہر لے گیا۔جب وہ امتیاز کالج پہنچے تو اسے بڑا تعجب ہوا۔پھر فیاض کے معمولی اصرار پر اس نے کالج میں باقاعدہ ایڈمیشن لے لیا۔یہ سب کچھ یوں ہوا جیسے پلک جھپکتے میں ہوگیا ہو۔فیاض کے بارے میں تو سب لوگ جانتے تھے کہ یہ ایک لاابالی آدمی ہے۔لیکن علی احمد کے فیصلے تو مہینوں اور بعض اوقات برسوں میں ہوتے تھے۔

فیاض نے علی احمد کو داخلہ کیوں دلایا یہ ایسی بات نہ تھی جو علی احمد کی سمجھ میں نہ آسکے۔ ؟اس سال کالج میں لڑکیاں خاصی تعداد میں داخل ہوگئی تھیں۔۔۔

فیاض اس کا کزن تھا وہ اس سے اچھی طرح واقف تھا لڑکیاں اس کی کمزوری تھیں، اسکول کی ٹیچرز، کالج کی لڑکیاں، ہیلتھ وزیٹرز، نرسیں، پڑوس کے شہر کے بازارِ حسن کی طوائفیں (امیر پور میں کوئی بازارِ حسن نہیں تھا۔) سب اس کے دائرہء انتخاب میں شامل تھیں۔ علی احمد فیاض سے مختلف تو تھا لیکن تھا وہ بھی شاہی خاندان سے تعلق رکھنے والا رئیس۔

کالج میں داخل ہوتے ہیں اس نے کالج کی لڑکیوں پر اپنا 'حق' محسوس کرنا شروع کردیا۔ (لڑکیوں اور عورتوں پر 'حق' کا یہ احساس اسے ورثے میں ملا تھا) کالج کی لڑکیوں میں شائرین جمال اسے اچھی لگی لیکن اپنے قدرے ٹھگنے قد کی وجہ سے اس نے اس بلند قامت لڑکی کی طرف مائل ہونے کی ہمت نہیں کی البتہ سیما نقوی اسے بہت بھائی۔ سیما نقوی کا قد کچھ کم تو نہ تھا لیکن شائد اس کے نازک اور پھول کی ڈالی جیسے وجود نے علی احمد پر اسکے نکلتے ہوئے قد کا رعب طاری نہ ہونے دیا۔ علی احمد اس کا پیچھا کرنے لگا۔ جہاں سیما نقوی جاتی، علی احمد اس کے پیچھے پیچھے ہوجاتا۔ علی احمد کی موجودگی کے احساس سے سیما نقوی کی غزالی آنکھوں میں وحشت سی پیدا ہوجاتی وہ اپنی ہم نام دوست سیما حمید کے قریب تر ہوجاتی تاکہ حفاظت کا احساس ہوسکے۔ علی احمد کسی دن اپنی خوبصورت گاڑی میں آتا، کسی دن جیپ میں اور کسی دن گھوڑے پر، اس کو یقین تھا شمالی امریکہ کی طرح امتیاز کالج کی لڑکیوں کو بھی اپنی شہسواری سے مسحور کرلے گا لیکن اس سلسلے میں اسے ناکامی ہوئی۔ شائرین جمال جیسی فلرٹ لڑکی بھی اس کی طرف مائل نہیں ہوئی، سیما نقوی کیا مائل ہوتی، سیما نقوی کا تو اس کو دیکھ کر خون خشک ہوجاتا تھا اس کو ہر وقت یہ خوف گھیرے رہتا کہ علی احمد اس کو اٹھوا نہ لے۔ یہ صورتحال ایسی نہ تھی جو کالج کے شریر لڑکوں سے چھپی رہتی۔

یوں بھی علی احمد اس قسم کے لڑکوں سے محفوظ نہ تھا۔ رئیس ہونے کے ناطے یہ لڑکے اس کو نوجوانوں کی اصطلاح میں 'کاٹنے' میں مصروف رہتے۔ لڑکے اس کو گھیر گھار کر کینٹین لے جاتے، کھاتے پیتے اور بل علی احمد چکاتا۔ ان لڑکوں نے غیر محسوس طور پر اپنے آپ کو علی احمد کا راز دار بنالیا۔ کینٹین میں تقریباً ہر روز سیما نقوی کی باتیں ہونے لگیں اور علی احمد کو سیما نقوی کا مصدقہ عاشق تسلیم کرلیا گیا۔ سیما نقوی کی آنکھیں ایک تو تھیں ہی بڑی دوسرے وہ ان آنکھوں میں باقاعدگی سے کاجل لگاتی تھی اور کاجل بھی اس طرح کہ آنکھوں کے دونوں گوشوں سے کاجل کی ایک لمبی لکیر باہر نکل آتی اور نچلے پپوٹے کے نیچے ایک بڑا نیم دائرہ اس سے مل جاتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوتا کہ اس کی آنکھیں اپنی قدرتی لمبائی سے کہیں زیادہ لمبی دکھائی دیتیں۔ وہ برقعہ نہیں پہنتی تھی۔ اس کے لباس کی تراش خراش جدید سے جدید تر ہوتی تھی۔ جب ٹیڈی لباس کا فیشن چلا تو امتیاز کالج میں سیما نقوی نے اس کی ابتدا کی۔ جن لڑکوں نے علی احمد کو سیما نقوی کا عاشق بنایا وہ خود بھی اس کے پرستار تھے۔ لیکن سیما نقوی ایک ایسا غزال تھی جسکو شکاری دیکھتا ہی رہ جاتا ہے اسیر کرنے کی کوشش نہیں کرتا۔ البتہ علی احمد ایک رئیس ہونے کے ناطے ہر عورت پر ہاتھ ڈالنا اپنا فرض سمجھتا تھا۔ ایک دن انہی لڑکوں کے بہکانے میں آکر، ان کے لکھے ہوئے ایک محبت نامے کو اپنی تحریر میں نقل کرکے سیما نقوی تک پہنچادیا۔ سیما نقوی نے اس محبت نامے کو اپنے والد کے سپرد کردیا اور اس کے والد نے کالج کے پرنسپل احمد حمید خان کو دے دیا۔ پروفیسر احمد حمید خان نے اس معاملے کو سختی سے نمٹایا۔ اتنی ہمت تو نہیں تھی کہ ریاست کے شاہی خاندان والوں سے ٹکر لیتے البتہ کالج کے ڈسپلن کا سوال بنا کر وہ اس معاملے کو علی احمد کے خاندان کے دستار بند سردار کے پاس لے گئے۔ فیصلہ یوں ہوا کہ پرنسپل نے علی احمد کو اس کالج سے نکال کر حیدرآباد کے ایک کالج میں داخل کروادیا اور ایک اچھے ہوسٹل میں کمرہ بھی دلوادیا۔ علی احمد کو ایک دھچکا سا لگا۔ اس کا حیدرآباد میں دل نہ لگا وہ امیر پور لوٹ آیا۔

ان ہی دنوں اس کو ثریا کا دوسرا خط ملا۔ علی احمد نے نہ صرف خط کا جواب پوسٹ کیا بلکہ ساتھ ہی ثریا کے لئے بلوچی کڑھائی کے کام کا ایک سوٹ بھی پارسل کیا۔ وہ یہ سب کرکے بے حد خوشی محسوس کرنے لگا۔ شاید امتیاز کالج بھی اس کے ذہن سے رخصت ہونے لگا تھا لیکن چند ماہ بعد ہی پروفیسر احمد حمید خان کا تبادلہ ہوگیا۔ وہ حیدرآباد چلے گئے انہیں تعلیمی بورڈ کا صدر بنادیا گیا۔

جب نئے تعلیمی سال کا آغاز ہوا تو علی احمد دوبارہ کالج لوٹ آیا۔ اس نے ایک بار پھر سیما نقوی کا تعاقب شروع کردیا۔ حیدرآباد سے لوٹنے کے بعد علی احمد کچھ زیادہ ہی بےباک ہوچکا تھا۔ اب اس کو نہ تو لڑکوں کو راز دار بنا کر رکھنے کی ضرورت تھی اور نہ ہی ان کو کھلا پلا کر راضی رکھنے کی۔ اب تو وہ اس انداز میں سوچنے لگا تھا کہ وہ اگر سیما نقوی کو اٹھوالے تو اس کی بیوی کے طاقتور اور با اثر رشتے دار کیا کچھ کرسکتے ہیں۔ ویسے اس کے طبقے میں کسی لڑکی کو اٹھوالینا کوئی پیچیدہ بات نہیں تھی۔ مسئلہ یہ تھا کہ وہ سیما کو اٹھوانا نہیں چاہتا تھا بلکہ اسے اپنانا چاہتا تھا۔ علی احمد کے خاندان کے جتنے مرد تھے ان سب کی ایک سے زائد بیویاں تھیں یہ بات مشہور ہے کہ'' جس سال فصل اچھی ہوتی ہے اس سال چھوٹے، بڑے زمیندار یا تو نئی شادی رچاتے ہیں یا اپنے کسی دشمن کو مَرواتے ہیں۔'' علی احمد نے ہنوز نہ تو کوئی قتل کیا تھا اور نہ کروایا تھا۔ نہ ہی دوسری شادی کی تھی۔ جہاں تک اس کے والد کا تعلق ہے مرحوم نے چار شادیاں کی تھیں اور پانچ قتل۔ علی احمد کی والدہ ان کی پہلی بیوی اور کافی معمر خاتون تھیں البتہ اس کی تینوں سوتیلی مائیں خاصی کم عمر تھیں ایک تو علی احمد سے بھی کئی برس چھوٹی تھیں۔

ایک دن اسے بخار آگیا، ڈاکٹر کو بلوایا گیا۔ ڈاکٹر نے اسے بخار کی دوا دی اور ساتھ ہی انجکشن بھی لگادیا۔ تھوڑی دیر بعد اسے یوں لگا جیسے وہ ایک چھوٹا سا بچہ ہے اور کسی ہنڈولے میں جھول رہا ہے اور پھر وہ سوگیا جب بیدار ہوا تو پہلی تصویر اس کی نگاہوں کے سامنے ابھری وہ سیما نقوی کی تھی۔ وہی قدرے لمبا

ساچہرہ، نازک اورستواں ناک، چھوٹے اور پتلے لب، مخروطی ٹھوڑی، اور کھنچی کمانوں جیسے ابرو، غلافی پپوٹے اورغزالی آنکھیں اور شخصیت کا شاخِ گل جیسا تاثر۔۔۔اسکا جی چاہنے لگا کہ وہ آنکھیں بند کرے اور سیما کے سراپے کا موازنہ ٹریسا سے کرے لیکن وہ ایسا نہ کرسکا، اوطاک میں کوئی مہمان آگیا اور علی احمد کو اس سے ملے بغیر چارہ نہیں تھا۔

مہمان کی خاطر اگلے دن اس کو''کتوں اور ریچھ کی لڑائی'' کا شغل کرنا تھا۔ اگلے دن یہ تماشا بھی ہوگزرا۔ پہلا کتا چھوڑا گیا اس نے ریچھ پر زبردست چھلانگ لگائی، ریچھ نے خوفناک گھٹی گھٹی سی آواز حلق سے نکال کر (جو اس جانور سے مخصوص ہے۔) آناً فاناً کتے کو اچھال دیا، عین اسی وقت دوسرے کتے کو چھوڑا گیا، اسی طرح پورے چار کتے چھوڑ دیئے گئے۔ تماشہ دیکھنے والوں میں ضعیف العمر منہ کھولے ہنس رہے تھے، بچے سہمے سہمے تھے، کچھ چیخیں مار رہے تھے۔ اور باقی لوگ مٹھیاں بھینچے، دانتوں پر دانت جمائے پوری توجہ سے موت وحیات کی یہ کشمکش دیکھ رہے تھے۔ یہ کشمکش زندگی کے لئے تھی۔۔۔قوت کے لئے تھی۔۔۔یا برتری کے لئے تھی۔۔۔۔؟

علی احمد کو اس کا شدید صدمہ ہوا تھا۔ چاروں کتے اس کھیل میں ریچھ کو شکست دینے میں ناکام ہو کر مر گئے تھے۔ ان میں دو ایسے کتے تھے جن سے علی احمد بہت پیار کرتا تھا۔ کسی کے خواب وخیال میں بھی یہ بات نہیں آئی تھی کہ ریچھ کامیاب ہو جائے گا اور کتے اپنے وجود کو باقی رکھنے کی یا اپنی برتری منوانے کی یہ جنگ ہار جائینگے۔ پہلی مرتبہ علی احمد کو شدت سے ''موت کا'' احساس ہوا۔ پہلی مرتبہ اس کو اس حقیقت کا عرفان ہوا کہ موت اٹل ہوتی ہے۔ والد کی موت نے اس کو شاید زندگی کے اندر اور گہرا دھکیل دیا تھا۔ جب کہ اپنے پیارے کتوں کی موت نے اس کو موت کے اندھے کنوئیں کے کنارے لا کھڑا کیا۔

سیما حمید نے سیما نقوی سے سوال کیا ''علی احمد کو کہاں بھیج دیا؟''

اس کے جواب میں سیما نقوی نے اپنی کالی آنکھوں کی ساری وحشت اپنی دوست کی آنکھوں میں انڈیل دی۔ پندرہ دن سے علی احمد کالج نہیں آرہا تھا۔ اصولی طور پر علی احمد کا نہ آنا سیما نقوی کے لئے سکون کا باعث ہونا چاہئے تھا۔ لیکن سیما نقوی کالج کی مصروفیات سے جب بھی فرصت پاتی اس کو علی احمد کا خیال آجاتا۔ چند دن پہلے اس نے خواب میں دیکھا تھا کہ وہ علی احمد کے ساتھ ایک شاندار گھوڑے پر سوار ہے۔ بیداری میں اس خیال آتے ہی وہ لرز جاتی تھی لیکن خواب میں اس نے اپنے آپ کو بہت خوش اور مطمئن دیکھا تھا۔ اس کو اگر چہ یہ خوف ہمیشہ دامن گیر رہتا کہ کہیں علی احمد اس کو اٹھوا نہ لے۔۔۔۔وہ نہایت مستقل مزاجی سے یہ بھی سوچتی رہتی تھی کہ اگر ایسا واقعہ پیش آجائے تو کیسا لگے گا۔۔۔۔؟

علی احمد کا دل کبھی کبھی یہ چاہتا تھا کہ وہ سیما نقوی سے 'پاک محبت' کرنے لگے (سسی پنوں والی)۔ پھر وہ سوچنے لگتا کیا سیما نقوی بھی مجھ سے ایسی محبت کرنے پر راضی ہو جائیگی۔۔۔؟ پھر وہ خود ہی 'پاک محبت' کے خیال پر ہنس پڑتا۔ اگر وہ سیما نقوی سے شادی کر لے تو کیا یہ پاک محبت نہ ہوگی۔۔۔؟ سیما نقوی کے والد ضعیف العمر آدمی تھے ان کا ایک چھوٹا سا برف کا کارخانہ تھا۔ ان کا صرف ایک ہی دبلا پتلا نازک سا لڑکا تھا جو ہنوز طالبعلم تھا۔ کوئی اور رشتے دار بھی نہ تھے۔ گویا سیما نقوی کو حاصل کرنا علی احمد کے لئے کوئی مسئلہ ہی نہیں تھا۔ اس سلسلے میں تھوڑی بہت رکاوٹ یہ تھی کہ علی احمد کی بیوی کے اقربا بہت طاقتور لوگ تھے وہ مسائل پیدا کر سکتے تھے اور وہ اس بات سے خائف تھا کہ اس کا اپنا خاندان بھی اس کے خلاف کھڑا ہو سکتا تھا۔ کسی عورت کو اٹھوا لینا تو برداشت کیا جا سکتا تھا لیکن ایک عام سی عورت کو بیوی بنا لینا قریب قریب ناقابلِ برداشت تھا۔

علی احمد کالج میں واجبی سی پڑھائی بھی کر لیتا تھا تا کہ اساتذہ کوئی مسئلہ نہ اٹھا دیں اور اسے پہلے کی طرح سیما نقوی سے جدا ہونا پڑے۔ ایک دن وہ اپنے آپ کو نہ روک سکا اور ایک چھوٹا سا رنگین لفافہ سیما نقوی کی گود میں پھینک کر وہاں سے فوراً رفو چکر ہو گیا۔ اس وقت سیما نقوی اور سیما حمید دونوں ایک کلاس روم میں تنہا بیٹھی باتیں کر رہی تھیں۔ سیما نقوی چند لمحے کے لئے جیسے سکتے میں آگئی ہو پھر اس نے سیما حمید کی جانب دیکھا جیسے پوچھ رہی ہو کہ کیا کروں۔

سیما حمید نے لفافہ اس کی گود سے اٹھا لیا لیکن پھر فوراً ہی واپس کر دیا یہ کہہ کر'' تمہاری چیز ہے تم ہی کھولو۔'' سیما نقوی نے پوچھا'' کیا واقعی کھولوں۔'' ''ہاں! اور کیا کرو گی۔؟ دیکھیں اس میں کیا لکھا ہے'' سیما حمید نے جواب دیا۔ سیما نقوی کو ڈر لگ رہا تھا کہیں سیما حمید اس لفافے کو پرنسپل تک پہنچانے کا مشورہ نہ دے دے۔ اس مرتبہ سیما نقوی ایسی کوئی حرکت نہیں کرنا چاہتی تھی۔

جب لفافہ کھولا گیا تو اس میں کاغذ کے ایک ٹکڑے پر میرؔ کا یہ شعر درج تھا:

دور بہت بھاگو ہو ہم سے سیکھ طریق غزالوں کا
وحشت کرنا شیوہ ہے ان کالی آنکھوں والوں کا

سیما حمید نے شعر پڑھ کر ایک قہقہہ لگایا اور سیما نقوی کی طرف دیکھ کر بولی'' اور بھرو کاجل آنکھوں میں۔'' سیما نقوی نے اس کاغذ کے پرزے کو احتیاط سے لفافے میں رکھا اور اپنی ڈائری میں رکھ دیا۔ اس دن جب اسے تنہائی میسر ہوئی تو اس نے پہلے خود اپنی کالی آنکھیں اپنے چاروں طرف پھیلی ہوئی دیکھیں پھر دیکھا کہ وہ بھاگی جارہی ہے اور علی احمد اس کے پیچھے گھوڑا دوڑائے چلا آرہا ہے۔ اسکا دل چاہا کہ اس کے قدم رک جائیں اور علی احمد اسے اپنے ساتھ گھوڑے پر سوار کر لے۔ اور نہ ہی اسکے دل و ذہن سے اس کے ہاتھ کا لکھا ہوا میرؔ کا شعر فراموش ہو رہا تھا۔

علی احمد کا پورا ایک ہفتہ تشویش میں گزرا۔ وہ حیران تھا۔ نہ تو اسکو پرنسپل نے بلوایا اور نہ ہی اس کو کہیں سے کوئی سن گن ملی۔ وہ اس خاموشی اور کامل سکوت سے بھونچکا رہ گیا۔ کسی طرح کا ردِعمل نہ ہونے نے اس پر ایک جادو سا کر دیا۔ اس کو فیصلہ کرنے میں مزید دیر نہیں لگی کہ جس طریقے سے بھی ہو سیما نقوی کو

نہ صرف حاصل کرلے بلکہ اسکو اپنی بیوی بنالے۔ ان معاملات میں وہ قطعی نا تجربے کار تھا وہ امیر پور سے بارہ میل دور کوٹ مدیجی پہنچا۔ وہاں اس نے فیاض کے ساتھ دو گھنٹے کچہری کی۔فیاض نے جب یہ سنا کہ علی احمد نے سیما نقوی کو اٹھوانے کا فیصلہ کیا ہے تو وہ اسکی مدد کے لئے فوراً تیار ہوگیا۔لیکن شادی کرنے کے خیال کی سخت مخالفت کی۔علی احمد نے صاف کہہ دیا کہ لڑکی اٹھانا ہی نہیں ہے، وہ اس سے شادی بھی کرے گا۔

بات چیت اس پروگرام پر ہوئی کہ یہ کام کسطرح انجام دیا جائے اور علی احمد کی پہلی بیوی کے رشتے داروں سے کیسے نمٹا جائے۔اس رات وہ سارا لائحہ عمل تیار کرکے امیر پور اپنے گھر لوٹ گیا۔وہ اس رات اوطاک میں ہی سوگیا۔ نینداس سے کوسوں دور تھی اس کی آنکھوں کے سامنے چہرے ہی چہرے ابھرنے اور ڈوبنے لگے۔بیوی، بیوی کے رشتے دار، سیما نقوی، ثریا والکر، بابا سائیں۔ اماں، سوتیلی ماں، فیاض، اس کے محبوب کتے، اور نہ جانے کون کون۔۔اور پھر رات کے کسی خاموش لمحے نے اس کی آنکھوں کے کواڑ بند کردیئے۔آٹھ دس دن منصوبہ بندی اور اہم جزئیات پر غور وفکر میں گزر گئے۔علی احمد با قاعدگی سے کالج جا تا رہا اور سیما نقوی کو ''چورنظروں'' سے دیکھتا بھی رہا۔اس نے ساری تیاریاں قریب قریب مکمل کرلیں۔یہاں تک سیما نقوی کو اٹھوا کر فوری نکاح کروانے کے بھی سارے انتظامات مکمل کرلئے۔

اس کے خون کی گردش تیز سے تیز تر ہوتی گئی۔یہ خون اسکا اپنا ہو نے کے علاوہ اپنے آباؤ اجداد کا بھی تھا جس سے اس کو ورثے میں انتہائی قدیم اسلحہ۔تلواریں۔نیزے۔خنجر اور کلہاڑیاں ملی تھیں۔ابھی دن کا اجالا باقی تھا اس نے ڈرائیور کو بلایا اور کہا کہ جیپ نکالے۔علی احمد اٹھا اور اپنی بندوق لے کر باہر نکل گیا سب لوگ علی احمد کی افتادِ طبع سے واقف تھے۔وہ وقت بے وقت شکار پر چلا جاتا تھا۔اسکی ہر مشکل کا مداوا شکار ہی تھا۔اپنی زندگی کے اہم فیصلے اس نے شکار کے دوران کئے تھے۔اس کی جیپ کوٹ مدیجی والی سڑک پر برق رفتاری سے دوڑ رہی تھی۔ڈرائیور نے سوچا شاید چھوٹے سرکار ''فلائنگ شارٹس'' کھیلنے جا رہے ہیں۔علی احمد کبھی کبھی اڑتے ہوئے پرندوں کا بھی شکار کرلیا کرتا تھا۔اس کا نشانہ اس معاملے میں بھی ٹھیک تھا۔دن کی روشنی شام کی آغوش میں جانے کے لئے بے چین تھی یہی بسیرے کی تلاش میں اڑنے والے پرندوں کو مار گرانے کا وقت تھا۔کوٹ مدیجی کے موڑ پر اس نے جیپ کو بستی کی طرف مڑوا دیا۔اس کی جیپ اس کی آبائی کوٹھی کے سامنے جا کر رک گئی۔ڈرائیور کچھ حیران ہوا۔علی احمد شکار کی مہمات پر کبھی فیاض کو ساتھ نہیں لیتا تھا۔

وہ جیپ سے اترا نیم تاریک ماحول میں اس کا آبائی ملازم ''اللہ دینو'' جانے کدھر سے اس کے سامنے آ گیا۔وہ اس کے قدموں پر گر پڑا۔وہ اس کے مرحوم بابا سائیں کا خاص الخاص خدمت گار تھا۔''اللہ دینو چاچا تو اس وقت یہاں۔''

اللہ دینو چاچا اس کے قدموں سے اٹھا اور ہاتھ جوڑے کھڑا رہا۔

''کیا بات ہے بتاتے کیوں نہیں۔۔؟'' علی احمد غصے سے بولا۔

''سائیں میں مجبوری سے آیا تھا'' اللہ دینو نے گریہ آمیز آواز میں جواب دیا۔وہ سر سے پاؤں تک لرز رہا تھا۔

''کیسی مجبوری۔۔؟ تو یہاں کیا کر رہا ہے۔''

اللہ دینو نے اپنے کندھے سے بندوق نکال کر علی احمد کے قدموں پر ڈال دی۔''سائیں میں نے فیاض کو گولی مار دی ہے۔یہی خدمت انجام دینے یہاں آیا تھا۔مرحوم سائیں کی ایک اور آخری خدمت۔۔۔آپ سائیں! چاہو تو اسی وقت میری بندوق سے مجھے ختم کردو۔میں نے اس مردود کو جہنم بھیج دیا ہے۔ بے شرم۔بے غیرت، ہماری عزت سے۔۔۔مرحوم سائیں کی امانت چھوٹی سرکار سے۔۔۔''

لااللہ دینو سے آگے کچھ بولا نہ گیا وہ اپنی پگڑی زمین پر رکھ کر سر اور سینہ پیٹنے لگا۔

ہمسفر ایسا ملے

سبیلہ انعام صدیقی

(کراچی)

خوبصورت ہو اضافہ
زیست کے اوراق میں
ہمسفر ایسا ملے
جو ہمنوا بھی ہو مرا
روح کو سیراب کردے
ساتھ اس کا ایسا ہو
شبنمی قطرات ہوں
جیسے بیاباں کے لئے
قربتیں ہوں اس کی مرہم
غم کے درماں کے لئے
مشکلیں آساں ہوں کچھ
قلب پریشاں کے لئے
یوں قدم باہم اٹھیں
جیسے رہِ منزل کی سمت
ہمسفر ایسا ملے
جو ہمنوا بھی ہو مرا

خودکشی

عارف نقوی (برلن، جرمنی)

شاکر نے خودکشی کا مصمم ارادہ کرلیا تھا۔ وہ شہر سے کچھ دور لکھنو سے کانپور جانے والی ریل کی پٹری پر چلا جارہا تھا۔ آس پاس سے کئی ٹرینیں گزر چکی تھیں۔ کُو، چھک چھک کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ بچپن میں یہ آوازیں اسے بہت پسند تھیں۔ وہ اپنے ساتھی لڑکوں کے ساتھ ٹولیاں بنا کر کُو چھک چھک کرتا ہوا ایک لائن سے دوڑا کرتا تھا۔ کبھی دھڑم دھڑم کی آوازیں ایسے نکالتا جیسے ریل پُل پر سے گزر رہی ہے، کبھی اتنی تیزی سے چھک چھک کرتا جیسے گاڑی ہوا سے باتیں کر رہی ہے اور پھر اتنی لمبی چھیک چھیک چھاک چھاک کرتا جیسے پلیٹ فارم قریب آرہا ہے۔ اور پھر اپنے ساتھی لڑکوں کے ساتھ مل کر پان بیڑی سگریٹ اور چائے گرم کی آوازیں نکالنے لگتا۔ نوجوانی کی منزل میں داخل ہونے کے بعد بھی اسے ریل کے سفر میں خاص لطف آتا تھا۔ خصوصاً جب وہ 'شتابدی' سے سفر کرتا تھا، جو دلی اور لکھنو کے درمیان بہت ہی تیز اور صاف ستھری ٹرین مانی جاتی ہے اور جس میں اخبار اور منرل پانی سے لیکر ناشتہ اور کھانا تک فراہم کیا جاتا ہے اور لاؤڈ اسپیکر پر لکھنو کی تاریخ اور تہذیب کے گن گائے جاتے ہیں۔۔۔ لیکن آج وہ اسی 'شتابدی' کے سامنے لیٹ جائے گا۔ کٹ جائے گا۔

کو چھک چھک اور دھڑ دھڑ کرتی ہوئی ایک اور ٹرین دوسری پٹری پر سے گزر گئی۔ سرمئی بادلوں نے سورج کو اپنے آنچل میں چھپالیا۔ ہوا کے جھونکے جسم کو سہلا رہے تھے۔ دور تک ریل کی پٹریوں کا سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ درختوں کی قطاریں اور ان کے عقب میں کھیتوں کی جھولتی ہوئی بالیاں اور اکا دُکا جانور نظر آرہے تھے۔ انسانوں کا کہیں نام ونشان بھی نہیں تھا۔

وہ آج اپنی زندگی کو ختم کر دینا چاہتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ شتابدی ٹرین سہہ پہر کو ٹھیک تین بجے چار باغ اسٹیشن سے چلے گی اور پھر تھوڑی دیر میں اس پٹری پر سے گزرے گی اور وہ اس پٹری پر لیٹ جائے گا تاکہ ٹرین کے پہیے اس کے جسم کو کاٹتے ہوئے، چھک چھک کرتے گزر جائیں اور ان پٹریوں اور ان کے بیچ میں پڑے کنکڑوں کو لہولہان کر دیں اور دوسرے دن اخبارات میں شائع ہو کہ ایک عاشق نے اپنی وفاشعاری کا ثبوت دیا ہے اور اس کی محبت کی داستان لافانی ہو جائے۔

شاکر لکھنو کے ایک نواب سید آغا جانی کا بیٹا تھا۔ جن کے والد کے گھر کے دروازہ پر، کہا جاتا ہے، کہ کبھی ہاتھی بندھتا تھا۔ ۱۸۵۷ء کے انقلاب میں وہ انگریزوں کے خلاف لڑتے ہوئے شہید ہو گئے تھے۔ اور ان کی ساری جائداد انگریزوں نے ضبط کر کے کسی دوسرے کو دیدی تھی۔ بس ایک حویلی کے کھنڈھرات ان کے خاندان کے رہنے کیلئے بچے تھے، جن میں اب نواب آغا جانی اپنی بیگم اور بیٹے کے ساتھ رہتے تھے۔ نواب صاحب پرانے رکھ رکھاؤ کے انسان تھے۔ خاندانی عزت وشرافت پر فخر تھا۔ مگر کوئی قاعدہ کا کاروبار کرنے کی صلاحیت اور تجربہ نہیں تھا۔ مالی تنگیوں کا شکار رہتے تھے۔ مگر تنگ دستی کا اظہار کسی سے نہیں کرتے تھے۔ اہلیہ پر پردہ کی سخت پابندی تھی۔ ان کی نو اولادیں ہوئیں تھیں مگر شاکر کے علاوہ سب بچپن میں ہی اللہ کو پیاری ہو گئیں۔ لوگوں کا خیال تھا کہ ان کے گھر میں جنات بسے ہوئے ہیں، جو بچّوں کو اٹھالے جاتے ہیں۔ بعض لوگوں نے تو کئی کالی کالی بلیاں بھی آنگن میں گھومتی ہوئی دیکھی تھیں یا میاؤں میاؤں کی آوازیں سنی تھیں اور نواب صاحب کو مشورہ دیا تھا کہ وہ اس حویلی کو ان کی حفاظت میں چھوڑ کر کہیں اور چلے جائیں۔ نواب صاحب کی اولادوں میں بس شاکر ہی صحتمند پیدا ہوا تھا اور وہ بھی منتوں ودعا تعویذوں کا کرم تھا، اس لئے اس کے گال پر ہمیشہ ایک کالا تِل ہوتا اور گلے میں گنڈا اور بازوؤں پر تعویذ بندھے رہتے۔ اور اس بات کا خیال رکھا جاتا کہ وہ زیادہ محنت نہ کرنے پائے اور زیادہ پڑھائی سے بھی اس کی صحت پر برا اثر نہ پڑے۔ محلے ٹولے کے لڑکوں کے ساتھ کرکٹ اور فٹ بال کھیلنے سے بھی اسے منع کیا جاتا۔ بس لُوڈو، کیرم اور تاش وغیرہ کی اجازت تھی۔ حالانکہ شاکر کو جب بھی موقع ملتا محلے کے لڑکوں کے ساتھ دھما چوکڑی کیلئے پہنچ جایا کرتا اور لٹو نچاتا، کنچے کھیلتا اور پتنگوں کی ڈوریں لوٹتا۔

شاکر کو لاڈ پیار سے نزاکت کے ساتھ پالنے کے باوجود ایک انگریزی اسکول میں داخل کیا گیا اور دو پراوئیٹ ٹیچر رکھے گئے۔ ایک انگریزی پڑھانے کیلئے عیسائی ٹیچر اور ایک مولوی صاحب قران شریف پڑھانے کیلئے۔ مگر دونوں پر پابندی تھی کہ شاکر کے ساتھ ڈانٹ ڈپٹ اور مار پیٹ نہ کریں۔ اسکول میں بھی اگر کوئی ٹیچر پیٹ دیتا تو نواب صاحب جا کر ہیڈ ماسٹر سے شکایت کرتے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ شاکر کلاس میں بار بار فیل ہوا اور انٹر میں تب پہنچا جب اس کے بعض ہم عمر ساتھی بی اے اور ایم اے پاس کر چکے تھے۔

زیادہ تعلیم نہ حاصل کر سکنے کے باوجود محلّے میں شاکر کی عزت تھی۔ وہ نواب صاحب کا بیٹا تھا، جو ایماندار، متقی اور پرہیز گار سمجھے جاتے تھے۔ بڑی سی حویلی میں رہتا تھا۔ دیکھنے میں خوبرو اور صحتمند تھا۔ اس لئے محلّہ کی لڑکیاں اکثر کنکھیوں سے اسے دیکھا کرتی تھیں۔ خوش مزاج اور ملنسار تھا اور دوسروں کا احترام کرتا تھا اس لئے پڑوسی بھی شفقت اور محبت سے پیش آتے تھے۔ خصوصاً لالہ بنواری لال تو اس پر بہت ہی مہربان تھے۔

لالہ بنواری لال ایک بڑے مہاجن تھے اور اس کے پڑوس میں رہتے تھے۔ وہ سود پر قرضے دیا کرتے تھے۔ نواب صاحب کی بیگم کے بہت سے جوہرات گروی رکھ کر اپنے قبضے میں کر چکے تھے اور اب حویلی کو گروی رکھ کر اس پر قبضہ کرنے کے خواب دیکھ رہے تھے۔ اس لئے شاکر سے بہت محبت سے پیش آتے تھے۔ کبھی کبھی اپنی بیٹھک میں بلا کر دیر تک اس سے ہمدردی جتاتے اور

خاندانی حالات پوچھا کرتے۔ان کی بیٹی روپا اکثر مسکراتی اور اٹھلاتی ہوئی اس کے قریب سے گزرتی اور وہ اپنے سینے میں ایک میٹھا سا درد محسوس کیا کرتا۔

شاکر اب نوجوانی کی منزل سے گزر رہا تھا۔روپا بھی اب سیانی ہوگئی تھی۔عنفوانِ شباب کی علامتیں اور خدوخال ابھرنے لگے تھے۔اسکرٹ کی جگہ اب وہ ساری پہننے لگی تھی۔اس کی شربتی آنکھوں کی کشش، گالوں کی سرخی، سینے کے مدوجزر، سڈول مرمریں جسم کا جادو اور آواز کا ترنم شاکر کو مسحور کر رہے تھے۔

کبھی کبھی وہ اپنی کیاری میں سے کوئی پھول توڑ کر چپکے سے روپا کو پکڑا دیتا اور وہ اسے لے کر ہنستی ہوئی گھر کے اندر چلی جاتی یا ہولی اور دیوالی پر جب وہ لالہ جی کو بدھائی دینے کیلئے جاتا تو وہ آس پاس دیکھ کر برفی یا قلاقند کا کوئی ٹکڑا چپکے سے اس کے منہ میں ٹھونس دیتی اور ہنستی ہوئی بھاگ جاتی۔

آخر ایک دن جب وہ لالہ جی کو دیوالی کی بدھائی دینے کیلئے گیا تو وہ گھر پر نہیں تھے۔دروازہ روپا نے ہی کھولا اور برفی کا ایک ٹکڑا لا کر اس کے منہ میں ڈال دیا۔پھر جیسے ہی وہ دروازہ بند کرنے لگی شاکر نے اس کا ہاتھ پکڑ کر ایک گلاب کا پھول اسے تھما دیا اور بولا:

''رُوپا،تم مجھے بہت اچھی لگتی ہو۔''

''دھت!''اتنا کہہ کر روپا نے دروازہ بند کر لیا اور گھر کے اندر چلی گئی۔

پھر اس نے کبھی لالہ جی کے گھر کا رخ نہ کیا۔نا ہی روپا اس کے گھر کے قریب سے گزری۔شاکر کے والد نے گروی پر حویلی کو دے کر لالہ سے جو قرضہ لیا تھا اس کا سود بھی اب بہت بڑھ گیا تھا اور حویلی میں اداسی چھائی رہتی تھی۔پھر بھی نواب صاحب نے بیٹے کو کسی طرح سے انٹرمیڈیٹ کروا کر اسے یونی ورسٹی میں بھرتی کروا دیا۔شاکر نے ہسٹری کے شعبے میں داخلہ لیا کیونکہ روپا بھی اب یونی ورسٹی میں یہی مضمون پڑھ رہی تھی۔اس کے حسن اور کشش میں اور اضافہ ہو گیا تھا بچپن کے الھڑ پن کی جگہ جوانی کی شوخیاں انگڑائیاں لے رہی تھیں۔

پرانی یادیں تازہ ہوئیں، پھر دوستی بڑھی اور پھر وہ محبت میں تبدیل ہو گئی اور پھر چھپ چھپ کر ملاقاتیں ہونے لگیں۔

''روپا میں تمھارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔''شاکر نے اس سے کہا۔

''میں بھی تمھیں بہت چاہتی ہوں۔مگر شاکر میرے پتا جی ہم دونوں کا ساتھ گوارہ نہیں کریں گے۔وہ خودکشی کر لیں گے۔میں بھی انھیں بہت چاہتی ہوں۔بچپن میں جب میری ماتا جی کی مرتیو ہوگئی تو اس کے بعد سے انھوں نے مجھے ماں کی طرح پالا ہے۔''روپا نے اداس لہجے میں کہا۔''مگر میں تمھیں بھی نہیں چھوڑ سکتی۔میں پاگل ہو جاؤں گی۔تم میرا جیون ہو۔''

''تم بھی میری زندگی ہو۔''شاکر نے یقین دلایا۔''میں بھی لالہ جی کی بہت عزت کرتا ہوں۔انھیں کیسے منہ دکھاؤں گا۔سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں۔''

پھر ایک دن روپا نے بتایا:''پتا جی میرے لئے لڑکا ڈھونڈھ رہے ہیں، کیا کروں شاکر؟''

''تو چلو، میں چلتا ہوں ان کے پاس۔میں بھی تو لڑکا ہی ہوں۔''

''مذاق نہ کرو شاکر۔ میں سچ کہہ رہی ہوں۔ وہ میرا رشتہ اپنی برادری میں کریں گے۔اور پھر تمھارا تو مذہب ہی دوسرا ہے''

''پریم کا کوئی مذہب نہیں ہوتا روپا۔ پریمیوں کا دھرم پریم ہوتا ہے۔''

''مگر دنیا اس سب کو نہیں مانتی۔ ہمارا سماج بہت کنزرویٹو ہے۔مگر میں تمھارے بنا نہیں رہ سکتی۔''

روپا کی آنکھوں سے بے تحاشہ آنسو جاری تھے۔

''میری نظروں میں بس اچھا انسان ہونا ضروری ہے۔اچھے برے تو سب دھرموں میں ہوتے ہیں۔دھرتی جب دھان اگاتی ہے تو یہ نہیں کہتی کہ یہ کسی ایک خاص دھرم کے لوگوں کیلئے ہے۔بھونرا جب پھول پر نچھاور ہوتا ہے تو وہ یہ نہیں سوچتا کہ اس پودے کو کس دھرم کے مالی نے لگایا ہے۔بلبل کے گیت، کوئل کی کوک اور پپیہے کی پی کہاں اور بلبل کے نغمے کسی ایک دھرم کیلئے نہیں ہوتے۔کوئی دھرم یہ نہیں کہتا کہ پیاسے کو پانی پلانے سے پہلے اس کا نام اور دھرم پوچھ لو۔انسان کو جب تڑپتا ہوا دل دیا گیا ہے تو یہ نہیں کہا گیا ہے کہ وہ حسن کیلئے نہ تڑپے۔''

''فلاسفی نہ بگھارو، شاکر، میں سنجیدہ ہوں۔ یہاں جان کا سوال ہے۔''

''تو پھر کیا کروں روپا؟''

''میں کچھ نہیں جانتی۔''روپا اپنے آنسو پونچھ کر چلی گئی۔

شاکر دیر تک خلاء میں گھورتا رہا جیسے پوچھ رہا ہو:

''کیا کسی دوسرے مذہب کی لڑکی یا لڑکے سے پریم کرنا سچ مچ جرم ہے؟ کیا ہمارے دھرم واقعی اتنے بے رحم ہیں؟

پھر اللہ تعالیٰ نے دل کیوں دیا ہے؟ دل میں محبت کیوں پیدا کی ہے؟ کیا دو مختلف دھرموں کے ماننے والوں کے سنگم سے انسانیت کا بھلا نہیں؟ کیا پیار رنگ ونسل، مذہب وملت، ذات پات، برادری تک محدود ہونا چاہئے؟ اور اگر ایسا ہی ہے تو اسکی حد کیا ہوگی؟ دوسرے مذہب میں نہ کرو۔ دوسری ذات میں نہ کرو۔دوسرے قبیلے اور دوسرے پیشے کے لوگوں میں نہ کرو۔آخر یہ اختلافات ختم کیوں نہیں ہوتے؟''

روپا کئی دن تک یونیورسٹی میں نہیں آئی۔شاید بیمار تھی۔شاکر کا دل پڑھائی میں نہیں لگتا تھا۔اس نے کئی بار سوچا کہ روپا کے گھر جا کر خیریت معلوم کرے۔مگر ہمت نہ پڑی۔

پھر ایک دن جب روپا یونی ورسٹی میں آئی تو بہت پریشان تھی:

''شاکر، پتا جی نے میرے لئے لڑکا دیکھ لیا ہے۔ وہ رشتہ طے کر

رہے ہیں۔ دلی کا رہنے والا ہے۔ وہاں بزنس کرتا ہے۔ میں آ تم ہتیا کرلوں گی''
''ایسا نہیں کہتے روپا!'' شاکر نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔
''تو چلو ہم یہاں سے بھاگ نکلیں۔ میں بالغ ہوں شاکر!''
''نہیں!'' شاکر کے منہ سے ایک گھٹی سی چیخ نکل گئی۔ دونوں پیپل کے پیڑ کے نیچے بیٹھے دیر تک روتے رہے۔ سورج شرم سے بادلوں کی اوٹ میں چھپنے لگا۔ زرد پتے پیڑ سے گرتے رہے۔

روپا اور شاکر کسی کو بتائے بغیر کانپور چلے گئے۔ وہاں انھوں نے عدالت میں سوِل میرج کی درخواست دینے کی کوشش کی۔ مگر انھیں کسی وکیل کی ضرورت تھی اور وہ فوراً فراہم نہ تھا۔ دوسرے دن وہ عدالت میں جانے کیلئے ہوٹل سے نکل ہی رہے تھے کہ پولیس نے شاکر کو گرفتا کر لیا۔ اس پر روپا کے اغوا کا الزام تھا۔ اس نے قسمیں کھائیں کہ روپا اپنی مرضی سے آئی ہے۔ وہ بالغ ہے۔ روپا نے بھی تصدیق کی۔ مگر پولیس نے کوئی اعتبار نہیں کیا۔ شاکر کی ہر دلیل کا جواب پولیس کی لاٹھی اور گھونسے تھے اور لالہ جی کی دائر کی ہوئی رپورٹ تھی۔

آج کئی مہینوں کے بعد اسے جیل سے رہا کیا گیا تھا۔ روپا نے بیان دیا تھا کہ وہ اپنی مرضی سے اس کے ساتھ گئی تھی۔ مگر اب اس کے ساتھ نہیں جائے گی۔ اپنے پتا جی کی مرضی پر چلے گی۔ اور اس کے پتا نے مقدمہ واپس لے لیا تھا۔ جیل میں اسے صرف اتنا بتایا گیا کہ لالہ جی نے مقدمہ واپس لے لیا ہے اس لئے اسے رہا کیا جارہا ہے۔

شاید اس کی محبت جیت گئی ہے۔ اس نے سوچا۔ اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ وہ جیل کی سختیوں کو بھول گیا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ فوراً اپنے باپ کے سامنے سر جھکا کر ان کو جو تکلیفیں ہوئی ہیں ان کے لئے معافی مانگ لے اور ماں کے سینے سے چمٹ جائے۔ لالہ جی کی ڈیوڑھی پر جا کر انھیں نمسکار کرے اور کہے کہ چھما کیجئے، مجھے پہلے آپ سے اجازت مانگنی چاہئے تھی۔ اور پھر روپا کو بازوؤں میں لے کر اتنا پیار کرے کہ اس کے دونوں گال سرخ ہو جائیں۔

لیکن جب شاکر اپنے باپ کی حویلی پر پہنچا تو پھاٹک پر تالا پڑا ہوا تھا۔ اس کے ماں باپ کہیں اور چلے گئے تھے۔ اور ان کی خاندانی حویلی اب لالہ بنواری لال کی ملکیت تھی۔

لالہ جی کے گھر کے سامنے شہنائی کی سریلی آواز گونج رہی تھی۔ ان کا گھر رنگ برنگی جھنڈیوں اور قمقموں سے سجا ہوا تھا۔ مہمانوں کے قہقہے گونج رہے تھے۔ گھر کے سامنے گلی میں دور تک لوگوں کی بھیڑ لگی ہوئی تھی۔
''یہ کیسا جشن ہے؟'' اس نے ایک لڑکے سے پوچھا۔
''لالہ جی کی بیٹی کا بیاہ ہے۔ منڈپ میں پھیرے لے رہی ہے۔ برات کل تیسرے پہر 'شتابدی' سے دلی واپس جائے گی۔'' اسے بتایا گیا۔
شاکر کچھ کہے بغیر آگے بڑھ گیا اور خیالات میں گم آوارہ گھومتا رہا۔ وہ رات اس نے ایک پارک کی بنچ پر گزاری اور دوسرے دن 'چار باغ' ریلوے اسٹیشن پر بھٹکتا رہا۔

اس کی روپا اس سے چھین لی گئی تھی۔ والدین بچھڑ گئے تھے۔ خاندانی حویلی چھین لی گئی تھی۔ کئی مہینے جیل میں گزارنے کے بعد نام پر کالا دھبّہ لگ گیا تھا۔ اب نہ کسی نوکری کی امید تھی نہ عزت و وقعت کی۔ زندگی تاریک تھی۔ اب وہ جی کر کیا کرے گا۔ اس نے گھڑی دیکھی۔ شتابدی کے آنے کا وقت ہو رہا تھا۔ اب اسے اسی ریل کی پٹڑی پر لیٹ جانا چاہئے۔

دور سے ٹرین آتی ہوئی نظر آئی۔ یہ ضرور شتابدی ہے۔ اس نے سوچا۔ سیٹی کی آواز، چھک چھک، پتوں کی سرسراہٹ اور گھڑگھڑاہٹ۔ اس کے دل کی دھڑکنیں تیز ہوتی گئیں۔ ''روپا، روپا، روپا'' اس کی آواز جنونی ہونے لگی۔ وہ ریل کی پٹڑی پر ساکت کھڑا روپا کو پکار رہا تھا۔ ٹرین قریب آتی جارہی تھی۔

اچانک اسنے دیکھا ایک بکری کا بچہ بھاگتا ہوا ریل کی پٹڑیوں کے بیچ میں آگیا ہے اور 'میں، میں' کر رہا ہے۔

ٹرین قریب آتی جارہی تھی۔ انجن اور بکری کے بچّہ میں فاصلہ زیادہ نہیں رہ گیا تھا۔ اس نے جست لگائی اور بکری کے بچّے کو گود میں لے کر دور تک لڑھکتا ہوا چلا گیا۔ شتابدی چھک چھک، دھڑ دھڑ کرتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔ اور پھر نظروں سے اوجھل ہوگئی۔

بکری کا بچّہ ابھی بھی اس کی گود میں دبا ہوا 'میں، میں' کر رہا تھا۔ شاکر کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ ریل کی فولادی سیاہ پٹڑیاں چمک رہی تھیں۔ پیڑوں پر جیسے ہریالی چھا گئی تھی اور پتوں سے مدھر سرگم پھوٹ رہے تھے۔ سورج ابھی بھی بادلوں سے اٹکھیلیاں کر رہا تھا اور دور کھڑے کچھ کسان اسے حیرت سے دیکھ رہے تھے۔

شاکر نے بکری کے بچّے کے ماتھے پر ہاتھ پھیر کر پیار کیا اور اسے گود سے اتار کر زمین پر چھوڑ دیا، بغیر یہ سوچے کہ وہ کہاں سے آیا ہے؟ اس کا مالک کون ہے؟ کیا نام ہے؟

بکری کا بچّہ 'میں، میں' کرتا ایک کھیت میں غائب ہوگیا۔

''باعثِ شرمندگی''

نیویارک میں واک اینڈ ٹاک تھیراپی کے ڈائریکٹر کلے کا کریل کا کہنا ہے کہ ماہرِ نفسیات دولت مند افراد کو تنہائی کا شکار بتلاتے ہیں۔ امریکہ کی امیر ترین آبادی کا ایک فیصد حصہ بہت زیادہ امیر ہونے کے باعث احساسِ شرمندگی کا شکار ہے۔ شاندار گھر، برانڈ نیو کار، پھلتا پھولتا کاروبار اور بے شمار بینک بیلنس کے باعث وہ عام آدمی سے کٹ کر رہ گئے ہیں۔ لہٰذا جو لوگ دولت کو ہی سب کچھ سمجھتے ہیں انہیں اپنے خیال سے رجوع کرنا چاہیے۔

فیصلہ

بلراج بخشی

(جموں، کشمیر)

سردی ہڈیوں کو چیرتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

جج مظفر علی رانا نے لحاف کو اور کس کر اپنے ارد گرد لپیٹا، شیر چائے کی چسکی لی اور ٹیلیوژن کی طرف دیکھا۔ چھوٹے پردے پر کوئی سوامی یوگا کے فائدے گنوانے کے بعد ذیابطیس کے علاج کے لیے یوگا کی مشقیں سمجھا رہا تھا۔ جب مجھے ذیابطیس ہو گی تو دیکھا جائے گا، رانا نے لاپرواہی سے سوچا اور ریموٹ کنٹرول سے چینل بدل دیا۔ یہاں کوئی جیوتشی مہاراج مسیحی کیلنڈر کے حساب سے تاریخ پیدائش کے مطابق دن بھر میں ہو سکنے والے واقعات کی پیشین گوئی کر رہے تھے۔ اس نے چینل بدلا۔ اب تین معروف صحافی جنوبی ایشیا اور مشرق وسطیٰ میں مغربی طاقتوں کی بالواسطہ یا بلاواسطہ مداخلت سے خطے میں نیوکلیائی جنگ کے امکانات پر بحث کر رہے تھے۔ رانا نے پھر چینل بدلا۔ یہ ایک نیوز چینل تھا۔ میزبان کہہ رہا تھا۔

'....اور آج بارہویں دن بھی بھدرواہ کے علاقے کا باقی ملک سے زمینی رابطہ کٹا رہا۔ بارہ روز پہلے چار دن تک ہونے والی لگاتار بارشوں اور برفباری سے اونچے اونچے پہاڑوں سے بڑی بڑی چٹانیں کھسک آئی تھیں جس سے سڑک پر گاڑیوں کا چلنا بند ہو گیا اور دو سو سے زیادہ مال بردار اور مسافر گاڑیاں برف میں پھنس گئیں جن میں سوار تقریباً دو ہزار مسافروں کے پاس انتظار کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔ برف میں پھنسے مسافروں کو اب ہیلی کاپٹروں کے ذریعے نکالا جائے گا، ایسا کہا جا رہا ہے۔ ہماری رپورٹر انجلی ورما وہاں موجود ہیں۔ انجلی وہاں کیا چل رہا ہے؟'

پردے پر منظر بدلا اور ایک جواں سال عورت سامنے آئی جس کے پس منظر میں برف ہی برف تھی۔ وہ گرم کپڑوں میں ملبوس تھی۔ اس کے سر پر سمور کی ٹوپی، ہاتھوں میں چرمی دست پوش اور گلے میں اونی مفلر تھا۔ جب وہ بولی تو اس کے منہ سے بخارات نکلنے لگے:

'جی... میں اس وقت جموں سے کشمیر جانے والے نیشنل ہائیوے NH-1A پر بٹوت کے مقام پر ہوں۔ یہاں سے ضلع کشتواڑ' ڈوڈہ اور بھدرواہ کے لیے اسی کلومیٹر سڑک الگ ہو جاتی ہے۔ یہ دیکھیے...' اس نے اپنا ہاتھ ایک طرف اٹھاتے ہوئے کہا اور اس کے ساتھ ہی کیمرا بھی گھوم گیا'... چاروں طرف برف ہی برف ہے۔ اس موسم میں برف تو ہر سال گرتی ہے اور دو تین دنوں کے لیے راستہ بھی بند ہو جاتا ہے مگر اس بار گیارہ دنوں سے راستہ بند ہے۔ چٹانوں کے کھسکنے کی وجہ درختوں کا بے تحاشہ کٹاؤ ہے یا موسم کا بدلاؤ، برف میں پھنسے لوگوں کو اس سے دلچسپی نہیں ہے... وہ تو صرف یہ جاننا چاہتے ہیں کہ ان کی پریشانیاں کب ختم ہونگی۔ یہاں کے ڈپٹی کمشنر نے ہمیں بتایا کہ ائرفورس کے ہیلی کاپٹروں نے مسافروں کے لیے نہ صرف کھانے کے پیکٹ بلکہ میڈیکل ٹیمیں بھی اتاری ہیں۔ وہ ہمارے ساتھ یہیں...' اور بجلی چلی گئی۔

جج مظفر علی رانا نے سموار سے خالی کپ میں شیر چائے انڈیلی اور چسکی لی۔ شیر چائے اور نون چائے دراصل کشمیر کا خاصہ ہیں لیکن جموں ڈویژن میں ہونے کے باوجود چونکہ ڈوڈہ اور کشتواڑ کے پہاڑی اضلاع کا سلسلہ کشمیر سے جا ملتا ہے اس لیے شیر چائے اور نون چائے یہاں کے معمول کا بھی حصہ بن گئی ہیں۔ جبکہ عام چائے اسی وقت پی لی جاتی ہے لیکن ان چایوں کو گھنٹوں رکھا جا سکتا ہے۔ شیر چائے نمکین یا میٹھی ہو سکتی ہے لیکن اس میں دودھ ضرور ہوتا ہے جبکہ نون چائے میں دودھ تو ہو سکتا ہے لیکن یہ نمکین ہی ہوتی ہے۔ رانا نے سموار کے پیندے میں لگی جالی کے اندر بجھتے انگاروں کو دیکھا۔ سموار میں موجود چائے کو گرم رکھنے کے لیے ان میں مزید کوئلے ڈالنے پڑیں گے، اس نے سوچا اور تانبے سے بنے سموار کی سطح پر کندہ پھولوں اور بیلوں کے پیچیدہ نقش و نگار دیکھنے لگا۔ بیچارہ سموار، اس نے سوچا۔ نہ جانے کتنی صدیوں پہلے ازبکستان سے جانے کن دشوار گزار اور طویل راستوں کو طے کر کے یہ سموار کشمیر کی وادی میں پہنچا اور پھر یہاں کے گھریلو سامان کا لازمی حصہ بن گیا۔ لیکن اب الیکٹرک کیٹل اور تھرموس فلاسک کے بالمقابل مسلسل شکست خوردگی سے داستان پارینہ بنتا جا رہا تھا۔

کلچر... رانا نے چائے کا ایک بڑا سا گھونٹ بھر کر سوچا، جدید تکنالوجی نے لاتعداد اشیائے آسودگی بنا کر اس لفظ کے معانی ہی بدل دیے ہیں۔ لیکن کلچر تو کبھی مستقل نہیں رہتا، یہ تو ہمیشہ تغیر پذیر ہوتا ہے.. ایک یا دو ہزار سال کا کلچر تو آج کسی معاشرے کے پاس بھی نہیں ہے۔ کلچر تو بدلتا رہتا ہے، رانا نے سوچا اور پھر اسے خیال آیا کہ عدالت جانے کے لیے تیار بھی ہونا ہے۔

لحاف کی محفوظ حرارت سے باہر نہ نکلنے کی فطری خواہش کو بے رحمی سے نظرانداز کرتے ہوئے وہ طوعاً و کرہاً بستر سے اترا اور ذہنی طور پر برفیلے موسم سے نبرد آزما ہونے کو تیار ہونے کے لیے بڑی احتیاط کے ساتھ کھڑکی کا ایک پٹ کھولا لیکن پھر اسے غیر ارادی طور پر ایک قدم پیچھے ہٹنا پڑا۔ یوں لگا جیسے کسی نے کھڑکی کے باہر سے ڈھیر ساری سردی اس کے منہ پر دے ماری ہو۔ یکبارگی سارے جسم میں ایک کپکپی دوڑ گئی۔ چائے کا کپ ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھا۔ اس نے جلدی سے ایک گھونٹ بھر کر کھڑکی سے باہر دیکھا۔

حد نظر تک سفید چادر بچھی ہوئی تھی۔ برف کی تہ اس قدر دبیز تھی کہ باہر زمین کے خدوخال میں کسی قسم کا شناختی نشان نظر ہی نہیں آ رہا تھا۔ حد نظر تک

برفستان بن گیا تھا۔

'ساب...'

رانا نے مڑ کر دیکھا۔ یہ سرکاری اردلی سلیمان تھا جو صبح سے شام تک گھر اور عدالت میں اس کے ساتھ ہی رہتا تھا۔

'ساب...ناشتہ کب لگاؤں...؟'

'آج کیا ہے....ناشتے میں...؟'

'آلو ہیں...اور... پراٹھے...'

جج رانا نے برا سا منہ بنایا۔ نہ انڈے نہ مکھن۔

'ٹھیک ہے... میں آدھے گھنٹے میں آ رہا ہوں...' سلیمان واپس چلا گیا۔

وہ واپس مڑ کر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ آلو اور پراٹھے، اس نے مایوسی میں برا سا منہ بنایا۔ پانچ دن پہلے ہی دکانوں پر انتہائی مہنگے داموں گوشت کی آخری بوٹی تک کے لیے لوگوں میں دھکم پیل کے ساتھ قصابوں کی منت سماجت کا وقت بھی چلا گیا۔ سبزیاں بھی کب کی ختم ہو گئی تھیں اور اب دالوں کی باری تھی۔ سنا ہے آج یا کل جموں سے راشن اور سبزیاں بذریعہ ہیلی کاپٹر منگوائی جا رہی ہیں۔ برف کا قہر اب کے طویل ہو گیا ہے، رانا نے سوچا اور اچانک اسے احساس ہوا کہ صبح سے اس نے ایک سگریٹ بھی نہیں پیا اور اس کی وجہ تھی کمرے کی بند کھڑکیاں ۔ دھوئیں کے اخراج کے لیے کوئی رخنہ بھی نہیں تھا اور اس کی بیوی کو کمرے میں سگریٹ کا دھواں سخت ناپسند تھا۔

رانا نے کھڑکی کے مزید قریب ہو کر سگریٹ سلگایا اور ایک بھرپور کش لے کر منہ اور ناک سے دھواں نکالنے لگا۔ آلو اور پراٹھے، اس کا موڈ خراب ہو گیا۔ پانچ دنوں سے اس کی زبان گوشت کی ایک بوٹی کے لیے ترس گئی تھی۔

چھوٹا کشمیر کہے جانے والے بھدرواہ کا علاقہ پہلے ہماچل پردیش کا حصہ تھا جسے 1846ء کے آس پاس یہاں کے ایک مقامی جنگجو شکلو کوتوال نے چمبہ کے راجا سے آزاد کروا کر مہاراجا گلاب سنگھ کی عملداری میں شامل کر دیا۔ اور اب بٹوت سے یہاں تک اسی کلومیٹر لمبی سڑک ہی اس سارے خطے کی شہ رگ ہے۔ اس سڑک کے مسدود ہو جانے سے بازار میں اشیاء ضرور یہ کا ذخیرہ تو پانچ چھ ہی دنوں میں ختم ہو گیا اور اب سرکاری گوداموں میں موجود اناج کے ذخیروں کی تقسیم کاری کا اہتمام کیا جا رہا تھا۔ ممکن الحصول گوشت کو تو مقامی آبادی، یہاں تعینات فوجی اور نیم فوجی سیکیوریٹی عملے نے کب کا ہضم کر لیا تھا۔ لیکن آلو اور پراٹھے! رانا نے نہ جانے کتنویں بار برا سا منہ بنایا۔ لیکن اس کا کوئی علاج نہیں تھا۔ اس نے ایک گہرا کش لیا اور برف پوش پہاڑی سلسلوں پر نظر دوڑانے لگا۔

بھدرواہ کا یہ چھوٹا سا قصبہ ایک وسیع و عریض وادی ہے جسے بہت اونچے اونچے پہاڑوں نے گھیر رکھا ہے جو گرمیوں میں بھی عموماً برف سے ڈھکے رہتے ہیں۔ پہاڑ اتنے قریب ہیں کہ یوں لگتا ہے جیسے ہاتھ بڑھا کر انہیں چھوا جا سکتا ہے۔ ان میں دیودار اور کائل کے درختوں سے بھرے جنگل ہیں جن میں ہرن سے لے کر ریچھ تک ملتے ہیں۔ اس موسم کے دوران صفر سے بھی نیچے گر جانے والے درجۂ حرارت میں صرف سخت جان جانور ہی ان پہاڑوں میں رہ سکتے ہیں اور شکار تو ہمیشہ نیچے اتر آتا ہے۔ جب وہ کالج میں پڑھتا تھا تو اس موسم میں بارہ بور کی بندوق ہاتھ میں لے کر ماں کو کہتا تھا کہ وہ پیاز کاٹ کر لہسن اور ادرک پیس کر رکھے۔ اور پھر وہ سچ مچ ایک یا دو گھنٹوں میں جنگلی مرغ کا شکار کر کے لے آتا تھا۔ کئی بار عدیم الحصول نیل یا پاڑھا بھی ہاتھ لگ جاتا۔ اور یہ اتنی جلد ہو جاتا کہ لگتا تھا جنگل میں شکار نہیں کیا بازار سے خرید لائے ہیں۔ لیکن یہ پرانی بات ہے۔ رانا نے سگریٹ کا کش لگاتے ہوئے سوچا' گزشتہ بیس برسوں میں ملی ٹینسی بڑھنے سے اب فائر کرنا تو درکنار، لائسنس یافتہ بندوق لے کر چلنا بھی دشوار تھا۔ فائر کی آواز ہی سے سیکیوریٹی فورسز الرٹ ہو جاتی تھیں اور فائر کرنے والا دشواری میں پڑ سکتا تھا چاہے اس نے ہوا ہی میں فائر کیوں نہ کیا ہو۔

یہ ملی ٹینسی کا مثبت پہلو تھا، جج رانا تلخی سے مسکرا کر سر ہلانے لگا۔ جنگلوں میں جانور محفوظ ہو گئے تھے اور شکار بکثرت دستیاب تو تھا لیکن اب شکار کرنا مشکل ہو گیا تھا۔ شکار کی تعداد اتنی بڑھ گئی تھی کہ پچھلے کئی برسوں سے اس موسم میں اکثر لوگوں کے گھروں میں گھس آتا تھا۔ ملی ٹینسی کے بھی فائدے ہو سکتے ہیں، اس نے حیرت سے سوچا۔ جیسے دیر رات لوگوں کی مٹر گشتی کا ختم ہونا، ملی ٹینسی کے شکار لوگوں کو سرکاری ملازمتیں ملنا، سنیما گھروں کے بند ہو جانے سے اخلاقی قدروں میں اضافہ کے امکانات کا انتظار کرنا۔ اسکولوں میں ملی ٹینسی کے فوائد پر مباحث کروانے چاہئیں اس نے سوچا اور سگریٹ کے ختم ہونے سے پہلے ایک آخری کش لے کر اسے باہر اچھال دیا۔ وہ کھڑکی بند کر کے واپس مڑا۔

صبح کے ساڑھے آٹھ بج چکے تھے اور جج مظفر علی رانا کا عدالت جانے کا وقت ہو گیا تھا۔ اردلی سلیمان نے آ کر اطلاع دی کہ پولیس کے دو باڈی گارڈ آ گئے ہیں۔ جج کی سرکاری رہائش گاہ سے احاطۂ عدالت تک محکماتی کار میں صرف پانچ منٹوں کا سفر تھا۔ لیکن برفباری کی وجہ سے کیونکہ گاڑیوں کی نقل و حرکت معطل تھی اس لیے پیدل سفر میں پندرہ بیس منٹ لگ جاتے تھے۔ حالآنکہ مقدمات کی باقاعدہ سنوائی دس بجے شروع ہوتی تھی لیکن کئی قسم کے کاغذات اور دستاویزات کی رجسٹری کے لیے نو بجے کا وقت معین تھا اس لیے نو بجے اس کا عدالت کی کرسی پر ہونا ناگزیر تھا۔

رانا نے آخری بار قدِ آدم شیشے کے سامنے کوٹ کا کالر اور ٹائی کی گرہ درست کی اور کمرے سے باہر آ گیا۔ بیگم کو سخت تاکید تھی کہ وہ سرکاری عملے کے آنے کے بعد سامنے نہ آئے اور پیچھے سے آواز بھی نہ لگائے۔ رانا سرکاری رہائش گاہ سے نکلا۔ اس کا بریف کیس ہاتھ میں لیے سلیمان اس سے ایک قدم پیچھے تھا اور دونوں سیکیوریٹی گارڈز دو قدم پیچھے۔ جج کے عہدے کے وقار کے لیے پولیس کے دو سپاہی حالآنکہ کافی تھے مگر ملی ٹینسی کے اس دور میں محافظوں کی یہ تعداد قطعی

ناکافی تھی، پتہ نہیں کس فریق کے تعلقات کس ملی ٹینٹ گروپ سے ہوں۔

رانا چلتا رہا۔ برف جم گئی تھی۔ مقامی بلدیہ کے ملازمین نے بڑی مشکل سے برف کاٹ کاٹ کر چلنے کے لیے راستہ بنایا تھا۔ سڑکوں اور گلیوں کی دونوں اطراف میں بنی ڈھلواں نالیوں میں پگھلتی برف کا پانی ایک واضح شور کے ساتھ نیرو نالے کی طرف رواں تھا۔ آج مطلع تو صاف تھا پر چمکتی ہوئی دھوپ ٹھنڈی تھی۔ سیری بازار سے گزرتے ہوئے اس نے دیکھا کہ بسوں، ٹیکسیوں اور مال بردار گاڑیوں پر جمی ہوئی برف آہستہ آہستہ پگھلنا شروع ہوگئی تھی۔ لوگ کشمیری چغے ,فرن پہنے آجا رہے تھے۔ دکانیں خالی خالی تھیں۔

راستے میں رانا کو کئی لوگ ملے جو ادب سے سلام کر کے احتراماً سامنے سے ہٹ گئے۔ اپنے آبائی شہر میں بطور افسر تعیناتی کا مزہ ہی اور ہے۔ اپنے مخالفین یا وہ لوگ جو آپ کے خاندان کو خاطر میں نہیں لاتے تھے اور وہ بھی جو آپ سے لگّا کھاتے ہیں، جب ان کے ہاتھ بے ارادہ ہی سلام کو اٹھ جاتے ہیں تو اچھا لگتا ہے۔ یہ سوچ کر اسے اطمینان محسوس ہوا کہ ان میں سے بہتیرے تھے جو بلا کسی غرض اس کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے کچھ بھی کر سکتے تھے۔ لیکن ان حالات میں ان سے بھی یہ توقع نہیں رکھی جا سکتی تھی کہ وہ رانا کے دسترخواں پر گوشت کی ایک قاب کا اضافہ کر سکتے، رانا نے سوچا اور اس کے منہ کا ذائقہ خراب ہوگیا۔ پانچ چھ دنوں سے بس دال اور چاول۔ یہ حکومت پتہ نہیں کب کچھ کرے گی۔ ہیلی کاپٹروں سے اگر آٹا، چاول اور سبزیاں آسکتی ہیں تو بکرے اور بھیڑیں کیوں نہیں یا کم سے کم برائیلر تو آ ہی سکتے ہیں۔ کیا حکومت میں کوئی بھی ایسا نہیں ہے جس کی عقل سلیم میں آئے کہ انسان بے شک ایک ہمہ خور جانور ہے لیکن گوشت خوروں کے لیے اس سے بڑھ کر کوئی سزا نہیں ہوسکتی کہ پانچ دنوں تک گوشت کی ایک بوٹی تک نصیب نہ ہو۔ وہ جھنجھلا گیا۔ اسے اس طرح غصے میں نہیں آنا چاہیے، اس نے سوچا، جھنجھلاہٹ میں کہیں کوئی غلط فیصلہ نہ ہو جائے۔ اس کے چہرے کے عضلات ڈھیلے ہوگئے اور وہ معمول پر آگیا۔

اچانک ایک طرف سے کچھ شور سنائی دینے لگا جو بتدریج بڑھتا ہی گیا۔ رانا نے ادھر مڑ کر دیکھا۔ کوئی دس پندرہ لوگ جن میں زیادہ تر بچے تھے، دوڑتے ہوئے اسی طرف آرہے تھے۔ کوئی پریشانی کی بات نہ ہو، اس نے سوچا اور تھوڑا ہٹ کر رک گیا۔ کوئی جلوس بھی ہوسکتا تھا۔ حالآنکہ بھدرواہ میں کبھی فرقہ وارانہ فساد نہیں ہوئے لیکن فرقہ وارانہ جلوس کبھی بھی نکل جاتے تھے اور ان کا محرک کچھ بھی ہوسکتا تھا۔ بارش ہو جائے تو جلوس نہ ہو تو جلوس۔ بارش کم ہو تو جلوس زیادہ ہو تو جلوس۔ لوگوں کی سوچ، ان کی عصبیتیں اور ذہنی تحفظات غیر منطقی طور پر کس قدر حساس ہوگئے ہیں اور یہ رجحان جمہوری طرز فکر کے عین مخالف ہے، رانا نے مایوسی سے سوچا۔

لوگ اور قریب آگئے تھے۔ اسے یہ دیکھ کر کوئی خاص حیرت نہیں ہوئی کہ یہ ایک لاکھا تھا۔ دو ڈھائی کلو وزنی یہ جنگلی مرغ بالائی خطے میں شدید برفباری برداشت نہ کر سکنے کی وجہ سے نیچے اتر کر بستی میں بھٹک گیا تھا۔ جج مظفر علی رانا للچائی نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔ لوگ اور قریب آگئے تھے۔ یہ دس پندرہ لوگ تھے جو نیم حصار کی صورت اس کے پیچھے دوڑ رہے تھے مگر وحشت زدہ جنگلی مرغ بار بار ان کی گرفت سے چھوٹ رہا تھا۔ جنگل میں شکاری جانوروں سے درپیش لاتعداد خطرے جھیل کر جس مرغ نے ڈیڑھ دو سال کی زندگی گزار لی ہو وہ لوگوں کے ہاتھ کیا آئے گا۔ رانا کے اندر کا پرانا شکاری جاگنے لگا۔ کیوں نہ وہ جھپٹ کر گھر سے بارہ بور کی بندوق لے آئے؟ پھر اس نے اس شدید خواہش پر قابو تو پا لیا لیکن اچانک اسے فضا میں بھنے ہوئے گوشت کی اشتہا انگیز مہک سی آئی اور جنگلی مرغ کی بڑی سی ٹانگ کو جبڑوں میں محسوس کر کے اس کی زبان پیشگی لذت سے سرشار ہونے لگی۔

'صاحب....' اسے منہ چلاتے ہوئے غور سے دیکھ کر سلیمان نے کہا '...اگر یہ ہاتھ آجائے تو....'

یہ غلط بات ہے کہ سلیمان نے اس کے خیالات پڑھ لیے، اس نے سوچا، ایک جج کو اپنے عہدے کا وقار رکھنا چاہیے۔ وہ کچھ نہ بولا۔

مرغ اب ایک جگہ کھڑا آس پاس دیکھ کر شاید نکل بھاگنے کا منصوبہ بنا رہا تھا۔ جنگل میں وہ ایسے بہتیرے معرکوں میں بچ کر نکل چکا تھا۔ لوگ آہستہ آہستہ گھیرا تنگ کرنے لگے اور پھر اس پر جھپٹے۔ لیکن ایک تیز رفتار کے ساتھ مرغ کبڈی کے کسی مشاق کھلاڑی کی طرح ان کے نرغے سے صاف نکل گیا۔

رانا کچھ دیر تک تو مرغ کے پیچھے بھاگتے لوگوں کو دیکھتا رہا پھر اپنے آپ کو روک نہ سکا۔ بے قابو ہو کر بولا:

'سلیمان....اسے کوئی نہ کوئی تو پکڑ ہی لے گا... جتنے روپے مانگتا ہے دے کر لے آنا...جاؤ...'

سلیمان نے سر ہلا کر بریف کیس ایک باڈی گارڈ کے حوالے کیا اور خود لوگوں کے پیچھے چلا گیا۔

پورے نو بجے جج مظفر علی رانا اپنے چیمبر میں تھا۔ معمول کے مطابق دس بجے تک دستاویزات کی تسجیل کی کاروائی چلتی رہی۔ زمینوں کے وثیقے' رہن نامے' فروخت نامے' شراکت نامے وغیرہ۔ دس بجے سے پانچ منٹ زیادہ ہوگئے تھے۔ اس نے آخری دستاویز پر اپنے ہاتھ سے اندراج کر کے دستخط کر دیے اور فائلیں پرے سرکائیں۔ کلرک فائلیں لے کر چلا گیا۔ اس نے جیب سے کلاسِک کا پیکٹ نکال کر ایک سگریٹ کھینچا۔ پاس میں جلتے برقی روم ہیٹر سے سلگا کر ایک گہرا کش لیا اور کرسی کی پشتگاہ سے ٹک گیا۔

جج مظفر علی رانا عمومی طور پر ایک مطمئن شخص تھا اور اس کی خواہشات بھی کچھ زیادہ بلند نہیں تھیں۔ قانون کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد اس نے کئی سال تک پریکٹس بھی کی تھی پر وکیل کی حیثیت سے زیادہ کامیاب ہونے کی حوصلہ مندی اس میں نہیں تھی۔ لیکن آٹھ سال پہلے جب بطور جج اس کی تقرری ہوئی تو وہ

اپنی زندگی سے مطمئن ہو گیا۔ وہ مالی طور پر بھی اپنی ضروریات سے کچھ زیادہ آسودہ حال تھا۔ ان آٹھ برسوں میں اس کے پاس بہتیری پیشکشیں آئیں اور کئی معاملات میں اس نے انکار بھی نہیں کیا۔ لیکن اس کا ضمیر بے داغ تھا۔ اس نے کبھی بے انصافی نہیں کی اور اس بات کا ہمیشہ خیال رکھا کہ کسی کی حق تلفی نہ ہو۔ آج بھی ایک ایسا ہی مقدمہ در پیش تھا جس کے لیے اسے ایک وافر پیشکش کی گئی تھی اور اس نے حامی بھر لی تھی کیونکہ اس نے یوں بھی اسی فریق کے حق میں فیصلہ سنانا تھا۔

عجیب بات ہے، سگریٹ کا کش لے کر وہ سوچنے لگا۔ اس مہذب معاشرے میں لوگوں کی زندگیوں کو ایک نظام کے تحت چلانے کے لیے کتنے ادارے بنائے گئے ہیں۔ آپ نے کسی بھی طرح کسی بھی ادارے میں اور کسی بھی سطح پر ایک بار متعین ہونا ہے اور پھر آپ کو لوگوں پر اختیار مل جاتا ہے اور لوگ آپ کو کئی طرح سے خوش رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کمال کا سسٹم ہے، اس نے سوچا اور چونک پڑا۔

چیمبر سے ملحقہ عدالت کے کمرے سے اٹھا پٹک، دھب دھب اور شور کی آوازیں آ رہی تھیں۔

کیا ہو گیا، اس نے گھبرا کر سوچا اور میز کے ایک کنارے پر لگا بزر دبایا لیکن کچھ دیر گزر جانے پر بھی جب کوئی نہ آیا تو اس کی تشویش بڑھ گئی۔ عدالت کے کمرے کی جانب سے آنے والی آوازوں کا حجم اب بڑھ رہا تھا اور اب ان میں لوگوں کی آوازیں بھی شامل تھیں۔ ایش ٹرے میں سگریٹ بجھا کر وہ تیزی سے دروازے کی جانب بڑھا اور دروازہ کھول کر عدالت کے اوپری حصے میں آیا۔

اس نے حیرت سے دیکھا کہ کمرۂ عدالت کی ایک بے سلاخ کھڑکی پر وہی جنگلی مرغ کھڑا تھا۔ کھڑکی کے باہر کھڑے لوگوں میں سے دو تین آہستہ آہستہ آگے بڑھے اور اس پر جھپٹے لیکن ایک انتہائی مختصر سی اڑان کے ساتھ وہ کڑکڑاتے ہوئے کمرۂ عدالت میں آ کر سراسیمگی سے چاروں طرف دیکھنے لگا۔

جج رانا نے دیکھا کہ اس کا اردلی سلیمان دبے پاؤں چلتا ہوا عدالت کے کمرے کی کھڑکیاں بند کر رہا تھا اور عدالت کا ایک چپراسی بھی اس کے ساتھ تھا۔ اس نے دیکھا کہ اس کے ایک مسلح محافظ نے بھی اپنی رائفل ایک طرف رکھی اور ان کے ساتھ ہو لیا۔ ساری کھڑکیاں اور دروازے بند کر کے وہ سب انتہائی ہوشیاری کے ساتھ مرغ کی طرف بڑھنے لگے۔ دراصل وہ اسے ایک کونے میں کھدیڑنے کی کوشش کر رہے تھے۔ آس پاس دیکھتے ہوئے مرغ بڑی ہوشیاری سے پیچھے ہٹ رہا تھا۔ اچانک مرغ نے رک کر ٹھاٹ بدلا۔ تینوں یکبارگی اس پر جھپٹے لیکن وہ جھکائی دے کر نکل گیا۔

لیکن رانا نے جو دم خم اس میں صبح دیکھا تھا وہ اب نظر نہیں آیا۔ کئی شکاری جانور جو اپنے سے بڑی جسامت کے شکار پر فوراً قابو نہیں پا سکتے وہ اسے دوڑا دوڑا کر بے دم کر دیتے ہیں اور پھر کسی کمزور لمحے میں اس پر جھپٹ پڑتے ہیں۔ انسان سے بہتر شکاری اور کوئی نہیں تھا اور یہ مرغ بھی اب واضح طور پر تھک چکا تھا، رانا نے سوچا۔ اس نے دیکھا کہ مرغ بار بار سر گھما کر کمرۂ عدالت کی تفصیلات کا بہ نظر غائر مشاہدہ کر کے اپنی سلامتی کے امکانات کا جائزہ تو لے رہا تھا لیکن صاف محسوس ہو رہا تھا کہ وہ کوئی حتمی فیصلہ نہیں کر پا رہا ہے۔ حالانکہ جنگل میں زندگی اور موت کے بیچ ایک لمحے سے بھی کم فاصلہ ہوتا ہے اور اپنی ڈیڑھ دو سال کی زندگی میں لاتعداد خطرات کا سامنا کر کے وہ کئی معرکے بھی سر کر چکا تھا لیکن تیزی سی زندگی اور موت کی جنگ بنتی جا رہی یہ جھڑپ، اسے لحہ بہ لحہ حواس باختہ کرتی جا رہی تھی۔

دراصل یہ ایک الگ ہی میدان جنگ تھا جو اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس کمرے میں جو کچھ بھی تھا اس کے لیے قطعی غیر مانوس تھا اور نہ ہی اسے جنگل والا ماحول دکھائی دے رہا تھا۔ درخت، جھاڑیاں، جنگلی بیلیں، چٹانیں، چھوٹے بڑے پتھر، گری ہوئی ٹہنیاں اور سوکھے پتے، کچھ بھی تو نہیں تھا۔ جنگل کی یہ چیزیں اس کی حفاظت میں سینکڑوں بار معاون ثابت ہوئی تھیں۔ اور پھر یہاں وہ شکاری جانور بھی نہیں تھے جن کی شکاری حکمت عملیوں سے وہ بخوبی واقف تھا اور انہیں کئی بار جل دے چکا تھا۔ انسان سے یہ اس کی پہلی مڈبھیڑ تھی اور وہ اس نئے حریف کی جنگجویانہ صلاحیتوں سے قطعی نابلد تھا۔

اس کی زبان چونچ سے باہر نکلی ہوئی تھی اور وہ ہانپتے ہوئے گردن اچکا اچکا کر وحشت زدہ آنکھوں سے چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے سر کی ہر جنبش کے ساتھ سرخ رنگ کی اس کی بڑی سی کلغی تھرک رہی تھی اور چونچ کے نیچے گل پھڑا اضطراری طور پر تیزی سے پھیل اور سکڑ رہا تھا۔ اچانک وہ ٹھاٹ مارنے لگا۔

جج رانا بھی سب لوگوں کے ساتھ سانس روکے کھڑا تھا۔ یہ ایک انتہائی صبر آزما مرحلہ تھا۔ دراصل تحمل ہی شکاریوں کا سب سے مہلک ہتھیار ہوتا ہے۔ شکاری جانور جانتے ہیں کہ بے آواز سانس لیتے ہوئے طویل دورانیوں کے لیے گھات لگائے بیٹھے رہ کر شکار کے کارگر زد پر آنے کا انتظار کرنا ہی شکار کی بہترین حکمت عملی ہے۔

مرغ اب معمول پر آنے لگا تھا کیونکہ سلیمان، چپراسی اور باڈی گارڈ دیر سے بے حس و حرکت کھڑے رہ کر اسے احساس تحفظ کا بھرّا دینے کی کوشش کر رہے تھے تا کہ وہ مشتعل نہ ہو جائے۔ ہوشیاری کے ساتھ انہوں نے ایک بار پھر اس کے گرد گھیرا تنگ کرتے ہوئے بہ آہستگی سرک سرک کر ایک قدم بڑھایا اور کمال صبر سے اسے ایک کونے میں ہنکاتے گئے۔ وہ ہر حالت میں اب اسے پکڑ ہی لینا چاہتے تھے۔ اچانک مرغ نے اُلٹی زقند بھر کر فرش پر پنجے ٹکائے ہی تھے کہ سلیمان اس پر جھپٹا۔ یہ ایک قطعی غیر متوقع لیکن برموقع حملہ تھا۔ اڑنے کی ایک دل برداشتہ سی کوشش میں مرغ محض پنکھ پھڑ پھڑا کر رہ گیا اور سلیمان نے اسے دونوں ہاتھوں سے دبوچ لیا۔ لیکن مرغ کا بے طرح پھڑ پھڑاتا ہوا پنکھ اس کی آنکھ میں لگ گیا اور وہ درد سے چیخ پڑا۔ چپراسی اور باڈی گارڈ بھی اس پر جھپٹ

پڑے اور پھر سب نے مل کر اسے قابو میں کر لیا۔ وہ اب بھی بہت اونچی آواز میں کڑکڑا رہا تھا۔ کھڑکی کے شیشوں میں سے باہر کھڑے لوگ یہ تماشہ دیکھ رہے تھے۔

سب نے مل کر اس کی پشت پر دونوں پنکھوں میں گرہ لگا کر اس کی مشکیں کس دیں۔ سلیمان ایک پاؤں اس کے پھنسے ہوئے پنکھوں پر اور دوسرا اس کی ٹانگوں پر رکھ کر اس پر تقریباً بیٹھ گیا اور ایک ہاتھ سے اس کی گردن پکڑ کر چپراسی سے ہانپتے ہوئے بولا:

'چھری..... چھری لاؤ.... جلدی...'

'یہاں چھری کہاں ہے؟' چپراسی نے حیرت سے کہا۔

'باہر.... چائے والے کے پاس.... جلدی کرو..' اس نے بائیں آنکھ ملتے ہوئے کہا جہاں اسے پنکھ لگا تھا۔

چپراسی باہر بھاگا۔

مرغ رہ رہ کر چھٹپٹانے کی سعی کر رہا تھا لیکن اب اس کی مدافعتی کوششوں میں پہلے کی سی تندی و تیزی نہیں تھی۔ باڈی گارڈ کی مدد سے سلیمان نے اس کے سر کو موڑ کر اس کا گلا سامنے کیا۔ اتنے میں چپراسی نے آ کر اس کے ہاتھ میں چھری تھما دی۔ اس نے چھری ایک طرف رکھ کر دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کے دباؤ سے چونچ کھول کر اس کی زبان باہر نکالی اور دبا کر چونچ بند کر دی۔ جج رانا سکتے کے عالم میں یہ سب دیکھ رہا تھا۔

سلیمان نے اس کا سر موڑ کر اس کے گلے پر چھری رکھی اور زیر لب کچھ پڑھنے لگا۔ مرغ میں اب چھٹپٹانے کی قوت بھی نہیں رہی تھی۔ بقا کی طویل جدوجہد نے اسے تھکا دیا تھا اور مزاحمت کے مرحلوں سے گزر کر اب وہ شاید تن بہ تقدیر ہو گیا تھا۔ اس کی چونچ جج رانا کی طرف اٹھی ہوئی تھی اور اس کی آنکھیں رانا کی جانب دیکھتی محسوس ہو رہی تھیں۔ کیا یہ میری طرف دیکھ رہا ہے، رانا نے حیرت سے سوچا اور اسے لمحہ بھر کو لگا کہ وہ واقعی اسی کو دیکھ رہا ہے۔ رانا بھی کچھ دیر اس کی آنکھوں میں دیکھتا رہا۔

پھر جب سلیمان اس کے گلے پر چھری پھیرنے ہی والا تھا کہ رانا بے اختیار چیخ پڑا۔

'ٹھہرو.........'

سلیمان نے ہاتھ روک کر حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ رانا عدالت کے منبر سے اتر کر اس کے پاس آ گیا۔

'اسے چھوڑ دو....'

سب اسے حیرت سے دیکھنے لگے۔ گوشت کے اس شدید ترین بحران میں بمشکل یہ ہاتھ لگا تھا اور جج صاحب کیا کہہ رہے تھے۔

'اسے چھوڑ دو...' جج رانا نے پرسکون لہجے میں کہا۔ '... یہ عدالت ہے ذبح خانہ نہیں..'

اوہ... تو یہ بات ہے، سلیمان نے سر کو تفہیمی جنبش دیتے ہوئے سوچا۔ اس نے چھری چپراسی کو دی، مرغ کو پاؤں کے نیچے سے نکال کر اس کی ٹانگوں پر دائیں ہاتھ کی مضبوط گرفت جمائی اور دونوں ہاتھوں سے بغل میں دبا کر آہستہ سے بولا:

'ٹھیک ہے... میں اسے گھر لے جاتا ہوں...'

'نہیں...' جج رانا نے سختی سے کہا۔ 'میں نے کہا نا... اسے چھوڑ دو.... آزاد کر دو..'

سلیمان بے یقینی سے اس کی طرف کچھ دیر دیکھتا رہا لیکن پھر اس کی آنکھوں میں ارادے کی پختگی دیکھ کر کھڑکی کی طرف بڑھا۔

'نہیں...' جج نے کہا '... ادھر نہیں.... اس طرف...' رانا نے سامنے والی کھڑکی کی طرف اشارہ کیا جو نیچے ڈھلان کی طرف کھلتی تھی اور خود بھی کھڑکی کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ سلیمان نے ایک بار پھر جج کی طرف دیکھا کہ شاید وہ ارادہ بدل دے مگر جج نے سر کو ہلاتے ہوئے اسے آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔ سلیمان نے کھڑکی کے پاس آ کر مرغ کے پنکھ کھولے، اسے باہر اچھالا اور خود پیچھے ہٹ گیا۔

رانا نے دیکھا کہ پنکھ پھڑ پھڑاتے ہوئے مرغ سلامتی سے برف پر اتر گیا اور گردن اچکا اچکا کر سرعت سے چاروں اطراف میں دیکھنے لگا جیسے کسی نئے خطرے کا اندازہ کر رہا ہو۔ لیکن آس پاس کوئی نہیں تھا۔ حدِ نظر تک بے داغ اور پرسکوت برف دیکھ کر وہ کچھ مطمئن ہوا اور بہت زور زور سے پنکھ پھڑ پھڑانے لگا یہاں تک کہ اس کے پروں میں ہوا بھر گئی اور وہ پھول کر پنجوں پر اٹھ گیا۔ پھر آہستہ آہستہ معمول پر آیا اور آس پاس دیکھنے لگا۔ یہ اس کا مانوس منظر نامہ تھا۔ پھر اس نے پیچھے مڑ کر کھڑکی سے جھانکتے ہوئے رانا کو دیکھا۔

کیا یہ میری طرف دیکھ رہا ہے؟ رانا نے سوچا۔ کیا اسے احساس ہے کہ میں نے اس کو یقینی موت سے بچایا ہے۔ مگر یہ کیسے ہو سکتا ہے!

مرغ واپس مڑ کر کچھ قدم چلا لیکن پھر رک کر کھڑکی کی طرف دیکھنے لگا۔

اوہ...... یہ تو واقعی میری طرف دیکھ رہا ہے۔ رانا نے حیرت سے سوچا۔

اچانک مرغ نے سر اٹھا کر دو فلک شگاف بانگیں لگائیں پھر کچھ دیر بعد ایک جھٹکے کے ساتھ واپس مڑا اور بڑے اعتماد کے ساتھ چھلانگیں لگاتا ہوا ڈھلان پر اترتا چلا گیا۔

جج مظفر علی رانا اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ جب وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا تو اس نے طویل سانس لی۔ وہ واپس مڑ کر عدالت کے منبر پر آیا اور اپنی نشست پر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر تک کچھ سوچتا رہا اور پھر جب سبھی لوگ کمرۂ عدالت سے باہر چلے گئے تو کورٹ کلرک سے بولا:

'نیکسٹ کیس...'

آخری چارہ

جمیل عثمان

(یو۔ایس۔اے)

سیٹھ مقصود کی کوٹھی گلی اور مین روڈ کے کونے پر واقع تھی۔گلی سے نکل کر دائیں جانب ایک فرلانگ پر بس اسٹاپ تھا۔گلی کی نکڑ پر اس کی کوٹھی کی دیوار کے سائے میں لیٹا ہوا بوڑھا تھر تھر کانپ رہا تھا۔معلوم نہیں اس کی یہ کپکپاہٹ سردی کی وجہ سے تھی یا لقوے کا اثر تھا۔اس کا ایک ہاتھ مستقل ہلتا رہتا تھا۔ٹانگیں بیکار ہو چکی تھیں۔آنکھوں سے برائے نام ہی نظر آتا تھا۔منہ سے بہنے والی رال نے پوری داڑھی بھگو دی تھی۔تھوک اور بلغم داڑھی پر گر کر سوکھ گئے تھے۔ اور اس کی داڑھی کے بال آپس میں جڑ گئے تھے۔اس کا منہ ہمیشہ کھلا ہی رہتا تھا اور رال مستقل بہتی رہتی تھی۔ہاتھ پیر کے ناخن بے تحاشہ بڑھے ہوئے تھے اور ان میں کالی کالی میل جمی ہوئی تھی۔ناخن ہی کیا اس کا پورا جسم میل میں ڈھک چکا تھا۔حالانکہ اس کا رنگ کبھی صاف رہا ہوگا مگر میل جمنے کی وجہ سے اس کی کھال چتکبری لگتی تھی۔بال بڑھ کر کاندھوں تک آ گئے تھے اور جٹوں کی شکل اختیار کر لی تھی۔منہ میں دانت ایک بھی نہیں تھا۔ایک آنکھ بالکل ضائع ہو گئی تھی اور دوسری پتلی سیاہ کی بجائے ملگجی سی تھی۔

بوڑھے کے قریب ہی ایک لحاف پڑا ہوا تھا۔میلا چیکٹ! جاڑے کے شروع میں کسی خدا ترس انسان نے نیا لحاف بوڑھے کے جسم پر ڈال دیا تھا۔مگر دو مہینوں کے اندر اندر وہ بالکل میلا ہو گیا تھا۔سردی، گرمی، بارش اور دھوپ سے بچاؤ کے لیے اس کے سر پر خیمہ سا بنا دیا گیا تھا۔کوٹھی والوں سے اجازت لے کر دیوار میں دو سوراخ کئے گئے تھے۔دو بانسوں کے ایک ایک سرے ان سوراخوں میں ڈالے گئے تھے اور دوسرے سروں کو فٹ پاتھ میں گاڑے گئے دو اور بانسوں پر ٹکا کر انہیں رسی سے مضبوط باندھ دیا گیا تھا۔چھت بنانے کے لیے گتے کے بڑے بڑے کارٹنز، پلاسٹک کی شیٹیں اور پھٹی پرانی چادریں استعمال کی گئی تھیں جن سے ایک کینوپی سی بن گئی تھی۔یہی اس کا گھر تھا۔

شدید سردی کی رات تھی اور اس وقت گیارہ بج رہے تھے۔سڑک پر سناٹا طاری تھا۔لوگ اپنے اپنے گھروں میں دبکے آرام سے ہوں گے۔مگر ایک بیس بائیس سال کا لڑکا اس وقت بس میں بیٹھا ہوا تھا۔ٹریفک زیادہ نہیں تھی اس لیے بس کا ڈرائیور تیز رفتاری میں اپنی مہارت دکھا رہا تھا۔جس سیٹ پر وہ بیٹھا تھا اس کے برابر والی کھڑکی کا شیشہ ٹوٹا ہوا تھا۔اس نے سوچا کہ سیٹ بدل لے مگر کوئی دوسری سیٹ خالی نہیں تھی۔سرد ہوا اس کے لاغر جسم کو کاٹ رہی تھی۔کتھئی رنگ کی میلی سی اونی چادر اس نے اپنے گرد لپیٹنے کی کوشش کی مگر ہوا بار بار اسے اڑائے دے رہی تھی۔اس کے جسم پر ایک قمیص اور ایک بغیر آستینوں والا سویٹر تھا۔اس کی گود میں ایک پوٹلی تھی جسے وہ دونوں ہاتھوں سے اس طرح دبائے بیٹھا تھا جیسے موقع ملتے ہی وہ پوٹلی پھدک کر بھاگ کھڑی ہوگی۔سیٹھ مقصود کی کوٹھی کے قریب والے بس اسٹاپ پر بس رکی تو وہ کود کر نیچے اترا۔لیکن اس کے اترتے ہی ڈرائیور نے رفتار تیز کر دی۔اس کا پیر رپٹ گیا اور وہ منہ کے بل زمین پر آ رہا۔ناک زمین سے ٹکرائی تھی مگر وہ تو پہلے ہی سردی سے سن ہو چکی تھی۔اس لیے اسے چوٹ کا احساس نہیں ہوا۔کپڑے جھاڑتا ہوا وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

''حرامزادے کہیں کے! بڑی جلدی لگی ہوئی ہے۔ویسے تو ہر اسٹاپ پر ایک ایک گھنٹہ روکیں گے اور ابھی مسافر نہیں ہیں تو یوں بھاگ رہا ہے جیسے کسی نے پیچھے کتے چھوڑ دیے ہوں۔'' وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑانے لگا۔بس اسٹاپ سے تقریباً ایک فرلانگ چل کر وہ بائیں ہاتھ کو مڑ گیا اور سیٹھ مقصود کی کوٹھی کی دیوار کے ساتھ لیٹے ہوئے بوڑھے کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔

بوڑھا اسی کا انتظار کر رہا تھا۔اسے دیکھتے ہی وہ زور زور سے ہلنے لگا۔ اس کی بے نور آنکھوں میں جیسے چمک آ گئی۔وہ تیزی سے منہ چلانے لگا اور منہ سے بہنے والی رال مکڑی کے جالے کی طرح اس کے ہونٹوں سے سینے تک لٹک گئی۔

''کچھ پیسے ویسے بھی ملے ہیں دادا؟''

بوڑھے نے زور زور سے سر ہلایا اور اپنے معذور ہاتھ سے تکیے کی طرف اشارہ کیا جو تکیہ کم اور سیاہ پتھر کی سِل زیادہ معلوم ہو رہا تھا۔لڑکے نے تکیہ اٹھایا اس کے نیچے کچھ نوٹ اور ریزگاری تھی۔وہ پیسے گننے لگا۔

''بس صرف پچپن روپے؟'' اس نے مایوسی سے کہا اور پیسوں کو جیب میں ڈالتا ہوا بولا ''بھیک بھی تو نہیں ملتی تجھے۔'' پھر اس نے بوڑھے کا تہبند ہٹاتے ہوئے کہا۔''دیکھوں کیا کاروائی کی ہے تو نے؟'' جیسے ہی اس کی نظر اپنے دادا کی غلاظت پر پڑی اس نے کراہت سے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔''اوں ہوں دادا! یہ کیا کیا ہے تو نے۔اتنا سارا؟''

لڑکے نے قریب ہی پڑی ہوئی میلی سی بغیر ہینڈل کی پلاسٹک کی بالٹی اٹھائی اور اسے سیٹھ مقصود کی کوٹھی کی دیوار میں بنے ہوئے سبیل سے بھر لایا۔اپنے منہ پر رومال باندھا اور ہسپتال سے لائے ہوئے لتوں، پھٹے پرانے کپڑوں اور تولیوں سے اپنے دادا کی صفائی کی۔اسے دوسرے کپڑے پہنائے اور دیوار سے ٹیک لگا کر بٹھا دیا۔ پھر وہ دوبارہ پانی بھر کر لے آیا اور اپنے ہاتھ خوب اچھی طرح صابن سے دھوئے۔پھر اس نے وہ پوٹلی کھولی جو اپنے ساتھ لایا تھا۔اس میں ڈبل روٹی کے ٹکڑے اور قیمہ تھا۔ اس نے ڈبل روٹی میں قیمہ لگا کر بوڑھے کے منہ میں رکھ دیا۔وہ روزانہ اپنے دادا کے لیے یہی چیزیں لایا کرتا تھا۔دال، ساگ، سبزی یا قیمہ۔بوڑھا اور کچھ نہیں کھا سکتا تھا۔ کبھی کبھی وہ ہسپتال سے کسی مریض کا چھوڑا ہوا دودھ بھی لے آتا۔

خاموشی سے نوالے بنا بنا کر وہ بوڑھے کو کھلاتا رہا۔یہاں تک کہ کھانا

ختم ہوگیا۔ پھر وہ اٹھا اور المونیم کے ایک پچکے ہوئے گلاس میں سیٹھ مقصود کی کوٹھی کی سبیل سے پانی بھر لایا اور بوڑھے کو پلایا۔ اس کے بعد پلاسٹک کے ایک کین میں پانی بھر کر بوڑھے کے پاس رکھ دیا۔ چونکہ بوڑھے میں اتنی طاقت نہیں تھی کہ وہ کین سے پانی کا گلاس پی سکتا اس لیے اس نے کین میں ایک پتلا سا ربڑ کا پائپ ڈال دیا تھا جو ڈرنکنگ اسٹرا کا کام کرتا تھا۔

''پیاس لگے تو پی لینا'' اس نے بوڑھے سے کہا۔ بوڑھے نے سر ہلا دیا۔

تھوڑی دیر تک وہ خاموش بیٹھا بوڑھے کو ایک ٹک دیکھتا رہا۔ پھر اچانک بولا۔

''دادا تو مر کیوں نہیں جاتا؟''

بوڑھے کے منہ سے عجیب قسم کی آوازیں نکلنے لگیں۔ شاید وہ اس کی بے بسی تھی یا احتجاج۔

''میں صحیح کہہ رہا ہوں دادا۔ دیکھ نا تیری وجہ سے مجھے اس شہر میں سر مارنا پڑ رہا ہے۔ اگر تو مر جائے تو میں کہیں اور جا کر قسمت آزماؤں۔ کتنے لوگ دوبئی اور سعودی عرب جا کر مزدوری کر رہے ہیں۔ میں بھی چلا جاتا لیکن تیری وجہ سے میں کہیں نہیں جا سکتا۔ کہیں بھی نہیں!'' اس نے زور سے اپنے زانو پر ہاتھ مارا۔

بوڑھے کی آنکھوں میں بے بسی کے آنسو آگئے۔ اگر وہ اپنے پوتے کی خواہش پر مرنا بھی چاہتا تو مر نہیں سکتا تھا۔ اس میں اتنی بھی طاقت نہیں تھی کہ وہ زور سے کسی پتھر پر اپنا سر دے مارے یا قریب ہی پڑا ہوا سریے کا ٹکڑا اپنے سینے میں گھونپ لے۔ زندگی سے محبت کرنے والا انسان کبھی کبھی موت کی آرزو کرتا ہے مگر ایسے میں اگر موت بھی نہ آئے تو اس کی بے بسی دیکھی نہیں جاتی۔ بوڑھے کی بے بسی بھی اس کے پوتے سے دیکھی نہیں جاتی تھی۔ وہ ہر بار جب اس سے جدا ہوتا تو یہی دعا کرتا کہ اب کے جب آئے تو اپنے دادا کو مرا ہوا پائے۔ اگر وہ چاہتا تو ہفتے یا مہینے بھر کے لیے غائب ہو جاتا۔ اس عرصے میں بوڑھا یقیناً بھوک سے تڑپ کر مر جاتا۔ مگر اتنی سفاکی اس سے نہیں ہو سکتی تھی۔

بوڑھے کے پاس سے اٹھ کر وہ واپس بس اسٹاپ پر آیا۔ بس آئی تو وہ ہسپتال جانے کے لیے اس میں سوار ہو گیا۔ بس میں بیٹھا وہ سوچ رہا تھا کہ اس کی زندگی کا مقصد کیا ہے۔ کیا یونہی وہ ہسپتال کی سیڑھیوں پر اپنا خون فروخت کرتا رہے گا اور ہر شام اپنے دادا کے لیے کھانا لے کر جایا کرے گا؟ اس نے جب سے ہوش سنبھالا تھا اپنے دادا کو ہی دیکھا تھا۔ جب وہ ٹھیک تھا تو محنت مزدوری کر کے اپنا اور اس کا پیٹ پالتا تھا۔ اس کے ماں باپ کے بارے میں اس کے دادا نے بس اتنا ہی بتایا تھا کہ دونوں بہت پہلے مر گئے تھے۔ جب وہ بہت چھوٹا تھا۔ بوڑھے کی اور کوئی اولاد نہیں تھی، نہ ہی کوئی بھائی یا بہن۔ بس وہ تھا اور اس کا پوتا جسے وہ بڑی مشکلوں سے پال رہا تھا۔ مگر ایک رات اس پر فالج کا حملہ ہوا۔ اور اب تین سال سے اس کا پوتا اسے پال رہا تھا۔

''یا اللہ میرے دادا کو اس اذیت سے نجات دے دے۔ اسے اپنے پاس بلا لے۔'' اس نے بس میں بیٹھے بیٹھے دعا کی۔

سیٹھ مقصود بہت پریشان تھا۔ آج کا دن اس کے لیے بہت منحوس ثابت ہوا تھا۔ کوسٹ گارڈز نے اس کی لانچ پکڑ لی تھی اور سارا اسمگل شدہ مال ضبط کر لیا تھا۔ اس کے چار آدمی پکڑے گئے تھے جن میں سے ایک نے پولیس تشدد سے تنگ آ کر اس فیکٹری کا پتہ بتا دیا تھا جہاں مال جاتا تھا۔ یوں پولیس مقصود سنز انڈسٹریز تک پہنچی تھی۔ بہت سارا اسمگل شدہ مال برآمد ہوا تھا۔ پولیس کے شکاری کتوں نے منشیات کے اس ذخیرے کی بو سونگھ لی تھی جو تہ خانے میں چھپایا گیا تھا۔ بہت بڑی مقدار میں چرس برآمد ہوا۔ فیکٹری کو سربہ مہر کر دیا گیا۔

سیٹھ مقصود کا شمار شہر کے رئیس ترین آدمیوں میں ہوتا تھا۔ سوسائٹی میں اس کی بڑی عزت تھی۔ اس نے کئی رفاہی ادارے قائم کر رکھے تھے۔ سماجی تنظیموں اور کارِ خیر کرنے والے اداروں کو وہ دل کھول کر چندہ دیا کرتا تھا۔ شہر کی ثقافتی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا کرتا تھا۔ مگر آج یہ کیا ہو گیا تھا۔ قدرت نے رسی اس قدر اچانک تنگ کی تھی کہ اسے کچھ کرنے کا موقع ہی نہیں مل سکا۔ اگر پہلے سے اسے ذرا بھی علم ہوتا تو وہ پولیس افسروں کو خریدنے کی کوشش کرتا۔ اپنی دولت اور اثر و رسوخ کا استعمال کرتا۔ مگر ہوا یہ تھا کہ رات کے پچھلے پہر لانچ پکڑی گئی اور علی الصبح فیکٹری پر چھاپہ پڑا۔ سیٹھ حسبِ معمول صبح نو بجے سو کر اٹھا اور لباس تبدیل کرنے اور ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد دس بجے کے قریب فیکٹری کی طرف روانہ ہوا۔ راستے ہی میں اسے فون آیا کہ فیکٹری سیل کر دی گئی ہے۔ سیٹھ مقصود نے ڈرائیور کو فوری طور پر گاڑی واپس موڑنے کو کہا۔

وہ گھر واپس آیا اور سارا دن سرکاری افسروں اور پولیس کے ان اہلکاروں کو فون کرتا رہا جنہیں وہ خوش کیا کرتا تھا۔ مگر اتفاق سے کوئی بھی نہیں ملا۔ اس کی پہنچ اوپر تک تھی۔ اس نے وزیر کو فون کیا۔ ''بس آج کی رات آپ کسی طرح پولیس سے بچ جائیے۔ کل صبح پہلی فلائٹ سے آپ کو ملک سے باہر بھجوا دوں گا۔''

''مگر ابھی کیوں نہیں؟''

''ابھی کچھ مجبوریاں ہیں۔ مجھے اپنی ساکھ بھی بچانی ہے۔''

سیٹھ مقصود اکیلا رہتا تھا۔ بیوی سے علیحدگی ہو چکی تھی اور بچے اپنے اپنے گھروں میں تھے۔ اس کے وفادار ملازم اس کے گرد کھڑے تھے اور پرتشویش نگاہوں سے اسے دیکھ رہے تھے۔

''صاب جی، پولیس کسی بھی وقت یہاں پہنچ سکتی ہے۔''

''ہاں، مجھے صرف آج کی رات پولیس سے بچنا ہے۔''

''کیا آپ کہیں اور نہیں جا سکتے؟ کسی دوست یا عزیز کے گھر؟''

''نہیں، کوئی مجھے پناہ نہیں دے گا۔'' خبر پورے شہر میں عام ہو چکی ہے۔

''مجھے یہیں کہیں چھپنے کا بندوبست کرنا پڑے گا۔''

سب لوگ کسی گہری سوچ میں غرق ہوگئے۔ اچانک ایک ملازم کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

''سیٹھ جی، ایک ترکیب آئی ہے!''

''کیا؟''

''بنگلے کے سائیڈ میں دیوار کے ساتھ جو فقیر پڑا رہتا ہے نا۔۔۔؟''

''ہاں، ہاں؟'' سیٹھ نے بے تابی سے پوچھا۔

''اگر آپ اس کی جگہ لے لیں تو کیسا رہے گا؟''

سیٹھ کچھ دیر تک سوچتا رہا۔

''مگر اس کا کیا کروگے؟''

''صاب اسے اٹھا کر کسی نوکر کے کوارٹر میں ڈال دیں گے۔''

''اور اگر پولیس نے اسے دیکھ لیا تو؟ ظاہر ہے وہ سرونٹ کوارٹرز کی بھی تلاشی لے گی؟''

''تو کیا؟ پولیس اسے تھوڑی پہچانتی ہے۔ میں کہہ دونگا وہ میرا بیمار باپ ہے۔ ہم اسے خوب اچھی طرح اڑھا کر سلا دینگے۔ وہ نہ تو بول سکتا ہے نہ چل سکتا ہے۔ وہ پولیس کو کچھ نہیں بتا سکے گا۔''

''ہوں'' سیٹھ نے سوچتے ہوئے کہا۔ ''تجویز تو معقول ہے۔''

''سیٹھ جی، اس جگہ آپ محفوظ رہیں گے۔ پولیس کے وہم وگمان میں بھی نہیں ہوگا کہ آپ وہاں رہ سکتے ہیں!''

نوکر نے گرم جوش لہجے میں کہا ''سر، آپ لحاف سے اوپر تان کر دبک رہیے گا۔''

''مگر سیٹھ جی۔۔۔'' دوسرے ملازم نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ''اس کا بستر اور لحاف اتنے غلیظ ہیں کہ پاس سے گزرو تو بدبو آتی ہے۔ آپ رہ سکیں گے اس میں؟''

''جان بچانے کے لیے کچھ بھی کرنا پڑے گا۔ اور پھر اس کا تکیہ اور لحاف ہٹا کر میرا کوئی پرانا مگر صاف تکیہ اور لحاف رکھ دینا۔ کوئی اس کینوپی کے اندر تھوڑی جھانکے گا!'' سیٹھ نے کہا۔ پھر کچھ سوچتے ہوئے اس نے پوچھا۔ ''بنگلے کے سائیڈ والے دروازے سے فقیر کتنی دوری پر ہے۔''

''بس چار قدم سیٹھ جی۔''

''ٹھیک ہے، اسے اٹھا کر لے آؤ۔ مگر احتیاط رکھنا کوئی دیکھے نہیں۔''

''کوئی نہیں دیکھے گا صاب جی۔ گلی میں اندھیرا ہے۔ بجلی کے کھمبے کا بلب بھی ٹوٹا ہوا ہے۔''

''پھر جلدی کرو۔'' سیٹھ نے کہا۔ اسی وقت فون کی گھنٹی بجی۔ دوسری طرف سے کسی نے بتایا کہ پولیس اس کے بنگلے کی تلاشی لینے کے لیے روانہ ہو چکی ہے۔

''جلدی، جلدی پولیس آنے ہی والی ہے۔'' سیٹھ مقصود نے بے تابی سے کہا۔

دس منٹ کے اندر اندر اپاہج بوڑھا ایک سرونٹ کوارٹر میں پہنچا دیا گیا۔ اسے اچھی طرح ڈھک دیا گیا۔ سیٹھ مقصود نے اپنا ایک بہت پرانا مٹیالے رنگ کا سلیپنگ سوٹ پہنا اور اپنی ابکائیوں کو روکتا ہوا بوڑھے کے بستر میں داخل ہوگیا۔ اسے ایک صاف تکیہ اور لحاف دے دیا گیا جسے اس نے اپنے سر تک اوڑھ لیا۔ لوگوں نے پلاسٹک کی شیٹ اور چادریں کینوپی کے منہ پر نیچے تک لٹکا دیں تاکہ اندر نظر نہ آسکے۔

رات کے گیارہ بجے کے قریب پولیس کی گاڑیاں بنگلے کے سامنے مین روڈ پر آکر رکیں اور پولیس والے تلاشی لینے کے لیے اندر داخل ہوگئے۔ تمام نوکر پولیس والوں کے ساتھ مصروف ہوگئے۔

اسی وقت بس اسٹاپ پر ایک بس آکر رکی۔

لڑکا بس سے اتر کر سیدھا بوڑھے کی کینوپی کی طرف لپکا۔ گلی میں گھپ اندھیرا تھا۔ گلی کی نکڑ پر ایک پولیس والا کھڑا تھا جس نے اسے بس سے اترتے دیکھا تھا۔ مگر اس نے لڑکے کو کوئی راہگیر سمجھ کر جانے دیا۔ لڑکا بوڑھے کے بستر کے پاس آکر بیٹھ گیا مگر بار بار مڑ کر گلی کی نکڑ کی طرف دیکھتا جا رہا تھا۔ اس نے ایک شیشی نکالی اور اس کا ڈھکن کھولتے ہوئے بولا ''دادا، اٹھ دیکھ میں تیرے لیے دوائی لایا ہوں۔ اس سے تُو بالکل ٹھیک ہو جائے گا۔''

سیٹھ مقصود نے اپنا منہ لحاف میں چھپا لیا تھا مگر پھر یہ سوچ کر کہ کہیں لڑکا اندر نہ جھانک لے اور اپنے دادا کو نہ پا کر شور مچا دے۔ اس نے لحاف سے اپنا منہ باہر نکال لیا۔ لڑکے کی نظریں گلی کے موڑ پر تھیں کہ کہیں پولیس والا ادھر نہ آجائے۔ ادھر ہی نظر کیے اس نے اپنا ہاتھ کینوپی کے اندر ڈالا۔ ''دادا یہ دوائی پی لے'' یہ کہتا ہوا ہسپتال سے چرائی پوری شیشی سیٹھ مقصود کے منہ میں خالی کر دی اور جلدی سے اٹھ کر تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا گلی کی دوسری طرف اندھیرے میں گم ہو گیا۔

''تاریخ''

پاکستان کی تاریخ میں پہلی مرتبہ کسی یونیورسٹی نے ہندی زبان میں ایم فل کی ڈگری جاری کر دی۔ نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویج (نمل) پہلی پاکستانی یونیورسٹی بن گئی ہے جس نے ہندی زبان میں ایم فل کی ڈگری جاری کی ہے۔ شاہین ظفر پہلی پاکستانی طالبہ ہیں جنہوں نے یہ اعزاز حاصل کیا ہے۔ یونیورسٹی کے ترجمان کا کہنا تھا کہ پاکستان میں ہندی زبان کے ماہرین کی کمی کی وجہ سے تھیسز کے لیے بھارت کی علی گڑھ یونیورسٹی کے ماہرین کی خدمات حاصل کی گئیں۔

☆

''مُشکِ آب''

عبداللہ جاوید
(کینیڈا)

حرف حرف میں اپنے، ان کی بات رکھنی ہے
اک شناخت گم کر کے، اک شناخت رکھنی ہے

وہ صفات کے پیچھے، ہی چھپے ہوئے اچھے
ہم کو ان حجابوں میں پاک ذات رکھنی ہے

وہ تو ایک ذرے کو کائنات کر دیں گے
ہم کو ایک ذرے میں کائنات رکھنی ہے

کربلا کے صحرا میں، ہیں کھڑے ہوئے عباسؓ
مشکِ آب زخمی ہے اور فرات رکھنی ہے

مومنوں میں ہم مومن، کافروں میں ہم کافر
ہم کو دین و دنیا ساتھ ساتھ رکھنی ہے

ان کی بات کے آگے اپنی بات کیا جاویدؔ
بولنے میں لکھنے میں احتیاط رکھنی ہے

○

غالب عرفان
(کراچی)

راکھ میں جب اک شررِ مشعل ہُوا
یاد کا پیچھا کیا پاگل ہُوا

جھیل، دریا، خشک ہو کر رہ گئے
پانیوں کا ہر سفر بادل ہوا

دُھند حائل ہو گئی پہچان میں
جب اُجالا تیرگی میں حل ہوا

زندگی کا آئنہ بنتا گیا!
شیشۂ کردار جب صیقل ہوا

اُس کی قربت اس کی شوخی کا سماں
یاد جب آیا تو دل چنچل ہوا

قطرہ قطرہ اشک اس کی آنکھ کا
جب بہا، بہتا ہوا کاجل ہُوا

اس کے معنیٰ کیا سے کیا ہوتے گئے
گفتگو میں لفظ جو مہمل ہوا

آنکھ سے اوجھل رہا جو رابطہ
ذہن میں اُس کا گزر ہر پل ہُوا

قحط سالی اور پھر بارش کا زور
کوچہ کوچہ گاؤں کا جل تھل ہوا

رقصِ عرفانؔ خودی کے واسطے
پیکرِ احساس بھی بے کل ہُوا

○

اعتبار ساجد

(لاہور)

ہم بُرے ہو کے بھی لگتے تمہیں اچھے کیوں ہیں
واقعی سوچنا ہوگا کہ ہم ایسے کیوں ہیں

بعض لوگوں کے خدوخال ہیں محرومِ کشش
چند لوگوں کے تراشے ہوئے چہرے کیوں ہیں

ہجر صدیوں سے ہے کیوں جرمِ محبت پہ محیط
قربتوں کے لیے گنتی کے یہ لمحے کیوں ہیں

اک ہی حمّام سے نکلے ہیں نہا کر اک ساتھ
ہم گنہگار ہیں کیوں، آپ فرشتے کیوں ہیں

کچھ نہ کچھ ثقلِ ساعت ہے یقیناً ورنہ
سادہ فقرے بھی ترے اب ہمیں چبھتے کیوں ہیں

جونہی شب اوڑھ کے سونے کے لیے لیٹتا ہوں
تیرے کچھ خواب مری تاک میں رہتے کیوں ہیں

تم ملو گے تو بتا دیں گے تمہیں رازِ بہار
دس برس بعد بھی ہم ویسے کے ویسے کیوں ہیں

○

آصف ثاقب

(بوئی، ہزارہ)

نہیں تشکیل پوری رنگ و بُو کی
خدا پیدا کرے صورت نمُو کی

حفاظت کر رہی ہیں کربلائیں
مرے رستے میں چوکی ہے عدو کی

مدھر تانیں نہیں ہیں وادیوں میں
بڑی مدّت سے کویل بھی نہ کوکی

سفر شب کا ہوا ہے خوف والا
کھڑی ہے خالی خالی ہر سوزوکی

زمیں پر اب نہ دانہ ہے نہ پانی
اڑی پھرتی ہے چڑیا پیاسی بھوکی

جھروکا اور وادی اور دریا
یہی ہے زندگی میری کبھو کی

میں اپنی حد سے بڑھ کر رہ گیا ہوں
کوئی حد بھی تو ہو گی آرزو کی

بہر صورت اکیلا جا رہا ہے
کہ جس نے بھی تمہاری جستجو کی

یونہی ثاقب گزاری زندگانی
عزیزوں کی سہی ہے بدسلوکی

○

نقشبند قمر نقوی بھوپالی

(امریکہ)

جس کو سائے کی تمنا ہو، شجر کاری کرے
ورنہ مجبوراً وہ موسم کی نگہداری کرے

پہلے ہی اعلان میں شہرِ وفا میں کر چکا
بے تکلف آئے وہ مہوش عملداری کرے

میں نے کر رکھی ہے ارزاں جنسِ اخلاص ووفا
جو بھی دلبر ہو، وہ آئے اور خریداری کرے

انجمن میں اب تو خاموشی ہے حسنِ مصلحت
اب سرِ محفل کوئی کیسے گہر باری کرے

کاروبارِ زندگی میں کامیابی کے لیے
آدمی پر فرض ہے تھوڑی اداکاری کرے

اس ہجومِ دعویدارانِ وفا میں نقشبندؔ
کسکا دل توڑے کوئی، کسکی طرفداری کرے

O

مظفر حنفی

(دہلی، بھارت)

اک مصرف اوقات شبینہ نکل آیا
ظلمت میں تری یاد کا زینہ نکل آیا

ہر چند کہ محفل نے مری قدر بہت کی
اکتا کے انگوٹھی سے نگینہ نکل آیا

پھر کوہ کنی ڈھال رہی ہے نئے تیشے
پھر فخر سے چٹان کا سینہ نکل آیا

سچ مچ وہ تغافل سے کنارہ ہی نہ کر لے
میں سوچنے بیٹھا تو پسینہ نکل آیا

غوطہ جو لگایا ہے تو مایوس ہوا ہوں
ہر موج کے دامن سے سفینہ نکل آیا

O

مامون ایمن
(نیویارک)

رَہ رو بھی ہوں، خود اپنا مَیں رہ بَر بھی ہوں
تکتا ہے جہاں مجھ کو، سو منظر بھی ہوں
ماحول مِرے گرد ہے رقصاں ہر دم
دنیا میں ہوں، دنیا سے مَیں باہر بھی ہوں

منظر ہے، دُھواں بن کے اُڑا جاتا ہے
گاہے وہ زمانہ سے جڑا جاتا ہے
میں باندھ کے رکھتا ہوں سبھی سانسوں کو
جھونکا کوئی ڈوری سے تُڑا جاتا ہے

ٹوٹی ہوئی ڈوری کا کنارہ اکثر
باندھی ہوئی سانسوں کا نظارہ اکثر
سینۂ میں چھپی برف بھی پگھلاتا ہے
تقدیر کا بے جان شرارہ اکثر

رستہ، کبھی منزل سے گذرنا آساں
آئینہ، کبھی خود سے مکرنا آساں
سانسوں نے یہی پوچھا ہے مجھ سے اکثر
آساں ہے سمٹنا کہ بکھرنا آساں

میں ایک شرارہ ہی کا زندانی ہوں
اِک عہد ہوں، اِک عہد کا پیمانی ہوں
لمحات کے جھونکے مجھے گُم کر دیں گے
اس واسطے ہر آن میں ہیجانی ہوں

○

پروفیسر زہیر کنجاہی
(راولپنڈی)

یہ عجیب اپنے قد سے مجھے واسطہ پڑا ہے
مرے کام سے ہے چھوٹا، مِرے نام سے بڑا ہے

اُسے میں سمجھ نہ پایا کہ وہ دھوپ ہے کہ سایہ
وہ چناب ہے کہ طوفاں کہ وہ ڈوبتا گھڑا ہے

یہ دکھوں کے تُند ریلے، یہ غموں کے ہیں جھمیلے
یہ جہاں ہے ساعتوں کا یہاں پل بُہت کڑا ہے

میں ازل نشاں قلندر وہ ابد صفت سمندر
ہو وصال کیسے ممکن کہ یہ فاصلہ بڑا ہے

اُسے آنکھ سے میں دیکھوں، اُسے ذہن سے بھی سوچوں
وہ ہے زیست کا خزانہ، مری راہ میں گڑا ہے

وہی حل ہے مشکلوں کا، وہ نشان منزلوں کا
کبھی دل میں وہ جڑا ہے، کبھی آنکھ میں پڑا ہے

میں نظر اُٹھاؤں جب بھی، میں پلک جھکاؤں جب بھی
تو زہیر یوں لگے، وہ مرے سامنے کھڑا ہے

○

نسیمِ سحر

(راولپنڈی)

نہیں ضرور کہ رہتا ہو کوئی گھر میں ضرور
دِیا جلا کے تو رکھنا ہے بام و دَر میں ضرور

بدن بھی کرنے لگا ضِد قیام کرنے کی
یہ مرحلہ کبھی آنا تو تھا سفر میں ضرور !

ہَوا نہیں ہے، مگر شاخ شاخ ہلتی ہے
چھُپا ہوُا ہے پرندہ کوئی شجر میں ضرور

رُکوں مَیں لمحۂ موجود میں بھلا کیسے؟
کہ جانا ہے مجھے اب لمحۂ دِگر میں ضرور

یہ اتنے آنسو فقط میرے ہو نہیں سکتے !
مکیں ہے گویا کوئی میری چشمِ تَر میں ضرور

پھر اپنے آپ سے ہونے لگا ہوں برگشتہ
تو گویا پھر کوئی سودا ہے میرے سَر میں ضرور

دِکھائی دیتے نہ ہوں جس میں خط و خال اپنے
اِک ایسا آئنہ رکھتے ہیں لوگ گھر میں ضرور

مَیں اُس کے ساتھ ابھی تک سہی، ضروری نہیں
کہ اس کے ساتھ ہی چلتا رہوں سفر میں ضرور

مِرے بدن کی عمارت کھنڈر ہوئی بھی تو کیا؟
خزانہ دفن کوئی تو ہے اِس کھنڈر میں ضرور

یہ اَور بات کہ ہم بے خطر مکیں ہیں یہاں
یہ شہر رہتا ہے اب بھی کسی کے ڈر میں ضرور

اُدھر گیا تھا مَیں گُل پاشیوں کے موسم میں
نسیم کانٹے تو بچھنا تھے رہگذر میں ضرور

○

کاوش پرتا پگڑھی

(دہلی، بھارت)

آج ہوا ہے کس کا درشن
کایا کتنی روشن کندن

سر پر سورج کا قبضہ ہے
من کی کٹھری میں ہے چندن

داتا ہی کا درباری ہوں
فرصت مجھے کہاں ہے راجن!

جیون بھر جیون کو دیکھا
سمجھ نہ پایا جیون درشن

اڑی رہی وہ اپنی ضد پر
ٹوٹ گیا اس سے گٹھ بندھن

ناکامی پر چرچا ہو گا
ہو گا چنتن ہو گا منتھن

گیانی دھیانی ملاّ کو بھی
اندھا کر دیتا ہے جوبن

موم سے بڑھکر نرم وہ نکلا
بنتا تھا جو مردِ آہن

رکھی کہاں ہے تاش کی گڈی
بکھر گئے وہ پتے باون

کھلا پلا کے طعنہ دینا
حضرت یہ تو ہے گھٹیا پن

سخت مخالف تھا وہ میرا
اب میں اس کے دل کے دھڑکن

آج سویرے ہی سے کاوش
بیاکل ہے کچھ چنچل چتون

''پی اینڈ او''

فیروز عالم

(امریکہ)

سمرسٹ ماہم (۱۹۶۵ ۔۱۸۷۴) انگلستان کا مشہور ڈرامہ نگار، ناول نویس اور مختصر کہانی کار ہے۔ وہ یوں تو پیشہ کے لحاظ سے ڈاکٹر تھا مگر نوجوانی میں اسکا پہلا ناول اسقدر مشہور ہوا کہ اس نے ڈاکٹری چھوڑ کر کل وقتی تصنیف کا پیشہ اختیار کیا۔ وہ بیسویں صدی کے اولیں دور کا سب سے زیادہ مالی طور پر کامیاب قلم کار تھا۔ اس نے زندگی کا بڑا حصہ مشرق بعید یعنی ملایا، انڈونیشیا ویتنام اور جزائر شرق الہند کی سیاحی کرتے گذارا اور اسکی زیادہ تر کہانیاں انہی علاقوں کے پس منظر میں لکھی گئی ہیں۔ اس کے کئی ناولوں پر فلمیں بھی بنیں اور اسکے لکھے کئی ڈرامے لندن، نیویارک اور پیرس کے اسٹیج کی زینت بھی بنے۔ اس نے زندگی کے آخری دور میں فرانس کے جنوبی ساحل پر رہائش اختیار کی اور وہیں انتقال کیا۔

☆

مسز ہیملن ایک لمبی آرام کرسی پر نیم دراز عرشے پر آنے والے مسافروں کو دیکھ رہی تھیں۔ یہ دخانی جہاز رات کو سنگا پور پہنچا تھا اور اب صبح سے سامان لادر ہا تھا اس کے بعد مسافروں کی باری تھی تا کہ سہہ پہر کو یہ ایک لمبے سفر پر لندن کے لئے روانہ ہو جائے۔ انہوں نے جہاز کے ڈاکٹر اور مسز لنسل کو ایک ساتھ جہاز کی سیڑھیاں چڑھتے دیکھا اور خوشدلی سے انہیں ہاتھ ہلایا۔ مسز ہیملن یوکوہاما سے جہاز پر چڑھی تھیں اور انہوں نے اس عرصے میں یہ بات نوٹ کی تھی کہ ڈاکٹر نے اپنی بیوی کو مکمل طور پر نظر انداز کیا ہوا ہے اور وہ مستقل طور پر اپنی توجہ مسز لنسل پر مرکوز کئے ہوئے ہے۔ مسٹر لنسل ٹوکیو میں برطانوی سفارتخانے میں بحریہ کے اطاشی تھے۔ عرشے پر ادھر ادھر پڑی بید کی کرسیوں پر لوگ بیٹھے خوش گپیوں میں مصروف تھے اور سخت گرمی اور حبس سے اپنے پسینے سے شرابور جسموں کو برف میں دبی شراب کی بوتلوں سے ٹھنڈک پہنچانے کی کوشش کر رہے تھے۔ شائد شراب نے ان پر بہت ہلکا سا سرور طاری کر دیا تھا جسکی وجہ سے وہ ضرورت سے زیادہ خوش تھے اور قہقہے لگا رہے تھے۔ مسز ہیملن کے پاس کرنے کو کچھ نہیں تھا اس لئے وہ اپنی اونگھتی آنکھوں سے مسافروں کا جائزہ لے رہی تھیں۔ مسٹر جیفسن کو دیکھ کر انہوں نے اندازہ لگایا کہ یہ یقیناً حکومت برطانیہ کے بڑے افسر ہیں۔ کچھ دیر بعد مسٹر جیفسن نے مسز ہیملن سے اپنا تعارف کرایا وہ واقعی وزارت خارجہ میں بڑے افسر تھے مگر مسز ہیملن جس ذہنی کیفیت میں تھیں اسکی وجہ سے وہ کسی کی رومانی پیش رفتگی کی ہوصلہ افزائی نہیں کرنا چاہتی تھیں وہ شکستہ دل تھیں۔ انہیں معلوم تھا کہ کرسمس بھی سفر کے دوران جہاز ہی پر آئیگی کیونکہ دخانی جہاز کو لندن پہنچنے میں کئی ہفتے لگیں گے، اور ایسے خوشیوں کے موسم میں بھی وہ تنہا ہوں گی۔ اب روانگی کا وقت تھا جہاز نے ایک لمبی اور خوفناک سیٹی بجائی اس کے ساتھ گھنٹیاں بجنے لگیں۔ جو لوگ الوداع کہنے آئے تھے وہ جہاز سے اترنے کے لئے جلدی سے سیڑھی کی طرف بڑھے، جو لمبے سفر پر جا رہے تھے وہ جہاز کی ریلنگ کا سہارا لے کر دور ہو تے ساحل کا نظارہ کرنے لگے۔ مسز ہیملن اب بھی لوگوں کا مشاہدہ کر رہی تھیں۔ اتنے ہجوم میں نہ جانے کیوں انکی نگاہیں اُس پر ٹک گئیں۔ وہ ایک نہایت لحیم شحیم شخص تھا، چھ فٹ سے نکلتا ہوا قد اور چوڑے ورزشی کاندھے۔ اس کے تنومند بازوؤں پر خاکی رنگ کا سفاری سوٹ خوب جچ رہا تھا۔ پھر وہ بڑی اونچی اور پر زور آواز سے بول رہا تھا اور اسکے لہجے سے ظاہر تھا کہ وہ انگلش نہیں بلکہ آئرش ہے۔ جہاز نے آخری سیٹی دی اور آہستہ آہستہ ساحل سے دور ہونے لگا۔ جہاز کا ڈاکٹر رسمی طور پر مسز ہیملن کے نزدیک بیٹھ گیا اور عام سی بات چیت کرنے لگا۔ اسی اثنا میں یہ شخص بھی اس کرسی پر آ کر بیٹھ گیا جہاں اس کے کاغذ اور تھیلا پڑا تھا۔ مسز ہیملن نے اسکی طرف دیکھ کر ڈاکٹر سے پوچھا اسے جانتے ہو، ڈاکٹر نے کہا کہ ہاں ریسٹوران میں اس سے ملاقات ہوئی تھی یہ کاشتکار ہے اور اسکا نام گیلیگر ہے۔ ملایا کے جنگلات میں بہت سے برطانوی اور آئرش ربڑ کی کاشت کر رہے ہیں گیلیگر انہیں میں ایک ہے۔

جہاز کی روانگی کی ہنگامہ خیزی اب ایک دل خوش کن سکون میں بدل گئی تھی، جہاز بڑی تمکنت سے ساحل کے سبز کناروں کے ساتھ ساتھ جن پر گھنی جھاڑیاں اور پام کے درخت تھے آہستہ آہستہ رینگ رہا تھا اور اب کھلے سمندر کی جانب رواں تھا۔ ان کی پشت پر بندرگاہ میں مختلف ممالک کے جہاز اپنے رنگ برنگے جھنڈوں کے ساتھ ہلکورے لے رہے تھے۔ ڈھلتے شام کی نرم اور ڈوبتی ہوئی روشنی نے ماحول پر ایک رومان انگیز پر اسرار سناٹا طاری کر دیا تھا۔ جلد ہی رات کی چادر نے دنیا کو اپنی آغوش میں لے لیا۔

مسز ہیملن کی عادت تھی کہ صبح صادق سے پہلے وہ اٹھ کر عرشے پر جاتی تھیں کہ سورج نکلنے سے پہلے آسمان پر ایک بے نام سی تابندگی اور سمندر کی پرسکون سطح جو شیشے کی مانند لگتی تھی ان کے بیچین اور زخم خوردہ دل کے لئے مرہم کا کام دیتی تھی۔ مگر آج جب وہ عرشے کے مغربی کنارے پر پہنچیں تو انہوں نے دیکھا گیلیگر وہاں پہلے سے موجود ہے اور دور سماٹرا کے کٹے پھٹے ساحل کا نظارہ کر رہا ہے۔ وہ ابھی تک شب خوابی کے لباس میں تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ پلٹ کر اسکی نگاہوں سے بچتیں اس نے انہیں دیکھ لیا اور مسکرا کر کہا ''اتنی جلدی؟؟۔۔''

مسز ہیملن صرف ڈریسنگ گاؤن میں تھیں، چہرہ میک اپ سے مبرا تھا اور انہوں نے ایک لیس کی ٹوپی سے اپنے بکھرے الجھے بال چھپائے ہوئے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ اس حلیے میں وہ کیسی لگ رہی ہونگی۔ مگر انہوں نے بڑی خود

اعتمادی سے کہا جب عورت چالیس سال کی ہو جائے تو شائد اسے ان تکلفات کی ضرورت نہیں ہوتی۔ پھر کہنے لگیں تم بھی تو اتنی جلدی اٹھے ہوئے ہو۔ وہ کہنے لگا میں ایک کاشت کار ہوں میں نہ جانے کتنے سالوں سے پانچ بجے اٹھ رہا ہوں مجھے نہیں معلوم میں اپنی اس عادت سے کیسے نجات پاؤنگا۔

مسز ہیملن اب اسے اچھی طرح دیکھ سکتی تھیں کہ اسکا چہرہ ہیٹ سے ڈھکا ہوا نہیں تھا۔ وہ خوبصورت تو نہیں مگر جاذب نظر کہا جا سکتا تھا۔ شدید دھوپ اور گرمی میں کئی سال گذارنے کی وجہ سے اسکی جلد جل کر سنولا گئی تھی اور چہرے کے نقوش کھردرے ہو گئے تھے۔ اسکی عمر پینتالیس سے کم نہ تھی مگر اسکے سر کے بال کالے اور گھنے تھے۔ ''کیا تم چھٹیوں پر جا رہے ہو؟'' انہوں نے پوچھا۔ ''نہیں۔۔ میں ہمیشہ کے لئے وطن واپس جا رہا ہوں'' یہ کہتے ہوئے اسکے چہرے پر مسرت کی روشنی پھیل گئی اور اسکی آنکھیں خوشی سے چمک نے لگیں۔ اس سے پہلے کہ مسز ہیملن نیچے جا کر تیار ہوتیں اس نے انہیں اپنے متعلق بہت کچھ بتا دیا۔ وہ پچھلے پچیس سال سے ملایا میں ربڑ کی کاشت کی دیکھ بھال کر رہا تھا۔ گزشتہ دس سال تو ایک ایسے پسماندہ علاقے میں تعینات تھا جو کسی نیم ترقی یافتہ جگہ سے بھی کم از کم سو میل دور تھا۔ زندگی بہت تنہا تھی اور کسی ہم وطن کا ساتھ میسر نہ تھا۔ مگر اس نے خود کو اسکا عادی بنا لیا تھا پھر اس نے اس ملازمت میں بہت روپیہ کمایا تھا اور واپسی کی امید میں اس نے بہت سنجیدگی سے اسے اچھے اسٹاکس میں لگایا تھا۔ اب جبکہ وہ اتنا سرمایہ جمع کر چکا ہے کہ وطن میں ایک آرام کی زندگی بسر کر سکے وہ واپس لوٹ رہا ہے۔ مسز ہیملن نے پوچھا تم آئر لینڈ میں کہاں سے ہو۔ اس نے ایک چھوٹے سے گاؤں کا نام لیا۔ مسز ہیملن سالوں پہلے اس گاؤں سے گذری تھیں اور انہیں وہ گاؤں بہت بدرونق اور پسماندہ لگا تھا۔ انہیں خیال آیا کہ کیا یہ باقی زندگی ایسی جگہ گذارے گا مگر وہ کچھ نہ بولیں کیونکہ اسکی آنکھوں میں ایک ایسے بچے کی خوشی اور امید جھلک رہی تھی جسے اسکا پسندیدہ کھلونا ملنے والا ہو۔ اس نے کہا میں وہاں ایک حویلی خریدونگا جس کے چہار طرف طویل فارم ہوں تا کہ میں گھوڑے پال سکوں۔ میں صرف پینتالیس سال کا ہوں اور میں نے ورزش اور اچھی غذا کا استعمال کیا ہے۔ میں زندگی سے بھرپور ہوں اور ہر وہ چیز جس سے میں پچھلے پچیس سال ترسا ہوں اس سے لطف اندوز ہونگا۔ اس میں شادی بھی شامل ہے مجھے یقین ہے کہ اپنے ملک میں مجھے کوئی ایسی ہم سفر مل جائیگی جو زندگی میں میرا ہاتھ تھام لے۔ ''کیا آئر لینڈ میں تمہارا کوئی نہیں'' وہ کہنے لگا میرے ماں باپ کو مرے ہوئے کئی سال ہو چکے ہیں اور جہاں تک میں جانتا ہوں اس دنیا میں میرا کوئی نہیں ''۔ تمہیں کیا ملایا چھوڑنے کا کوئی دکھ نہیں، اتنے سال وہاں رہنے کی وجہ سے کسی سے تو دوستی یا لگاؤ ہو گیا ہوگا جسکی یاد تمہیں آئیگی بلکہ جدائی کے وقت بھی تمہارا دل بوجھل ہوا ہوگا کہ اب اس شخص سے دوبارہ کبھی ملنا ممکن نہ ہو۔ میں تو یہ سوچتی ہوں کہ چاہے تمہیں وطن واپسی کی مسرت نے مکمل طور پر اپنی گرفت میں لیا ہوگا مگر جب سچ مچ جدائی کا لمحہ آیا ہوگا تمہارے دل میں ایک ٹیس سی ضرور اٹھی ہوگی'' اس نے ایک قہقہہ لگایا اور کہنے لگا ''میں ان جنگلوں، ویرانیوں اور مقامی لوگوں سے اس قدر عاجز آ گیا تھا کہ مجھے یہ جگہ چھوڑنے کا کوئی غم نہیں اور اب میں اس جگہ کو اور یہاں پیچھے رہ جانے والے کسی کو دوبارہ دیکھنا نہیں چاہتا۔۔ دیکھنا تو بڑی بات ہے انکے بارے میں سوچنا بھی نہیں چاہتا''

سیلون کی بندرگاہ کولومبو پر ہڑتال تھی اس لئے جہاز اب راستہ کاٹ کر بحر ہند میں لمبے سفر پر روانا ہو گیا۔ مسافروں میں کرسمس کی تیاریوں پر تبادلہ خیالات ہو رہا تھا۔ مسئلہ یہ تھا کہ آیا کرسمس رقص اور دوسری تقریبات میں سیکنڈ کلاس کے مسافروں کو بھی مدعو کیا جائے؟ زیادہ تر فرسٹ کلاس کے مسافر اس کے خلاف تھے۔ ایک لمبی بحث اور ووٹنگ کے بعد فیصلہ کیا گیا کہ انہیں بلانے سے تقریبات کی رونق میں اضافہ ہو جائیگا۔ مسز ہیملن اس بحث میں شریک نہیں تھیں مگر جب وہ ڈنر کے لئے مکمل تیاری کے ساتھ عرشے پر پہنچیں تو گیلیگر وہاں ہاتھ میں ارغوانی شراب کا گلاس لئے کھڑا تھا۔ اس نے کہا ''خوب وقت پر آئیں یہ کاکٹیل کا وقت ہے، کیا تمہارے لئے کچھ آرڈر کروں'' وہ کہنے لگیں ضرور، بلکہ مجھے اپنا موڈ ٹھیک کرنے اور چونچال ہونے کے لئے اسکی ضرورت بھی ہے۔۔ ''کیوں؟۔۔ یہ پژمردگی کیوں؟؟'' مگر انہوں نے اسکا جواب نہیں دیا۔ پھر کہنے لگیں میں تم سے کل کہہ چکی ہوں میں چالیس سال کی ہوں۔ وہ ہنسا اور بولا میں نے ایسی کوئی عورت نہیں دیکھی جو اپنی عمر کو اس طرح بار بار جتاتی ہو۔ دونوں بار میں داخل ہوئے جہاں مسز ہیملن نے شمپین کا آرڈر دیا۔ وہ اپنی شراب کی چسکیاں لے رہا تھا اور اچھے موڈ میں تھا۔ یکا یک اسے دو ہچکیاں آئیں۔ مسز ہیملن کہنے لگیں تمہیں ہچکیاں آ رہی ہیں۔ اس نے جواب دیا کہ ہاں تقریبا سہ پہر سے ہچکیاں آ رہی ہیں شائد کھانا کھانے کے بعد بند ہو جائیں۔ انہوں نے ساتھ ڈنر کیا اور اپنے کمروں کی طرف چل دئے۔

اگلے تین دن مسز ہیملن اپنے خیالات میں اس قدر گم تھیں کہ انہوں نے اس بات کا نوٹس نہیں لیا کہ انہیں گیلیگر کہیں نظر نہیں آیا۔ ان کے پریشان کن اور تکلیف دہ خیالات اس قدر ان پر حاوی تھے کہ انہیں کوئی کام نہیں کرنے دیتے تھے۔ وہ کوشش کرتی تھیں کہ کسی چیز میں مصروف ہو کر ان سے نجات حاصل کر لیں مگر یہ ممکن نہ تھا وہ انتہائی دل شکستہ تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ جہاز جیسے جیسے اس جگہ سے دور ہوتا جائیگا جہاں انہیں یہ دکھ ملا تھا شائد انکا یہ دکھ بھی کم ہو جائے مگر جیسے جیسے جہاز انگلینڈ سے قریب ہوتا جاتا تھا ان کی پریشانی اور دھن بڑھتی جاتی تھی۔ انہیں معلوم تھا کہ انگلینڈ میں ایک تنہا، ویران اور اجڑی زندگی انکا انتظار کر رہی ہے۔ وہ پچھلے بیس سال سے شادی شدہ زندگی گزار رہی تھیں۔ وہ حقیقت پسند تھیں اور جانتی تھیں کہ اتنے سالوں بعد وہ یہ توقع نہیں کر سکتی تھیں کہ انکا شوہر نئے دنوں کی طرح محبت اور اشتیاق کا اظہار کرے اور ان کے چونچلے اٹھائے مگر انکے خیال میں وہ دونوں ایک دوسرے کے عادی ہو گئے تھے، زندگی پرسکون تھی اور سب جوڑوں کی طرح زندگی کے اس دور میں وہ ایک دوسرے کے لئے راحت کا

سامان تھے۔مگر ان کے شوہر نے اچانک انہیں بتایا تھا کہ وہ ایک دوسری عورت سے عشق میں مبتلا ہو گئے ہیں۔یہ آتی جاتی یا وقتی قسم کی دلچسپی نہیں بلکہ وہ بالکل ایک نوعمری کے دور کی اولیں محبت کی طرح اس عورت کے سحر میں ایسے گرفتار ہیں کہ وہ اس کے علاوہ کچھ سوچ نہیں سکتے نہ ہی اسکے بغیر زندگی کا تصور بھی کر سکتے ہیں۔اولیں صدمہ اور ذہنی جھٹکے کے بعد اور اپنے شوہر سے طویل بحثوں کے بعد کہ جب انکے شوہر نے کہا مجھے افسوس ہے میں اسے نہیں چھوڑ سکتا کہ وہ میری زندگی کا حصہ ہے اور جینے کا سہارا۔وہ اس نتیجہ پر پہنچی تھیں کہ اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں کہ ان سے علیحدہ ہو جائیں اور انگلینڈ پہنچتے ہی طلاق کے کاغذات داخل کر دئے جائیں۔مگر انہیں اپنی جس ذلت کا احساس ہوا تھا یا جیسے انکا دل ٹوٹا تھا اس کو صرف وہی جان سکتی تھیں۔ان کی کڑواہٹ اور عزت نفس کی پامالی کی یہ وجہ بھی تھی کہ اگر وہ کوئی نوخیز، جوانی سے بھر پور خوبصورت ہوتی تو وہ شاید اسے قبول کر لیتیں مگر وہ تو ان سے بھی آٹھ سال بڑی اور بھاری جسم کی ڈھلی ہوئی عورت تھی۔انہیں اپنی بیحد ہتک محسوس ہوئی تھی مگر وہ کسی نہ کسی طرح اس صدمے کو پر وقار انداز سے سہہ رہی تھیں۔

جہاز ایک بے کراں سمندر میں ہچکولے کھاتا چلا جا رہا تھا۔اس قدر سناٹا تھا کہ پچھلے تین دنوں میں انہیں کوئی کشتی،کوئی موٹر بوٹ کوئی سٹیمر نظر نہیں آیا تھا سمندر کی سطح پر پڑنے والی دھوپ اس طرح منعکس ہو رہی تھی کہ اس کی سطح شیشے کی طرح نظر آ رہی تھی۔انہیں اپنی زندگی بھی ایسی ہی ویران اور سناٹوں سے بھر پور لگ رہی تھی۔وہ تھک کر عرشے پر پڑی آرام کرسی پر گر سی گئیں۔اتنے میں مسٹر لنسل بھی وہاں آ کر بیٹھ گئے۔انہوں نے پوچھا''کیا تمہارا لندن میں بس نے کا ارادہ ہے؟''''شائد''انہوں نے غیر یقینی سے جواب دیا مگر اسی لمحے انہیں گیلیگر کا خیال آیا۔انکی نظر میں وہ کتنا خوش قسمت تھا کہ اسے معلوم تھا کہ وہ کہاں جا رہا ہے اور اسکا مستقبل کا کیا پروگرام ہے جبکہ انکی زندگی کی ناؤ بغیر کسی منزل کے بھٹک رہی ہے۔معاً انہوں نے پوچھا گیلیگر کہاں ہے؟ کئی دنوں سے نظر نہیں آیا''لنسل نے کہا''اوہ!!۔۔کیا تمہیں نہیں معلوم،وہ بیمار ہے''وہ بولیں''اوہ بیچارہ۔۔اسے کیا ہو گیا''اسے ہچکیاں آ رہی ہیں،لنسل نے بتایا۔''ہچکیاں؟؟؟انہوں نے حیرت سے کہا۔۔ہچکیاں کسی کو بیمار نہیں بناتیں،کبھی کبھی ہر ایک کو آ ہی جاتی ہیں''''حقیقت میں وہ کافی بیمار ہے جہاز کے سرجن کو بھی اس کے سلسلے میں تشویش ہے وہ کہتا ہے اس نے سب کچھ آزما لیا ہے مگر لگتا ہے کوئی دوا اثر نہیں کر رہی''''بڑی عجیب بات ہے''مسز ہیملن نے کہا اور وہاں سے اٹھ کر کمرے کی طرف چل دیں۔اس کے بعد انہیں گیلیگر کا دوبارہ خیال بھی نہیں آیا مگر دوسرے دن جب اتفاق سے انکی ملاقات جہاز کے ڈاکٹر سے ہوئی تو انہوں نے دیکھا کہ اسکا چہرہ تشویش کی وجہ سے مرجھایا ہوا ہے اور اس میں پہلے والا چونچال پن نہیں ہے۔انہوں نے پوچھا گیلیگر کیسا ہے۔وہ کہنے لگا مجھے افسوس ہے گیلیگر ٹھیک نہیں۔مسز ہیملن کے منہہ سے حیرت کی وجہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔۔''ہچکیوں سے؟؟؟ یہ تو ایک ایسی چیز ہے جسے کوئی بھی سنجیدہ نہیں لیتا اور کس کو ہچکیاں نہیں آتیں''مگر مادام اسکی حالات واقعی خراب ہے۔دراصل ہچکیوں کی وجہ سے وہ کئی دن سے کھانا یا پانی حلق سے نہیں اتار سکا ہے۔وہ پژمردہ ہو گیا ہے،اس پر کمزوری طاری ہو گئی ہے اور مجھے ڈر ہے کہ اگر میں جلد ہی انہیں روک نہ سکا تو پتہ نہیں اسکا کیا انجام ہو گا''مگر وہ مضبوط و تنومند ہے، طاقتور ہے وہ یقیناً صحت یاب ہو جائیگا۔میں نے تو سنا ہے کہ جلد یا بدیر ہچکیاں خود ہی رک جاتی ہیں''ڈاکٹر نے کہا خدا کرے ایسا ہی ہو۔۔مگر اس کا لہجہ بہت پر امید نہ تھا۔وہ ڈاکٹر کے ساتھ گیلیگر کو دیکھنے پہنچیں جسے اب اسکے کیبن سے جہاز کے ہسپتال میں منتقل کر دیا گیا تھا۔وہ ابھی کمرے کے دروازے ہی پر پہنچے تھے کہ انہیں ایک زوردار ہچکی کی آواز آئی۔گیلیگر کو دیکھ کر مسز ہیملن کو ایک ذہنی جھٹکا لگا۔اسکا گوشت گھل گیا تھا اس کی کھال اسکی گردن اور گالوں پر لٹک گئی تھی،چہرے پر ایک ایسی زردی چھائی تھی جسے دیکھ کر ڈر لگے اور اسکی چمکدار اور صحت مند آنکھیں دھندلا کر گڑھوں میں دھنس گئی تھیں اس کا کثرتی جسم ہچکیوں کی وجہ سے بار بار جھٹکے کھا رہا تھا۔مسز ہیملن کا دل اندر کے خوف سے لرزنے لگا مگر انہوں نے اسکی طرف دیکھ کر مسکرا کر کہا تمہیں اس حال میں دیکھ کر افسوس ہوا۔وہ بھی مسکرایا اور پوری ہمت سے کہنے لگا مجھے معلوم ہے میں ان ہچکیوں سے مرنے والا نہیں۔۔بس آئر لینڈ کے سرسبز ساحل تک پہنچنے کی دیر ہے۔گیلیگر کے بستر کے نزدیک ایک شخص بیٹھا تھا جو انہیں دیکھ کر ادب سے کھڑا ہو گیا۔ڈاکٹر نے بتایا کہ یہ پرائیس ہے جو ملایا میں گیلیگر کا فورمین تھا اور اب اسی کے ساتھ انگلینڈ جا رہا ہے۔۔جب مسز ہیملن جانے لگیں،پرائیس اٹھا اور ان سے کہنے لگا مادام کیا میں باہر اکیلے میں آپ سے بات کر سکتا ہوں۔مسز ہیملن اس کے ساتھ باہر آ کر عرشے کے جنگلے سے ٹیک لگا کر کھڑی ہو گئیں۔وہ کہنے لگا میں مسٹر گیلیگر کے ساتھ چار سال سے ہوں میں نے ان جیسا،شریف،نفیس اور مہذب انسان نہیں دیکھا۔پھر اسکے چہرے پر گہری فکر کے تاثرات ابھر آئے۔اس نے کہا مجھے یہ سب اچھا نہیں لگ رہا بلکہ یوں کہیں مجھے اس سے خوف آ رہا ہے۔میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ میں کیسے شروع کروں۔''تمہیں کیا اچھا نہیں لگ رہا یا تمہیں کس سے خوف آ رہا ہے''مسز ہیملن نے تعجب سے پوچھا۔''مادام،ڈاکٹر جانتا ہے اور میں آپ کو بھی بتا دوں گا مگر کوئی میری سنتا ہی نہیں''مسز ہیملن نے کہا تم وہم میں مبتلا ہو مسٹر گیلیگر دو ایک دن میں ٹھیک ہو جائینگے۔یہ صحیح ہے کہ ڈاکٹر نوجوان اور ناتجربہ کار ہے مگر ذہین ہے اور پھر ہچکیوں سے کوئی نہیں مرتا۔تم اپنے ذہن کو آرام دو۔پرائیس کے چہرے پر ہلکی سی جھنجلاہٹ نظر آئی وہ کہنے لگا۔''آپ نے نوٹ کیا تھا کہ یہ ہچکیاں ساحل چھوڑتے ہی شروع ہوئی تھیں۔۔اُس نے کہا تھا تم کبھی دوبارہ ساحل نہیں دیکھ سکو گے''مسز ہیملن نے اسکی طرف حیرانی سے دیکھا اور کہنے لگیں کس نے کہا تھا،تمہارا کیا مطلب ہے۔''مدام مجھے یقین ہے کہ وہ ایک سنگین بد دعا کے زیر اثر ہے۔جدید طریقہ علاج، دوائیں اس پر کوئی اثر نہیں کرینگی،اس پر سایہ ہے،اوہ مادام تم ان ملایا کی عورتوں

کونہیں جانتیں، میں نے ان کی آسیبی قوت کو قریب سے دیکھا ہے۔اس نے یہی کہا تھا کہ ایک دفعہ جہاز نے خشکی چھوڑی تو تم دوبارہ خشکی نہ دیکھ پاؤ گے'' صرف چند لمحے کو مسز ہیملن ٹھٹکیں مگر پھر بے ساختہ ہنس کر بولیں'' کیا بکواس ۔۔ یہ سب بکواس ہے'' ''یہی ڈاکٹر بھی کہتا ہے۔ مگر آپ میرے الفاظ یاد رکھنا یہ کسی دوسری بندر گاہ پہنچنے سے پہلے پہلے مر جائیگا'' یہ کہتے ہوئے پرائیس اسقدر سنجیدہ تھا اور اسکے چہرے پر خوف و بے بسی کے اسقدر گہرے سائے تھے کہ مسز ہیملن نا چاہتے ہوئے بھی اس سے متاثر ہوئے بنا نہ رہ سکیں۔انہوں نے پوچھا مگر ایک عورت انہیں کیوں بد دعا دیگی یا ان پر جادو کریگی؟ پرائیس نے جھجکتے ہوئے کہا ایک با عزت خاتون سے اسکا ذکر کرتے مجھے کچھ شرمندگی ہے۔مسز ہیملن نے اصرار کیا کہ وہ یہ جاننا چاہتی ہیں۔پرائیس نے نظریں چراتے ہوئے کچھ شرمندگی سے کہا آپ کو معلوم ہے کہ گیلیگر سالوں ایک ویران اور اجاڑ دیہی علاقے میں رہا۔وہ تنہائی کا شکار تھا۔۔۔پھر آپ جانتی ہیں مرد کی فطرت اور ضرورت کیا ہوتی ہے۔۔وہ یہاں جھجک کر ٹھہر گیا۔مسز ہیملن نے کہا میں سمجھ سکتی ہوں میں خود بیس سال شادی شدہ رہی ہوں۔پرائیس کہنے لگا مادام مجھے یہ کہتے ہوئے شرم سی محسوس ہو رہی ہے کہ اس نے اپنے ساتھ بارہ پندرہ سال سے ایک ملایا کی عورت رکھی ہوئی تھی۔جب گیلیگر نے جانے کی تیاری کی تو جیسے اس پر کوئی اثر نہیں ہوا وہ اسی طرح لا پروا بیٹھی رہی۔پھر گیلیگر نے اپنے جانے کے بعد اسکا مکمل بندوبست بھی کر دیا تھا۔اسنے اپنا بنگلہ، سارا ساز و سامان بھی اسے دے دیا تھا اور اپنے اثاثے سے اس کے لئے ماہانہ وظیفہ بھی باندھ دیا تھا۔وہ زمین پر بیٹھی خالی خالی نظروں سے اسے تکتی رہتی تھی۔پھر مزدور سامان اٹھانے آئے وہ پھر بھی خاموش رہی۔وہ ایک بت کی مانند بے حس بیٹھی رہی حتی کہ جب جانے کا وقت آیا، وہ پھر بھی خاموش بیٹھی رہی۔گیلیگر نے کہا میں جا رہا ہوں مجھے الوداع نہیں کرو گی۔وہ اس وقت برآمدے کی لکڑی کی سیڑھیوں پر بیٹھی تھی۔وہ اٹھی نہیں ،اس نے عجیب نظروں سے گیلیگر کو دیکھا اور عجیب آواز میں ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں کہا'' تم جاؤ۔۔جاؤ۔۔مگر میں تمہیں بتاتی ہوں تم کبھی اپنے وطن نہیں پہنچ پاؤ گے۔۔جب خشکی کو سمندر نگل لیگا موت تمہیں اچک لے گی۔یہ کنارہ چھوڑنے کے بعد اس سے پہلے کہ تم خشکی کا کنارہ دوبارہ دیکھو موت تمہیں جھپٹ لیگی'' یہ کہتے ہوئے اسکی آنکھوں میں کچھ ایسی آسیبی چمک لہرائی کہ میں اندر سے لرز گیا۔مسز ہیملن نے پوچھا'' گیلیگر نے یہ سن کر کیا کہا؟'' مادام آپ سوچ ہی سکتی ہیں۔۔وہ ایک زوردار قہقہہ لگا کر ہنسا، موٹر میں بیٹھا اور گرد اڑاتا شہر کی جانب چلدیا۔

مسز ہیملن کھو سی گئیں،انہوں نے تصور کی آنکھ سے دیکھا کہ ربر اور پام کے جنگلات میں بانسوں کے بنے ایک بنگلے کی سیڑھیوں پر ایک ملاین عورت سارونگ (تہمد) پہنے بیٹھی ہے، اسکے دانت مقامی جڑی بوٹیاں چبانے سے سیاہ ہیں، ہوائیں سیٹیاں بجاتے ہوئے چل رہی ہیں اور وہ اپنی ویران نگاہوں سے ،جن میں آنے والے دنوں کی غیر یقینی ہے خلاؤں میں تک رہی ہے۔۔انہیں جھرجھری سی آئی مگر وہ جلد ہی سنبھلیں اور کہنے لگیں مسٹر پرائیس یہ سب جھوٹی اور بے بنیاد باتیں ہیں۔پرائیس کہنے لگا'' آپ چاہے ہنسیں یا کچھ کہیں میری بات یاد رکھیں جدید دوائیں، خاص طور سے سفید فام قوموں کی دوائیں اس پر کوئی اثر نہیں کریں گی یہ جادوئی عمل ہے'' مسز ہیملن نے دلیل دی'' مگر اس عورت کو اس سے کوئی شکایت تو نہیں ہونی چاہئے، گیلیگر نے اسکا اچھا بندوبست کر دیا تھا اور اسے تو معلوم ہوگا کہ یہ ایک نہ ایک دن چلا ہی جائیگا پھر ایسا کوئی زہر نہیں ہوتا جو سات دن بعد اپنا اثر شروع کرے'' پرائیس بولا مجھے یہ تو نہیں معلوم کہ اس کے سیاہ اور تاریک دل میں کیا تھا مگر میں یہ جانتا ہوں کہ یہ عورتیں ایک خاص قوت کی مالک ہوتی ہیں۔یہ زہر نہیں یہ جادو ہے۔میں نے ان مشرقی ممالک میں عجیب وغریب واقعات دیکھے ہیں جنہیں ہم سفید فام نہیں سمجھ سکتے۔'' وہ اچانک بیچین ہو گیا اور تیز آواز میں معذرت کر کے نیچے دوسرے درجے کی طرف اپنے کمرے کی جانب چل دیا۔

دوسرے دن سہ پہر جب مسز ہیملن کو جہاز کا ڈاکٹر نظر آیا تو انہوں نے اس سے پوچھا گیلیگر کیسا ہے۔اس نے ملی جلی پریشانی اور مایوسی سے کہا'' میں کیا کہوں میں سب کچھ آزما چکا ہوں میرے پاس اب مزید کچھ کرنے کو نہیں۔۔بس یہ میری بدقسمتی ہی ہے کہ مجھے ایسے کیس سے واسطہ پڑا یہ کیس تو خشکی پر ایک بڑے ہسپتال کے لئے بھی مشکل ہوتا تو یہاں بیچ سمندر اور پانی کے جہاز پر تو۔۔'' وہ مزید کچھ نہ بول سکا۔وہ ایڈنبرا کا سکوٹ تھا اور نیا نیا فارغ التحصیل ہوا تھا۔اس نے تو جہاز کی نوکری اس لئے کی تھی کہ سیاحی نصیب ہوگی اور جہاز کی پررونق زندگی، راتوں کو بالروم ڈانسنگ اور اچھا کھانا ملے گا اور یہاں اس کو ایسے عجیب وغریب کیس سے واسطہ پڑ گیا تھا۔اسے خیال آتا تھا کہ مسافر اسکے بارے میں بہت برا تاثر رکھتے ہونگے۔وہ سوچتے ہونگے کہ میں نرا بیوقوف ہوں۔مسز ہیملن نے پوچھا کیا اس نے پرائیس کی بات سنی ہے؟ ہاں سنی ہے مگر یہ تو بالکل بکواس ہے ایسی حماقت آمیز باتوں پر کون یقین کر سکتا ہے۔میں نے کیپٹن سے کہا تو وہ بہت ناراض ہوا اور کہا کسی سے یہ کہنے کی جرأت بھی نہ کرنا کیونکہ مسافروں میں بے وجہ دہشت پھیلے گی۔پھر مسز ہیملن کی طرف دیکھ کر کہنے لگا مجھے یقین ہے آپ ایسی کسی واہیات بات پر یقین نہیں کر سکتیں۔مسز ہیملن نے کہا نہیں نہیں۔۔مگر میں مشرق میں سالوں رہی ہوں اور میں نے کچھ عجب واقعات دیکھے ہیں جن کی کوئی توجیہ نہیں ہو سکتی۔ڈاکٹر یہ بڑی پراسرار دنیا ہے۔

کسی کو نہیں معلوم کیسے، مگر جہاز میں یہ بات پھیل گئی کہ گیلیگر پر جادو کر دیا گیا ہے اور اس کا بچنا مشکل ہے۔خواتین ڈیک پر بیٹھے سوئٹر بنتے ہوئے، مرد بلئیرڈ کھیلتے اور کچھ بار میں شراب کے جام ہاتھ میں لئے اس عجیب واقعہ کا ذکر کرتے نظر آتے۔ڈاکٹر بہت پریشان تھا وہ وائرلیس پر دوسرے جہازوں سے بھی مدد مانگ رہا تھا مگر دوسرے ڈاکٹر جو کچھ بھی بتاتے تھے وہ سب کچھ پہلے ہی کر چکا تھا۔جہاز اس وسیع سمندر میں ایک چھوٹی سی کاغذ کی کشتی کی مانند اپنی منزل کی

طرف یکساں رفتار سے رواں تھا کہ یکا یک مسافروں نے محسوس کیا کہ جہاز نے اپنا رخ بدلا ہے۔انجن اب پوری قوت سے پانی کو چیر رہے تھے انجن کے شور کے ساتھ جہاز تیزی سے تھرتھرا رہا تھا جس سے مسافروں کی پریشانی میں اضافہ ہوگیا تھا۔انہیں بتایا گیا کہ کیپٹن نے فیصلہ کیا ہے کہ اپنا رخ بدل کر وہ جلد سے جلد یمن کی بندرگاہ عدن پر لنگر انداز ہوگا اور وہاں گیلیگر کو اتارا جائے گا تا کہ وہاں کے بڑے ہسپتال میں اسکا علاج کیا جاسکے۔

اس ناخوشگوار معاملے سے سب پریشان تھے اور چاہتے تھے کہ جلد سے جلد عدن پہنچا جائے تا کہ گیلیگر سے چھٹکارا حاصل ہوسکے۔اس کے بعد اس پر کیا بیت تی ہے اس سے انہیں کوئی غرض نہ تھی،بس سب یہ چاہتے تھے کہ وہ جہاز پر نہ مرے کیونکہ وہ اس ناخوشگوار حادثے سے دوچار ہونا نہیں چاہتے تھے۔وہ ویسے ہی اس بات سے نالاں تھے کہ اسکی بیماری نے ماحول کو آلودہ کر دیا تھا۔مسز ہیملن اب ہر روز اسے دیکھنے جاتی تھیں اور انہیں احساس ہوتا تھا کہ وہ لمحہ لمحہ موت کے نزدیک ہو رہا ہے۔اسکی کھال اسکی ہڈیوں پر اس طرح ڈھیلی ہو کر لپٹ گئی تھی جیسے بستر پر پڑی ایک چادر جس پر کئی سلوٹیں پڑی ہوں۔اسکی بھری ہوئی گردن سے کھال لٹک کر ایسی لگ رہی تھی جیسے کسی بیمار مرغے کی کلغی اور اسکے گال پچک کر جبڑے کی ہڈی سے چپک گئے تھے۔اب وہ زیادہ تر نیم بے ہوشی کے عالم میں رہتا تھا مگر جب بھی وہ تھوڑا سا ہوش میں ہوتا مسز ہیملن کو دیکھ کر دلیرانہ طور پر مسکراتا ضرور۔۔پھر کہتا ہم جس وقت اس کم بخت گرمی اور مرطوب آب و ہوا سے نکل جائینگے میں ٹھیک ہو جاؤں گا۔اوہ میں کس قدر بے تابی سے اس لمحے کا انتظار کر رہا ہوں جب میں آئرلینڈ کے کنارے بحر اوقیانوس کے یخ اور حیات افزا پانی میں دور تک تیروں گا۔۔مگر اسکا جملہ پورا ہونے سے پہلے ایک شدید ہچکی اس کے پورے جسم کو لرزا دیتی۔پرائیس اس کے پاس کھڑا تھا وہی زیادہ تر اسکی تیمارداری کر رہا تھا۔مسز ہیملن کے ساتھ وہ باہر آیا اور کہنے لگا مجھے کیپٹن نے بلایا تھا اور بہت سرزنش کی تھی کہ میں واہیات افواہ پھیلا رہا ہوں مگر اسے نہیں معلوم کہ میں نہیں بلکہ اس جہاز پر سوار چینی،ملاین اور دوسرے مقامی افراد اس کے ذمہ دار ہیں جو اچھی طرح جانتے اور اس بات پر یقین کر رہے ہیں کہ کئی سو میل دور بیٹھی ایک ملاین عورت اپنے جادو سے اسے قتل کر رہی ہے۔میرے چینی دوست کہتے ہیں اسکا توڑ ایک جادو کا عمل ہی ہوتا۔میں نے اپنی آنکھوں سے اس قسم کے عمل سے لوگوں کو موت کے منہ سے نکلتے دیکھا ہے۔جہاز پر ایک چینی عامل موجود ہے جو کہتا ہے وہ اسکا توڑ کر سکتا ہے مگر اس کے لئے ایک زندہ جانور کی ضرورت ہے۔وہ کہتا ہے ایک مرغے سے کام چل جائیگا۔پھر وہ سنجیدگی اور سختی سے کہنے لگا مجھے کپتان نے تنبیہ کی ہے کہ میں ایسی کوئی حرکت نہ کروں مگر مجھے اپنے مالک کو ہر حال میں بچانا ہے چاہے کپتان مجھے زندگی بھر جیل میں بند کر دے۔اسی اثنا میں مسز لنسل آ گئیں جو کرسمس ڈانس پر اپنے لباس پر مسز ہیملن کی رائے لینے آئی تھیں۔پھر کہنے لگیں مجھے خدشہ ہے کہ گیلیگر کرسمس کے دن ہی نہ مر جائے۔اگر ایسا ہوا تو ہم اپنے ڈانس سے محروم رہ جائینگے۔انہوں نے کہا میں نے ڈاکٹر سے کہا ہے اگر وہ کرسمس کے دن مر گیا تو میں اس سے زندگی بھر بات نہیں کروں گی۔جس پر ڈاکٹر نے وعدہ کیا ہے کہ اپنی پوری کوشش کریگا کہ وہ گیلیگر کو کرسمس تک زندہ رکھے۔

مسز ہیملن اس رات نیند سے چونک اٹھیں انکا چہرہ اور تکیہ آنسوؤں سے تر تھا وہ نیند میں رو رہی تھیں۔انکے دل میں ٹیس اٹھی کہ کس طرح انکے شوہر نے انکا دل توڑا ہے اور انہیں ذلیل کیا ہے۔وہ گھبراہٹ میں کیبن سے نکلیں اور ڈیک پر گئیں تا کہ انکا دل بہلے۔رات تاریک تھی اور سوائے جہاز کے انجن کی ہلکی تھرتھراہٹ کے کوئی آواز نہ تھی۔انہوں نے نیچے جھانکا،وہاں نچلے ڈیک پر چھوٹا سا الاؤ روشن تھا اور اسکے چاروں طرف لوگ بیٹھے تھے۔یہ سب سیاہ فام مقامی تھے مگر ان میں ایک یوروپین بھی تھا جو سب چپکے چپکے کسی زبان میں منتر پڑھ رہے تھے پھر پروں کے پھڑ پھڑانے کی آواز آئی اور مرغے کی چیخ۔۔جو پوری بھی نہ ہو سکی۔وہ جان گئیں پرائیس اپنے مالک کو بچانے کے لئے جادو کا توڑ کر رہا ہے وہ کچھ خوف زدہ ہو کر جلدی سے ریلنگ سے ہٹ آئیں اب پو پھٹ رہی تھی اس نیم تاریکی میں انہیں ڈاکٹر اپنی طرف آتا نظر آیا انہوں نے پوچھا گیلیگر کیسا ہے۔وہ کہنے لگا رات بھاری گذری ہے میرا خیال تھا وہ صبح نہ دیکھ پائے گا میں نے اسے ایک طاقتور نیند کا انجکشن دے دیا ہے۔وہ رات بھر بےچین تھا اور بار بار اٹھ کر بھاگنے کی کوشش کرتا تھا اس میں اب بھی بہت طاقت ہے اور اسے قابو کرنے میں مجھے بہت دشواری ہوتی تھی۔وہ کسی اجنبی زبان میں بڑبڑا رہا تھا جو میں سمجھ سکا وہ بار بار کسی عورت کا نام لیتا تھا اور کہتا تھا وہ مجھے بلا رہی ہے،بہر حال اب وہ گہری نیند سو رہا ہے مگر ہچکیوں سے اسکا جسم اب بھی جھٹکے کھا رہا ہے۔مسز ہیملن کی تصور میں اب بھی وہی ملاین عورت آئی جو سارونگ پہنے سیڑھیوں پر بیٹھی تھی اور منہ ہی منہ میں کچھ دعائیں پڑھ کر گیلیگر کی جانب جیسے مٹھی بھر بھر کر ریت پھینک رہی تھی۔وہ کانپ سی گئیں اور اپنے کمرے کی طرف بھاگیں۔

جہاز پر موت کا ماحول طاری ہو گیا لوگ ایک دوسرے سے بات کرتے ڈرتے تھے۔ہر شخص کے دل میں ایک خوف سا بیٹھ گیا تھا۔ناشتے پر وہ ڈاکٹر کی ٹیبل پر تھیں بار کے کاؤنٹر پر ایک آدمی کھڑا وسکی کے گھونٹ اتار رہا تھا اسکی بےچینی اور جھنجلاہٹ سب پر عیاں تھی پھر یکا یک اس نے با آواز بلند کہا۔۔وہ کہا جو اگر چہ ناگوار تھا مگر تھا سب کے دل میں ''اگر گیلیگر کو جانا ہی ہے تو بس اب وہ جلدی کرے ہم یہ سسپنس اور تناؤ دیر تک برداشت نہیں کر سکتے۔ڈاکٹر کہنے لگا میں بھی منتظر ہوں کہ جلد عدن پہنچیں تا کہ میں اسے زمینی عملے کے حوالے کروں۔مسز ہیملن نے پوچھا ہم کب عدن پہنچیں گے۔''کل صبح چھ اور سات کے درمیان'' داکٹر نے مختصر جواب دیا۔یعنی ابھی مزید چوبیس گھنٹے باقی ہیں۔انہیں جھرجھری آئی جب انہیں یاد آیا کہ اس عورت نے کہا تھا گیلیگر خوشکی نہ دیکھ پائے گا۔

وہ رات کرسمس سے ایک دن پہلے کی رات تھی،دوسرے دن کرسمس

تھی۔رات پرسکون تھی آسمان پر تارے بکھرے تھے ویسے بھی سمندر پر تاریک رات کو آسمان بہت سے تاروں سے بھر جاتا ہے، ہوا میں نرمی تھی اور ابھی صبح کے کوئی آثار نہ تھے وہ حسب عادت ڈیک پر پہنچیں۔اس جھٹ پٹے میں انہوں نے دیکھا سامنے سے ڈاکٹر آرہا ہے، وہ رات بھر سو نہ سکا تھا، اسکی یونیفارم شکن آلودہ تھی، داڑھی بڑھی تھی اور اسکے دونوں کندھے جھکے تھے اسکی چال میں ایک تھکن اور شکست خوردگی تھی۔انہیں پوچھنے کی ضرورت نہ تھی۔۔انہوں نے جان لیا کہ گیلیگر موت سے شکست کھا گیا ہے انہوں نے پوچھا ''کب'' اس نے جواب دیا کچھ دیر پہلے۔مسز ہیملن نے دیکھا ان کے اطراف بیکراں سمندر ٹھاٹیں مار رہا تھا۔خوشکی کا کہیں پتہ نہ تھا۔انہیں پھر یاد آیا اس ظالم عورت نے یہی کہا تھا کہ تم خوشکی نہ دیکھ سکو گے۔

دھوپ نکلنے پر کپتان نے اس کی تدفین کا بندوبست کیا۔بالائی اور زیریں عرشوں پر تمام عملہ اپنی بہترین یونیفارم میں قطار میں کھڑا تھا۔مسافر بھی اپنی اپنی نشستوں پر بیٹھے تھے پادری نے اونچی آواز میں کہا ''انسان جو اپنی ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا اس دنیا میں صرف مختصر عرصے کے لئے آیا ہے۔یہ وقفہ چاہے لمبا ہو پھر بھی مختصر ہے۔وہ ایک پودے کی طرح بڑھتا ہے مگر جب اس میں پھول آتے ہیں تو انہیں بیدردی سے کاٹ دیا جاتا ہے۔وہ اس دنیا میں ایک سائے کی طرح گذرتا ہے اور پھر اپنی آخری آرام گاہ عالم بالا کی جانب چلا جاتا ہے'' اسکے بعد کچھ دعاؤں کے ساتھ تابوت اونچا کیا گیا اور گیلیگر کو سمندر کے سپرد کر دیا گیا۔مسز ہیملن کی آنکھیں آنسوؤں سے تر تھیں۔

وہ اپنے کمرے میں آکر بے جان سی اپنے بستر پر گریں وہ دنیا کی بے ثباتی پر بہت دکھی تھیں۔انہیں محسوس ہوا کہ ہم واقعی سائے کی طرح یہاں سے گذرتے ہیں۔خوشیاں مختصر اور دور ہیں یہ سب جھگڑے یہ سب رنجشیں بے حقیقت ہیں۔اگر کسی کو خوشی مل سکے تو شائد اسے حق ہے کہ وہ انہیں حاصل کر لے۔خوشیوں کے حصول میں کسی کو رکاوٹ نہیں بننا چاہیے۔دوسری صبح وہ اٹھیں۔انہوں نے سٹیورٹ سے قلم اور کاغذ منگایا اور خط لکھا، یہ خط شوہر کے نام تھا۔

پیارے ایڈورڈ

آج کرسمس ہے اور میں تمہیں بتانا چاہتی ہوں کہ میرے دل میں تم دونوں کے لئے ہمدردی اور نرمی کے جذبات ہیں۔مجھے خیال آیا کہ میں دماغ سے نہیں دل سے سوچ رہی تھی۔

اب مجھے محسوس ہوا کہ ہمیں ان کے راستے میں رکاوٹ نہیں بننا چاہئے جو خوشیوں کی تلاش میں ہیں اس لئے کہ اس مختصر زندگی میں ہر ایک کو خوشیاں تلاش کرنے اور حاصل کرنے کی اجازت ہونی چاہئے۔میں بتاتی ہوں کہ اگر تمہارا دل اس مسرت کو حاصل کر رہا ہے تو میرے دل میں تمہارے لئے کوئی انتقامی یا حسد کا جذبہ نہیں۔مجھے اس کا شکر گذار ہونا چاہئے کہ ہم نے بیس سال خوشیں کے ساتھ گذارے اور اس میں تمہارا بڑا حصہ تھا۔مجھے اچھے خیالوں میں یاد رکھنا میں بھی ایسا ہی کرونگی۔

تمہاری ایلس

انہوں نے خط کو تہہ کیا، اسے لفافے میں بند کر کے اپنی نسوانی تحریر میں اس پر پتہ لکھا اور یہ جانتے ہوئے بھی کہ کئی دن بعد پورٹ سعید پر ہی ڈاک نکلے گی انہوں نے اسے قریبی لگے ڈاک کے ڈبے میں ڈال دیا۔

شہزاد نیّر

(راولپنڈی)

اُس حسنِ ہجریاب کا طرفہ جمال دیکھ
آنکھوں میں پھیلتا ہوا رنگِ ملال دیکھ

تُو دیکھتا نہیں تھا مرے حال کی طرف
اب گردشوں میں گھوم، زمانے کی چال دیکھ

ایسے سمجھ نہ آئے گی حالت مری تجھے
اپنا عروج دیکھ کے میرا زوال دیکھ

زخموں کی آب و تاب سے رونق تو دل میں تھی
تُو اندمال چھوڑ، غمِ اندمال دیکھ

کچھ پرکشش نہیں ہیں جوابوں کی صورتیں
اے صاحبِ نگاہ تُو حسنِ سوال دیکھ

انبوہ لگ رہے ہیں نظاروں کے جا بجا
نظروں کی خیر مانگ، یہاں خال خال دیکھ

پہرے پہ بے شمار ہیں آنکھوں کے کیمرے
اے شائقِ جمال ذرا دیکھ بھال دیکھ

اُس نے خمارِ دید میں ہولے سے یہ کہا
پگھلا رہی ہیں مجھ کو، نگاہیں سنبھال دیکھ

نیّر کسے نصیب ہے دیدِ دیارِ دل
بس دلبروں کی دلبری کے خدّ و خال دیکھ

چند سپیاں سمندروں سے

(سفرنامۂ جنوبی افریقہ سے انتخاب)

پروین شیر (کینیڈا)

قسط آخری

گرتی ہوئی دیواریں

صبح سینڈی سے پھر ملاقات ہوگئی تھی۔ پروین اُس سے ہر بار باہر جانے سے پہلے گفتگو کرتی تھی۔ اپنی معلومات میں اضافہ کرتی تھی۔ سینڈی نے ایک فکشن نگار لنڈا فورچُن Linda Fortune کی خودنوشت کا ذکر کیا تھا جس کا نام'' The House in Tyne Street- Childhood Memories of District Six'' بتایا تھا۔ پروین اُس کتاب کو حاصل کرنے کے لیے بے چین ہوگئی تھی۔ آخر ایک دوکان میں یہ کتاب نظر آ ہی گئی۔ جب اُسے پڑھنا شروع کیا تو ختم کیے بغیر نہ رہ سکی تھی۔ چند صفحات پر تو الفاظ نہیں۔۔۔ بلکہ درد کا سمندر تھا۔ کراہوں کا آبشار تھا۔ آہوں کا دھواں تھا۔ بے بسی کی سسکیاں تھیں۔ تشدد کے ہتھوڑے تھے۔ وہ ان الفاظ کے سمندر میں بہتی چلی گئی تھی۔۔۔ مثلاً ''ڈسٹرکٹ 6 میں بہت سارے ایسے لوگ تھے جو نہیں جانتے تھے کوئی لفظ ''بل ڈوزر'' بھی ہوتا ہے۔ زیادہ تر لوگوں نے ایسی چیز کبھی دیکھی ہی نہ تھی اور نا ہی اس کی تصویر دیکھی تھی۔ اسے دیکھنے کا پہلا اتفاق ہم لوگوں کے لیے ایک خوفناک تجربہ تھا۔ یکا یک ایک صبح یہ بڑا خطرناک بل ڈوزر گرجتا ہوا ٹائن اسٹریٹ Tyne Street میں آیا تھا اور پھر چیپل اسٹریٹ Chapel St میں۔۔۔ زیادہ تر ہمسائے اور ان کے بچے اس کے پیچھے دوڑ رہے تھے جب کہ دوسری عمر والے لوگ اپنے گھروں کے باہر جمع تھے۔ یہ دیکھنے کے لیے کہ یہ آواز کیا تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے Space Ship زمین پر آ گیا ہے۔ جیسے یہ ڈسٹرکٹ 6 Invade کرنے آیا ہے''کیا تم لوگ دیکھ سکتے ہو یہاں کیا ہو رہا ہے؟ میں نے تم سے کہا تھا کہ دنیا ختم ہونے کو ہے اب۔'' ایک ضعیف عورت چیخ کر بولی۔۔۔''نہیں''۔۔۔ سڑک کے سامنے سے ایک آدمی چیخ کر بولا''دنیا ختم نہیں ہو رہی ہے۔۔۔ ہم لوگ ڈسٹرکٹ 6 میں ختم ہو رہے ہیں۔۔۔''بل ڈوزر کے لیے ڈرائیور نے چیخ کر لوگوں کو ہٹ جانے کو کہا۔ کیونکہ اُسے اس کام کے لیے رکھا گیا تھا۔''پلیز راستے سے ہٹ جاؤ لوگو! جو راستے میں آئے گا وہ زخمی ہو جائے گا۔'' آہستہ آہستہ لوگ وہاں سے ہٹ گئے''اوہ'' ایک بوڑھا آدمی جسے میں نے اکثر دیکھا تھا چلتے ہوئے اپنی چھڑی کے ساتھ درد بھرے لہجے میں بولا۔۔۔''میں بہت خوش ہوں کہ میری بیوی یہ سب دیکھنے کو اب زندہ نہیں جو آج یہاں ہو رہا ہے۔ ہم لوگ یہاں ساٹھ سال تک رہے۔۔۔ ساٹھ سال۔۔۔! سب ختم'' اور وہ آہستہ آہستہ چلا جا رہا تھا۔ بل ڈوزر نے جب بڑھنا شروع کیا تو عمارتیں بکھرنی شروع ہو گئیں۔ دھیرے دھیرے پہلے ایک دیوار پھر دوسری پھر چھت کا ایک حصہ۔ بلڈوزر ایک جنگ کے ٹینک کی طرح چلتا رہا میری چھوٹی بہن پیٹسی Patsey نے اپنے کان بند کر لیے کیونکہ بل ڈوزر کا شور ناقابل برداشت تھا۔ ''نہیں۔۔۔ چلے جاؤ'' وہ چیخی''روک دو۔۔۔ روک دو یہ سب'' لیکن اس کی بچکانہ پکار بربادی کے شور میں گم ہو گئی۔ زیادہ تر لوگ یوں کھڑے تھے جیسے انہیں بجلی کا کرنٹ اسی وقت دیا گیا ہو۔ الیکٹرک شاک۔ چپ چاپ وہ اپنے سامنے تباہی کو تک رہے تھے۔ ڈیزی ماں کے پاس سمٹ گئی سہم کر۔۔۔ کہ اگلا نمبر ہمارے گھر کا ہوگا۔۔۔'' کاش میرے پاس جون وین کی طرح بندوق ہوتی تو میں اس کو شوٹ کر دیتی جو بلڈوزر پر ہے۔'' پیٹ Pete نے سرگوشی کی۔ ماں کا جواب سنائی نہیں دیا کیونکہ دوسری دیوار دھماکے کے ساتھ زمین پر آ گری تھی۔ بوئے ٹاٹر بیما (Boeta Bruima) نے اپنی بانہیں موجی آوا Motje Awa کے گرد لپیٹ رکھی تھیں۔ وہ سسک رہی تھی۔ آہستہ سے۔ آنسو اس کی جھریوں سے بھرے ہوئے براؤن رخسار پر بہہ رہے تھے اُس نے اسے تسلی نہیں دی۔ وہ صرف اپنا سر دائیں بائیں ہلاتا رہا۔ کچھ دیر بعد ہم لوگ بہ مشکل کچھ دیکھ پا رہے تھے۔ گرد و غبار کے بادل اٹھ رہے تھے ملبے سے۔ پانی کے پائپ اور بجلی کے تار دھند میں خشک رگوں کی طرح ملبے کے درمیان تھے۔''

پروین یہ سب پڑھ کر محسوس کر رہی تھی کہ وہ بھی ڈسٹرکٹ 6 میں ان سب لوگوں کے ساتھ کھڑی ہوئی ہے اور بلڈوزر کے خوفناک شور میں ڈوب گئی ہے۔ نظروں کے دریا دھول ہی دھول سے اَٹ گئے ہیں۔ تشدد کا بلڈوزر جیسے اس کی طرف بڑھتا آ رہا ہے۔ قریب اور قریب۔۔۔ یہاں تک کہ اس کا وجود ملبوں میں بکھر گیا ہے۔ کتاب اُس کے ہاتھوں سے چھوٹ کر گر پڑی۔۔۔ زمین پر اور وہ بھی۔

دیارِ قزح (ملائی کوآرٹرس Malay Quarters)

وین اب Bo-Baap اسلامی رہائشی علاقے ملائی کوآرٹرس کی طرف رواں تھی۔ کیتن اور یوپا کا ساتھ چھوٹ چکا تھا۔ وہ سب ماضی ہو گئے تھے۔ یہی ہوتا ہے۔ دھند سے نکل کر لمحات مسلسل آتے رہتے ہیں اور سامنے سے گزر کر شیشے کی دیوار کے پیچھے چلے جاتے ہیں۔ Unbreakable دیوار جنہیں ہم توڑ کر وہ لمحات پکڑ کر واپس نہیں لا سکتے صرف دور سے دیکھ سکتے ہیں۔ دیکھتے رہتے ہیں۔ لمحات کے قافلے مستقل گزرتے رہتے ہیں۔ نئے لمحات میں گائڈ رچرڈ بھی نیا تھا اور سیاح ساتھی بھی۔ کیتھی اور لیسا۔۔۔ یہ دونوں یہودی تھیں انہیں اس کا بھی علم تھا کہ ان کے ساتھی مسلمان ہیں۔ لیکن ان کا اپنا پن، ان کی خوش مزاجی دیکھ کر پروین سوچ رہی تھی کہ ہر انسان کی بنیادی ضرورت صرف خلوص اور محبت ہی تو

ہے۔لیکن کتنی اونچی اونچی فصیلوں کے اندر ایک دوسرے سے الگ الگ قید ہیں سب۔کچھ لوگ چاہ کر بھی ان دیواروں کو نہیں توڑ سکتے۔پروین نے ملکوں ملکوں جا کر یہی دیکھا کہ اگر کسی انجان زبان کے درمیان کوئی ہم زبان مل جائے تو خواہ وہ کسی بھی مذہب یا نسل کا ہو اپنا اپنا سا لگتا ہے۔ایک عجیب تحفظ کا احساس ہوتا ہے۔ساری دیواریں گر جاتی ہیں، دوریاں مٹ جاتی ہیں۔انجان لوگوں سے پرانی پہچان لگتی ہے۔یہ زبان کا کرشمہ ہوتا ہے۔زبان میں کتنی طاقت ہوتی ہے۔

گائڈ رچرڈ جو گوری نسل کا افریقی تھا ہنس مکھ اور مزاحیہ ہونے کے علاوہ متعصب بھی تھا۔اُس کے اندر کالوں کے خلاف تلخیاں تھیں۔منڈیلا کے خلاف بھی تلخیاں تھیں۔اُس کے خیال میں منڈیلا ایک دہشت گرد تھا۔یہ سن کر حیرانی ہوئی تھی لیکن اس سے مخالفت مناسب نہ تھی۔اس لیے سب خاموش تھے۔ منڈیلا کے لیے دہشت گرد کے خطاب نے سبھی کو چونکا دیا تھا۔رچرڈ کے لہجے میں چھپی تلخیوں کے متعلق پروین سوچ رہی تھی۔۔۔حیران تھی۔۔۔شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ اپارٹ ہائیڈ ختم ہونے کے بعد اس کی آسائشیں اور اس کی Supremacy چھن گئی تھی۔وہ یہ سوچنے لگی تھی کہ کسی کی جان لینے کے لیے ہتھیار بنانا ضرور دہشت گردی ہے لیکن اپنی جان بچانے کے لیے ہتھیار بنانے کو دہشت گردی نہیں کہہ سکتے۔دوسروں کی جان لینا۔۔۔خواہ وہ اپنے حقوق کے لیے ہی کیوں نہ ہو۔۔۔جرم ہے۔

منڈیلا نے اپنی اور اپنے لوگوں کی جان بچانے کے لیے اگر ہتھیار بنانے کی کوشش کی تو یہ کوئی جرم نہیں تھا کیونکہ یہ تو جان بچانا ہوا اور وہ جان لینا۔اگر وہ دہشت گرد ہوتا تو اسے نوبل پیس پرائز کیوں ملتا؟۔۔۔رچرڈ کی باتیں وہ ناگواری کے ساتھ سن رہی تھی۔کیتھی اور لیسا کو اس سے کوئی فرق نہیں پڑا تھا شاید۔ یا وہ اپنے آپ میں مگن اس کی باتوں پر دھیان نہیں دے رہی تھیں۔رچرڈ بولتا جا رہا تھا۔۔۔کہ منڈیلا نے بہت بڑا جرم کیا تھا اسی لیے اُسے جیل بھیجا گیا تھا۔

ایک منزلہ رنگین گھر قطاروں میں نظر آ رہے تھے پہاڑی پر۔ ڈھلوانوں پر۔وہ وین ملائی کوارٹرز پہنچ گئی تھی جو صرف مسلمانوں کا علاقہ ہے۔ یہاں سب افریقی زبان بولتے ہیں۔کچھ انگلش بھی۔۔۔یہ لوگ بھی پہلے ڈسٹرکٹ 6 میں رہا کرتے تھے۔یہاں رہنے والوں میں وہ بھی تھے جو غلام بنا کر لائے گئے تھے۔دنیا بھر کے مختلف ممالک کے مسلماں ہیں یہاں۔یہ جگہ بے حد خوبصورت پہاڑی پر تھی۔ہر رنگ کے مکانات اس کے ڈھلوان پر بنے ہوئے تھے۔گہرے گلابی، سرخ، ہرے اور پیلے۔انہیں دیکھ کر پروین بے ساختہ اٹلی میں مُرانو اور بُرانو جزیروں کی یاد آ گئی تھی۔قدم قدم پر خوبصورت مساجد تھیں۔وین کو رچرڈ نے یک طرف روک دیا تو سب نکل کر اس خوبصورت علاقے کی تصویریں لینے لگے تھے۔سامنے ایک مسجد تھی۔پروین اندر جانے لگی تو کیتھی اور لیسا نے بھی اندر جانا چاہا تھا۔لیکن جھجک رہی تھیں۔دروازے کے قریب امام کھڑا تھا۔فراز اور وارث نے اسے سلام کیا اور اندر جانے کی خواہش ظاہر کی تھی تو اس امام نے بے حد خوش اخلاقی کا مظاہرہ کیا تھا۔پروین نے اُس سے کیتھی اور لیسا کو بھی اندر جانے کی اجازت لے لی تھی۔اُن دونوں نے بھی اپنے جوتے اتارے تھے۔سر پر اسکارف باندھ لیا تھا اور پروین کے ساتھ اندر گئی تھیں۔یہاں چاروں طرف عجیب روحانی سکون محسوس ہوا تھا۔کیتھی کچھ گھبرائی ہوئی تھی۔لیسا نارمل تھی جس نے چپکے سے پروین کے کانوں میں سرگوشی کی تھی کہ کیتھی بیوقوف ہے۔۔۔اور پروین اداس ہو گئی تھی یہ سوچ کر کہ مذہب کے نام پر انسانوں نے کتنی دیواریں کھڑی کی ہیں کتنی نفرتیں پیدا کی ہیں جو کوئی مذہب نہیں سکھاتا۔۔۔کیتھی کا مسجد میں خوف زدہ ہونا اور اس لیے لیسا کا شرمندہ ہونا۔۔۔ایک المیہ ہی تو ہے اس دنیا کا۔۔۔ساؤتھ افریقہ کے اسی علاقے میں سب سے پہلی مسجد ۱۷۹۴ء میں بنی تھی Signal Hill کے ڈھلوان پر۔

رچرڈ کے مطابق اس علاقے میں انیس مسجدیں ہیں۔امام بھی فخر سے کہہ رہا تھا کہ یہاں دنیا بھر کے مسلمان، مختلف تہذیب اور نسل کے بالکل مل جل کر سکون سے ایک خاندان کی طرح رہتے ہیں۔کوئی تفرقہ نہیں۔وہاں سے دور سامنے پہاڑوں کے سلسلے نظر آ رہے تھے اور نیچے جاتی ہوئی سڑکوں اور گلیوں میں بچے کھیل رہے تھے۔کچھ لوگ اپنے رنگ برنگے گھروں کے دروازوں پر کھڑے ہوئے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔بے حد پرسکون اور دوستانہ فضا تھی۔بچوں کے لیے سیاح کچھ انوکھی چیز ہوتے ہیں۔وہ حیرت سے سیاحوں کو تک رہے تھے اور ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔خوش مزاج امام اس علاقے کی محبت اور بھائی چارگی کے گن گا رہا تھا۔اُس نے بتایا تھا کہ ملائی کوارٹرز سترھویں صدی سے قائم ہے۔ہر رنگ اور نسل کے لوگ یوں مل کر رہتے ہیں کہ ایک رنگ ہو گئے ہیں۔۔۔ ایک مذہب کی ڈوری میں ہر رنگ کے موتی پروئے ہوئے ہیں۔یہ موتیوں کا ہار گونا گوں موتیوں کے مختلف رنگوں کی وجہ سے حسین ہے۔پروین نے تو ہر جگہ صرف ایک ہی رنگ کے موتیوں کا ہار دیکھا تھا۔کتنا خوش نما تھا یہ منفرد ہار اور کتنی خوبصورت تھی یہ دھنک رنگ دنیا۔۔۔!

راس اُمید (Cape of the Good Hope)

دن کے دو بجے سیاحوں کی وین راس امید تک پہنچ گئی تھی۔ساؤتھ افریقہ کا یہ مقام اپنے نام کی طرح حسین اور شاعرانہ ہے جہاں پروین سحر زدہ سی کھڑی ہوئی تھی۔آنکھیں صرف دو عدد اور قدرت کے شاہکار ہزار۔۔۔ہر طرف حسن کا جادو بکھرا ہوا تھا۔نشہ ہی نشہ تھا۔مبہوت کر دینے والا سماں تھا۔نیلے سمندر کی گہرائیوں سے اونچی اٹھتی ہوئی چٹانیں اور ان کے قدموں سے سر کو ٹکراتی ہوئی بے چین لہریں۔۔۔چٹان کی چوٹی پر۔۔۔سمندر سے 268 میٹر اونچا لائٹ ہاؤس ۱۸۶۰ء سے آسمان کی طرف سر اٹھائے شان سے کھڑا ہوا تھا۔اور۔۔۔رچرڈ کہہ رہا تھا۔۔۔''یہ لائٹ ہاؤس بادلوں سے چھپ جاتا ہے اس لیے دوسرا لائٹ ہاؤس ۱۹۱۴ء میں بنایا گیا تھا جو سمندر کی سطح سے صرف ۸۷ میٹر اونچا ہے۔'' چٹانوں کی ہموار سطح پر Seals نے اپنے ٹھکانے بنائے ہوئے ہیں سینکڑوں کی تعداد میں۔

یہ صرف ان کی دنیا ہے۔ وہ اپنی دنیا میں مگن تھے۔ Cape Point زمین کی ایک انگلی کی شکل کا ہے جو وادیوں، چٹانوں اور Beaches کو تھامے ہوئے ہے سمندر کے سینے پر۔۔۔ رچرڈ۔۔۔ ایک دل چسپ واقعہ سنا رہا تھا۔۔۔ ''Dias نامی پرتگال کا ایک شخص ہندوستان جانے کے لیے سمندری راستہ تلاش کر رہا تھا لیکن Cape Point Cliffs سے اس کا جہاز ٹکرا گیا تھا۔ اس سانحے کے بعد اس شخص نے اس کا نام ''طوفان کی چٹان'' (Cape of Storms) رکھ دیا تھا۔ لیکن پھر یہ نام اس قوی اُمید کی بنیاد پر تبدیل کر دیا گیا تھا کہ کبھی نہ کبھی انڈیا جانے کا سمندری راستہ ضرور ملے گا۔ پھر اس کا نام ''اچھی اُمید کی چٹان'' (Cape of the Good Hope) رکھ دیا گیا تھا''۔ افریقی براعظم میں سمندر کی وسعتوں میں کھوئی ہوئی پروین عالم وجد میں دم بخود کھڑی ہوئی تھی۔ چٹانوں اور سمندر کے درمیان۔۔۔ ہر طرف قدرت کا لازوال حسن تھا۔ نیلے پانی پر لہروں کے سفید جھاگ دوڑ رہے تھے شور مچاتے ہوئے۔۔۔ ذراسی دوری پر ہی پرندوں کے جھتے آزادی کے ساتھ اپنی پرسکون دنیا میں مگن تھے۔ بدلتی ہوئی روشنی میں لہروں کے رنگ بھی بدل رہے تھے۔

Cape Agulhas کے قریب وہ حسین مقام ہے جہاں ایٹلانٹک اور انڈین سمندر ایک دوسرے سے مل کر ہم آہنگ ہو جاتے ہیں۔ کتنا رومانی اور شاعرانہ ہے یہ سنگم۔ دور دراز سے فاصلے طے کرتے ہوئے دونوں سمندر کس محبت سے ایک دوسرے میں گھل مل گئے تھے جیسے دو دل۔ انڈین سمندر کا گرم براؤن پانی، ایٹلانٹک سمندر کا سرد نیلا پانی۔۔۔ ایک دوسرے کی بانہوں میں سما گئے تھے۔

سمندری پرندے (Boulder Beach)

وین سیاحوں کو لیے ہوئے پہاڑوں اور سمندر کے درمیان بل کھاتی ہوئی سڑکوں پر دوڑی چلی جا رہی تھی۔ چھوٹے سے خوبصورت شہر Simon's Town سے گزر رہی تھی۔ دور برف کا سیمیں جھلملاتا ہوا تاج سر پر پہنے ہوئے سر بہ فلک پہاڑ ہرے سنجاب کی چادر اوڑھے ہوئے دور تک پھیلی ہوئی زمین اور بے فکری سے گھومتے ہوئے بے پرواہ پرندے۔۔۔ ایسے تھے یہ نظارے جیسے کسی مصور کی پینٹنگ ہو۔۔۔ کچھ دیر میں منزل مقصود آ گئی تھی۔۔۔ خوبصورت Boulder Beach یہاں ہزاروں افریقی Penguines کی بستی تھی۔ سفید اور سیاہ رنگوں کے پنگوئین ہر طرف کہیں آرام کر رہے تھے کہیں ایک دوسرے سے رومانس کر رہے تھے کہیں پانی کے اندر بھوک مٹانے کی تلاش میں جھکے ہوئے تھے۔ رچرڈ کہہ رہا تھا ''۱۹۱۰ء میں ان کی تعداد ڈیڑھ ملین (Million) تھی لیکن اب یہ صرف دس فی صد ہی باقی ہیں۔ یہ ایک گھنٹے میں سات کلومیٹر تیر سکتے ہیں اور دو منٹ پانی کے اندر رہ سکتے ہیں۔ یہ یک زوجی پر عمل کرتے ہیں۔ زندگی بھر ایک دوسرے کے ساتھی رہتے ہیں۔ اپنے انڈوں کو سینے کے لیے دونوں برابر کے حصے دار ہوتے ہیں۔ اپنے بچوں کی رکھوالی بھی دونوں مل کر کرتے ہیں۔'' پروین نے دیکھا دو پنگوئین ایک دوسرے سے محبت کا اظہار کرنے میں ایک دوسرے کو چھیڑ رہے تھے۔ وہ قدرت کے اس انمول عطیے کے متعلق سوچ رہی تھی جس کا نام محبت ہے۔ جو حیوانوں میں بھی وہی شدت رکھتی ہے جس کا ثبوت سامنے تھا۔ پاک اور اٹوٹ جذبہ۔ لیکن جس کا پا لینا انسانوں میں اتنا ہی دشوار۔۔۔ یہ اتنا قیمتی ہے کہ ہر کسی کو نصیب نہیں ہوتا۔ ہزاروں پنگوئین کتنی آزادی اور اطمینان سے اپنی محفوظ قدرتی دنیا میں زندگی کو جی رہے تھے۔ یہ سمندری پرندے اپنے نیلم سے سمندر کے ساحل پر کس قدر پرسکون اور خوش تھے۔۔۔!

پس اندیشی

خیالوں نے بیتے لمحوں کی دہلیز پر سر رکھ دیا ہے۔ گڈمڈ خاکے اجاگر ہو رہے ہیں۔ افق کے خیابانوں میں سرخ گلاب کھلتے جا رہے ہیں۔ زمین کے سینے سے لگے ہوئے زرد رو پتے نڈھال پڑے ہوئے ہیں۔ کچھ درختوں پر اب بھی کہیں کہیں سبز پتے شاخوں کو تھامے ہوئے جھول رہے ہیں۔ پروین اپنے بیک یارڈ میں بیٹھی ہوئی ان خالی دامن درختوں کی طرف دیکھ رہی ہے۔ شام کے دھندلکے میں دوڑتے، بھٹکتے، پیلے پتے آ کر اس کے قدموں سے لپٹ گئے ہیں۔ ہوا کے ستائے ہوئے ان ٹوٹے ہوئے پتوں کی کراہیں سن رہی ہے وہ۔ اس کے اندر بھی خشک، کھڑکھڑاتے ہوئے پتوں کا ڈھیر ہے۔ کچھ سبز پتوں کے نغمے بھی ہیں۔ وہ پتے اندر ہی بھٹک رہے ہیں۔ اندر ہی قید ہیں۔

پچھلے دنوں وہ باہر اور اندر، دونوں دنیاؤں کا سفر کرتی رہی۔ دوران سفر تلووں کو کانٹوں کی چبھن بھی ملی اور پنکھڑیوں کی نرمی بھی۔ آگہی کے سمندروں نے اسے سکون و اضطراب دونوں طرح کی سیپیاں فراہم کی ہیں۔ کائناتی درد کی بڑی بڑی مچھلیوں نے ذاتی دکھوں کی چھوٹی چھوٹی مچھلیوں کو نگل لیا ہے۔

سویٹو کی اُس خود دار، مفلوک الحال حالات سے باغی لڑکی کی آنکھیں اُسے مستقل گھور رہی ہیں۔ اس کا ٹوٹا پھوٹا خستہ گھر، جسے ایک عجائب خانے کی طرح سیاحوں کی تفریح کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ سویٹو کے معصوم بچے کی خوبصورت خواب دیکھنے والی۔۔۔ چمک دار آنکھیں اسے تک رہی ہیں۔۔۔ پوچھ رہی ہیں۔۔۔ کیا اس کے خواب پایۂ تکمیل تک پہنچ پائیں گے؟ ان دکھوں کے سامنے پروین کے اپنے دکھ فنا ہو رہے ہیں۔ بصیرت کے سمندر میں غرق ہو رہے ہیں۔

ساؤتھ افریقہ میں اپارٹ ہائیڈ کا سانپ مر گیا لیکن۔۔۔ روپ بدل کر آج بھی ہر جگہ زندہ ہے۔ اس زمین پر آج بھی اس کی سرسراہٹ سنائی دے رہی ہے۔ اپارٹ ہائیڈ ختم ہو گیا لیکن پھر بھی ختم نہیں ہوا۔ نسل اور رنگ کی نفرت اور تفرقے آج بھی برقرار ہیں۔ ان کی بنیاد پر آج بھی غارت گری جاری ہے۔ زندگی ایسی الجھی ہوئی ڈور ہے جو کبھی سلجھتی نہیں ہے۔ سرا ملتا ہی نہیں ہے۔ یہ تو کہانیوں کا ایک جنگل ہے جہاں راستہ نہیں ملتا۔ کچھ لوگ آدھی زندگی خواب

دیکھنے میں گزارتے ہیں اور باقی انہیں خوابوں کو بکھرتا ہوا دیکھنے میں۔ سوئیٹو کی گلی کا وہ بچہ جس نے خواب دیکھنا شروع کر دیا ہے۔۔۔ جسے وہ اپنی نصف عمر تک دیکھتا رہے گا۔۔۔ ایک خواب کئی خوابوں کو جنم دے گا۔ کون جانے بقیہ عمر انہیں بکھرتا ہوا دیکھے گا یا ان کی تعبیروں کا محل پالے گا؟ ڈسٹرکٹ 6، (کیپ ٹاؤن) کے نور ابراہیم نے بھی اپنی زندگی کا پہلا حصہ خوابوں میں گزارا تھا اور پھر۔۔۔ انہیں بکھرتا ہوا دیکھا۔ کچھ زندگیوں کے دو منظر نامے ہوتے ہیں۔ پہلے منظر میں اُمیدوں کی ہنسی، خواہشات کی چہل پہل، خوابوں کی گہما گہمی، تمناؤں کے نغمے، آرزوؤں کی ہریالیاں اور ارادوں کے پھولوں سے بھرے ہوئے دور تک جاتے ہوئے معطر راستے اپنی بانہوں میں سمیٹے رہتے ہیں۔ دوسرے اور آخری منظر میں۔۔۔ سکوت، تنہائیاں، سناٹے، پچھتاوے، اُداسیاں، محرومیاں، ہار جانے کے احساسات، بند راستے، دروازوں پر تالے۔۔۔ اور بس!

ان خیالات میں کھوئی ہوئی وہ غلطاں و پیچاں بیٹھی ہے۔ سوچ کے جوار بھاٹے پر بل کھاتی ہوئی نظم کی کشتی قرطاس کے ساحل تک آ پہنچی ہے۔

گونجتی خاموشیاں

سسکیاں لیتی ہوئی تنہائیاں
شیشوں کی بکھری کرچیاں
گرتی ہوئی دیوار کی آنکھوں میں ہیں بے چینیاں
اک ایک ملبے پر ہیں رقصاں
ڈوبتی آواز کی پرچھائیاں
اس اوندھے منہ ایوان کے ٹکڑوں پہ بیٹھا
اک کبوتر
سہما سہما، دائیں اور بائیں طرف تکتا ہوا یوں
سن رہا ہے گونجتی خاموشیاں
درد میں ڈوبی ہوئی نظروں سے جیسے
ڈھونڈتا ہو ساعت رفتہ کی سب خوش حالیاں۔۔۔!

سمندروں سے چن کر لائی ہوئی چند سیپیوں سے سفید اور سیاہ دونوں موتی برآمد ہوئے ہیں۔ ملکوں ملکوں جا کر پروین نے غم کا گاڑھا دھواں بھی دیکھا ہے اور خوشی کا دودھیا اُجالا بھی۔ قدرت کے حسین نظاروں نے سکون کی نرم تھپکیاں بھی دی ہیں۔ آسماں سے ہم کلام کوہسار، گنگناتے ہوئے آبشار، خوبصورت پرندے اور سمندر کی بل کھاتی ہوئی لہروں نے روحانی خوشی بھی عطا کی ہے۔ توانائی کے ہونٹوں پر سفاک تبسم بھی دیکھا ہے۔ اور ناتوانی کے لرزتے ہونٹوں پر کراہیں بھی۔ غیر متوازن جہان کے جسم پر تشدد کے چابک بھی اور متوازن جہان کی آنکھوں میں آسودگی اور سکون کی دمک بھی۔ کچھ درد کی چنگاریاں بھی سیال کی صورت آنکھوں سے چھلکنے کو بے قرار ہیں اور کچھ دل ربا نغموں کی پنکھڑیاں بھی ساعت کے آنگن کو رنگین اور معطر کر رہی ہیں۔ آگہی کے ہاتھوں میں سینکڑوں سورج ضوفشاں ہیں۔ بصیرت کی آنکھوں میں ہزاروں ستاروں کی جھل مل۔۔۔! خشک اور سبز پتوں کو چھیڑتی ہوئی ہوا کی انگلیاں کتنے موز ارٹ (Mozart) اور بیتھوون (Beethoven) کے پرسوز اور دلکش نغمے سنا رہی ہیں۔ بصیرت کی سیڑھیاں کہیں کسی نئے آسمان کی طرف لے جا رہی ہیں۔ معصوم جذبوں کے سیلاب کی بپھرتی ہوئی لہریں سچ کے سنگلاخ پتھروں پر سر پٹک کر سوالات کے حباب پیدا کر رہی ہیں جو منطق کی تپتی ہوئی ریت پر آ کر ٹوٹ رہے ہیں۔۔۔!

آئی مِس یو

(I MISS YOU)

یوگیندر بہل تشنہ

(دہلی، بھارت)

سرسر طور سے کہہ دیتے ہیں لوگ
''آئی مِس یُو''
میرے تو فہم میں نہ تھا ایسا!
کہ آئی مِس یُو کیا ہے بلا؟
وہ کہ بلا ناغہ کئے
آپ کے لیے ایک نظم لکھنا میرا
آپ سے آپ کے دل کی حقیقت کہنا میرا
جس نے آپ سے اسقدر قربت کا احساس دیا ہے مجھکو
اور یوں زندگی کا اِک لمحہ
تر و تازہ ہوتا رہا نا دانستہ
ایسے ماحول میں جہاں بستا ہو کوئی اپنا بھی
خیر خبر؟
''آئی مِس یو ویری مچ''
سچ مچ۔۔۔!!!

○

''ساقی کی شکایت''

کرامت بخاری

(لاہور)

حادثے حق کی حمایت نہیں کرنے دیتے — گویا کچھ لوگ عبادت نہیں کرنے دیتے
کیا قیامت ہے کہ اب تو مری سرکار کے لوگ — مجھ کو نفرت سے بھی نفرت نہیں کرنے دیتے
تشنگی حد سے بڑھی جاتی ہے اہل دِل کی — پھر بھی ساقی کی شکایت نہیں کرنے دیتے
یوں تو ہر بات کی ہوتی ہے اجازت مجھ کو — بس روایت سے بغاوت نہیں کرنے دیتے
دُور سے دیکھتی رہتی ہے وہ دُزدیدہ نظر — مجھ کو حالات زیارت نہیں کرنے دیتے
ترکِ مے تو بہت آسان ہے لیکن مجھ کو — اہل دل ایسی جسارت نہیں کرنے دیتے
باکرامت ہیں یہ تخلیق کے لمحے لیکن — مجھ کو مجھ سے بھی رعایت نہیں کرنے دیتے

○

پرویز مظفر

(برمنگھم)

یہ جو ہاہا کار کیا ہے — تم نے سب بیکار کیا ہے
کون سنے گا چیخ تمہاری — برسوں اتیاچار کیا ہے
سات سمندر پار آ کر بھی — ہم نے وطن کو پیار کیا ہے
مٹی سے کٹ کر بھی ہم نے — مٹی ہی کو پیار کیا ہے
نالہ کیا رو کے گا اس کو — جس نے دریا پار کیا ہے

○

شگفتہ نازلی

(لاہور)

وہی کھویا سا منظر کھوجنے دے — اُسی رگرد ونواح کو ڈھونڈنے دے
بہت دیکھے ہیں تیرے شعبدے تو — مگر اپنی نگاہ سے جانچنے دے
جو رعنائی بصیرت کی عطا ہو — تو پھر سے زندگی کو دیکھنے دے
توقع ہے عبث اب تک کوئی بھی — اُسے سانچے میں پہلے ڈھالنے دے
بہت تلخی بڑھی جاتی ہے اب تو — ذرا سی دیر موضوع ٹالنے دے
بعجلت فیصلہ کوئی نہ مانگے — مجھے مہلت ملے کچھ سوچنے دے!

○

نیاز جیراجپوری

(بھارت)

فلک سے بُوند گری ریت کی ہتھیلی پر
نُمو کی آس جگی ریت کی ہتھیلی پر

نجومی پیش گوئی کیسے کرتا سبزہ کی
لکیر کوئی نہ تھی ریت کی ہتھیلی پر

چُھپا ہے اِنتظار اسکو نہ جانے کِس گُل کا
تڑپتی تِتلی مِلی ریت کی ہتھیلی پر

اے موجِ دریا کبھی آکے پڑھ لے اِسکو بھی
ہے پیاس میری لکھی ریت کی ہتھیلی پر

گھٹائیں محوِ تجسّس ہیں حیراں ہے سُورج
کہ گھاس کیسے اُگی ریت کی ہتھیلی پر

بھگوئے گا کبھی تو ابرِ نیساں اِسکو بھی
رچے گی منہدی کبھی ریت کی ہتھیلی پر

نیاز اِس سے مِلے گا سُراغ پانی کا
جو سُوکھی کائی مِلی ریت کی ہتھیلی پر

○

عارف شفیق

(کراچی)

کبھی جو وقت مرا صبر آزمائے گا
تو میری پیاس سے دریا بھی ہار جائے گا

وہ اک چراغ جو روشن ہے میرے سینے میں
اندھیری راہوں میں وہ راستہ دکھائے گا

کسی کی یاد کے جگنو اداس کر دیں گے
ہر ایک شام وہ جب بھی دیا جلائے گا

اٹھائے کاندھوں پہ نکلے گا تجھ کو ایک ہجوم
فنا کی حد سے تُو آگے اکیلا جائے گا

یہ بے زبان پرندے دعائیں دیں گے اُسے
جو گھر کے صحن میں اپنے شجر لگائے گا

امیرِ شہر میری مفلسی کی تصویریں
محل سرا میں عجب شان سے سجائے گا

عجب مزاج ہے اس پتھروں کے شہر کا بھی
ملے گا جو بھی یہاں آئینہ دکھائے گا

یہاں غرور سے سب سر اٹھائے پھرتے ہیں
ہے ایسا کون جو سجدے میں سر کٹائے گا

چراغ بجھ گیا عارف جو میرے حجرے کا
تمام شہر اندھیرے میں ڈوب جائے گا

○

نوید سروش

(میرپورخاص)

گواہی ہے یہ جلتے پیڑ اور پیاسے پرندے کی
کہ اب کوشش نہ کی جائے زمیں پر جا کے بسنے کی

تلاشِ آدمی ہے اور وہ بھی اپنے جیسے کی
نہیں ہے جستجو مجھ کو کسی صورت فرشتے کی

بہت سے خواب کی تعبیر کو ایسے ترستے ہیں
کہ ہو آنکھوں کی خواہش جیسے دن اور رات اندھے کی

خوشی لمحوں کی ہوتی ہے گذر جاتی ہے لمحوں میں
جڑیں ہوتی ہیں گہری تو فقط ہوتی ہیں صدمے کی

خدا کا شکر ہے ہم ایک چھت کے نیچے رہتے ہیں
محبت ہے کرامت ہے یہی تو ماں کے رشتے کی

○

سیفی سرونجی

(سرونج، بھارت)

انوکھا روپ ہے سندر تری جوانی ہے — تری مثال نہ تیرا جہاں میں ثانی ہے
ملا نہ کوئی مرد درد بانٹنے والا — زمانے بھر کی گرخاک میں نے چھانی ہے
فنِ عروض کا ماہر نہیں مگر پھر بھی — غزل میں حسن ہے ہر شعر میں روانی ہے
اصول سارے محبت میں توڑ کر میں نے — تمہارا حکم تمہاری ہی بات مانی ہے
نہ ہم سفر ہے نہ دنیا میں رازداں کوئی — تمام عمر اکیلے مجھے بتانی ہے
نہ اس میں لطف نہ اس میں کوئی نیا پن ہے — بڑی عجیب مری دکھ بھری کہانی ہے

○

عارف منصور

(لاہور)

یوں تسلسل سے تری مجھ پہ نوازش کیوں ہے — مجھ پہ کچھ اور ستم ہوں تری خواہش کیوں ہے
لب ہیں یوں بند درِ قصرِ خموشی جیسے — ادھ کھلی آنکھوں میں ٹھہری ہوئی بارش کیوں ہے
کیوں ہیں دیواروں پہ اس درجہ لہو کے چھینٹے — کوچۂ دل میں بپا آج یہ شورش کیوں ہے
کیا سبھی لوگ ہیں بھٹکے ہوئے صحراؤں میں — سب کے ہونٹوں پہ بھڑکتی ہوئی آتش کیوں ہے
جس سے ٹکرا کے مرے جذبے زمیں بوس ہوئے — خود مری راہ کا پتھر مری دانش کیوں ہے
کہیں دم لینے کو ٹھہروں تو کسی سے پوچھوں — میرے ہی قدموں سے لپٹی ہوئی گردش کیوں ہے
جھوٹ کے دور میں منصورؔ سی فطرت لے کر — دار کا ساتھ نبھاؤں مری کوشش کیوں ہے

○

وشال کھُلر

(لدھیانہ، بھارت)

وہ اگر صاحبِ کردار نہیں ہو سکتا — غم کے ماروں سے بھی اظہار نہیں ہو سکتا
اس کی نسبت سے یہ اقرار کہاں واجب ہے — خوب ہوتا ہے یہ ہر بار نہیں ہو سکتا
جوڑ رکھتا ہے کہیں ذیل میں فرداً فرداً — اِتنا ٹوٹا ہے کہ مسمار نہیں ہو سکتا
اب ارادوں پہ بھی زنجیر پڑے گی کوئی؟ — اب وہ ہو گا جو سرِ دار نہیں ہو سکتا
کن مراحل سے گذرتے ہیں ترے دیوانے — اس کا خوشبو سے بھی اظہار نہیں ہو سکتا
ایک اس کو ہی سنانے کے ہیں قصّے سارے — وہ جو تشویش کا کردار نہیں ہو سکتا
ہو گی غالبؔ سے زمیں، میرؔ سے ملّت ہو گی — ورنہ یوں شعر طرحدار نہیں ہو سکتا

○

تصورا قبال
(اٹک)

ہزار حیلے بہانے کرنا کبھی سُنی ان سنی نہ کرنا
ستم بھی کرنا جفا بھی کرنا ملن میں کبھی کمی نہ کرنا

ملے جوفرصت غمِ جہاں سے تو اپنی جانب بھی دیکھ لینا
خزاں کا موسم ہے چار جانب خزاں سے تُو دوستی نہ کرنا

یہ فرقتوں کے عذاب موسم یہ بے قراری یہ اشک باری
ملے ہیں جن سے دیے ہیں جس نے قبول کرنا کمی نہ کرنا

جو وقتِ رخصت نگاہِ الفت ہماری جانب اُٹھے تو سُن لو
ہمارے جینے کی اپنے رب سے دعا تصورؔ کبھی نہ کرنا

ہماری تُربت پہ تم جو آنا ضرور آنسو بہا کے جانا
نہ اشک آئیں تو لوٹ جانا ہماری خاطر خوشی نہ کرنا

تری غزل میں اگر نیا پن تصورؔ اقبال آ گیا تو
قسم ہے تُم کو اسی غزل کی گھسی پٹی شاعری نہ کرنا

○

اصغر شمیم
(کولکتہ، بھارت)

مدعا کار گر نہیں ہوتا
گر دعا میں اثر نہں ہوتا

میں خلا میں کبھی نہیں اڑتا
کاش میرا یہ پر نہیں ہوتا

کتنی مشکل سے میں کماتا ہوں
اینٹ کا گھر مگر نہیں ہوتا

کون سے راستے میں آ نکلا
ختم میرا سفر نہیں ہوتا

وہ مجھے طیش میں تو لاتا ہے
میں بھی زیر و زبر نہیں ہوتا

جس کے دل میں ہے حوصلہ اصغرؔ
اس کے دل میں تو ڈر نہیں ہوتا

○

ابراہیم عدیل
(جھنگ)

پھر اس کے بعد آگ پہ ڈالا نہ جا سکا
دریا کو دشتِ غم سے نکالا نہ جا سکا

اس کی نظر میں دشمنِ مہر و وفا رہا
اس تک مری وفا کا حوالہ نہ جا سکا

تتلی کسی خیال کی اڑتی بھی کس طرح
ذہنوں سے ایک وہم کا جالا نہ جا سکا

ٹھہرا میں آسمان کے سینے سے دور ہی
نازک بدن سے اتنا اچھالا نہ جا سکا

کیا فائدہ ہوا ہے سہارا بھی مانگ کر
دستار کو تو سر پہ سنبھالا نہ جا سکا

ہم تھے کہ تیرے غم کے پجاری سدا رہے
ہر شخص سے یہ سانپ تو پالا نہ جا سکا

شعلوں پہ اپنے لب مجھے رکھنا پڑے عدیلؔ
ایسا وہ ایک سوال تھا ٹالا نہ جا سکا

○

''اسمِ فاطمہ''

عذرااصغر
(کراچی)

مجھے یادنہیں کہ الطاف آپا سے میری بالمشافہ ملاقات کب کہاں اور کیسے ہوئی۔اپنی پروازِ خیال کومہمیز لگاتی ہوں تو لگتا ہے کہ میں انہیں برس ہا برس سے جانتی ہوں۔سداسے وہ میرے اور میں ان کے ساتھ ہوں۔اصل میں بعض افراد کی شخصیت انسان کوحصار کرلیتی ہے۔ہم پہلے اس کے کسی ایک پہلو سے متاثر ہوتے ہیں اور پھر ذات کے اسرار کھلتے چلے جاتے ہیں اور حصار کا دائرہ مضبوط تر ہوتا جاتا ہے۔

سب سے پہلے میں شاید ان کے نام کے صوتی اثرات سے متاثر ہوئی ہونگی۔الطاف ۔۔۔ جو لطف کی جمع ہے۔مہربان،شفیق اور ایسی ہی ہیں۔فاطمہ میری روح کو جھنجھوڑ دینے والا اسم ہے۔اسمِ فاطمہ،الطاف کے ساتھ ملاتو دو آتشہ ہوگیا۔مجھے جہاں اس نام کی تحریر،تخلیق نظر آئی میں پڑھتی رہی۔پھر شاید ان دنوں جب ماہنامہ ''تخلیق'' سے منسلک تھی ان سے افسانہ حاصل کرنے ان کے دولت کدے پر گئی۔میں،اصغر مہدی اور اظہر جاوید۔یہ ادب کا وہ دور تھا جب ایڈیٹر حضرات تخلیق کاروں سے ان کی نگارشات خط لکھ کر یا بالمشافہ مل کر حاصل کیا کرتے تھے۔

لارنس روڈ پر ایک بہت بڑے بوسیدہ اور کہنہ سے احاطے میں وہ گھر تھا جہاں مشہور پان والا مولا بخش سے ذرا سا آگے جا کر۔گویا اس سڑک پر دو مشہور شخصیات رہتی تھیں۔مولا بخش اور الطاف فاطمہ۔لیکن المیہ یہ ہے کہ مولا بخش کو پورا لاہور کیا لاہور سے باہر بھی جانا جاتا ہے۔جبکہ الطاف فاطمہ سے وہاں آس پاس بھی کوئی واقف نہ تھا۔مغرب ہوچکی تھی اور اندھیرا زمین پر اُتر آیا تھا۔ہم بغیر دروازے کے ایک چوڑے سے گیٹ میں داخل ہوئے جس کے ستونوں کی اینٹیں بھر بھرا کر جھڑ رہی تھیں۔رستہ کچا اور گلی نما تھا۔احاطے میں کہیں کہیں کھڑے کھجور کے اونچے پیڑ ماحول کو پراسرار بنا رہے تھے۔نوکر پیشہ کوارٹرز میں کھرّے پلنگوں پر بچے اور مرد لیٹے یا بیٹھے تھے۔عورتیں پکانے ریندھنے میں مشغول تھیں۔چولہوں سے اٹھتا دھواں یہی بتاتا تھا۔گندی نالیوں کوعبور کرتے ہم ایک نسبتاً چھوٹے پھاٹک پر جا کر ٹھہر گئے۔دستک پر ایک صاحب برآمد ہوئے ڈھیلا سا سفید پاجامہ،اونچی قمیض،درمیانی عمر،شکل پر شرافت ونجابت کے آثار۔بعد میں معلوم ہوا کہ یہ ان کے بڑے بہنوئی تھے۔نام اور کام پوچھا اور اندر چلے گئے۔لحہ بھر بعد واپس آئے اور اپنے ساتھ آنے کا اشارہ فرمایا ہم تینوں آگے پیچھے پھاٹک کے اندر داخل ہوئے۔ہمارے سامنے پھر ایک وسیع آنگن تھا۔کچھ کچا اور کچھ پکا۔کچھ حصّے میں پھولوں کی کیاریاں تھیں اور کیاریوں میں کھلے موتیا اور رات کی رانی کی مہک تھی۔اینٹوں سے بنے پکے فرش پر پلنگ بچھے تھے جن پر سفید چادروں والے بستر تھے۔ذرا ساہٹ کر ایک میز کے گرد کرسیاں بچھی تھیں۔بڑا روایتی سا ماحول تھا۔میرے بچپن نے جھپٹ کر میری انگلی پکڑ لی۔کون کہتا ہے گزرا وقت ماضی بن جاتا ہے۔پلٹ کر نہیں آتا؟ میرا ماضی تو ہمیشہ میرے ساتھ ساتھ چلتا آتا ہے وہ الہ دین کے چراغ والا جن ہے۔ہر لحہ ساتھ،ہر آن سایہ فگن۔

''تم بہت دنوں بہت آئے ہو۔''الطاف آپا اظہر جاوید سے کہہ رہی تھیں۔

''فرصت نہیں ملتی آپا۔دل تو بہت چاہتا ہے۔''اظہر نے معذرت آمیزی سے کہا۔

''ارے بھائی جھوٹ مت بولو۔دل چاہتا تو آتے نا۔آج بھی تو آ ہی گئے ہو۔''الطاف آپ کا مسکراتا ہوا مخصوص لہجہ تھا۔

''آج تو عذرا لائی ہیں۔یہ عذرا اصغر ہیں اور اصغر مہدی۔ان کے میاں۔''اظہر صاحب نے تعارف کرایا۔

الطاف آپا نے پُرشفقت نگاہوں سے مجھے دیکھا اور اپنے اسی انداز میں میرے لیے فی البدیہ قصیدہ کہہ ڈالا۔جسے سن کر میں شرمسار ہوتی رہی۔پہلی ہی رسمی سی ملاقات غیر رسمی ثابت ہوئی۔الطاف آپا کے رویے میں شفقت اور اپنائیت کے ساتھ ساتھ بے تکلفی تھی۔ان کی یہ محبت اور شفقت آج تک قائم ہے۔بلکہ میں تو یہ کہوں گی کہ وہ مجسم مہر ومحبت ہیں۔

الطاف آپا کا بے خانماں خاندان لکھنؤ سے اجڑ کر آیا اور لاہور میں آباد ہوگیا۔وہ ایک نہایت پڑھے لکھے اور نستعلیق خانوادے سے تعلق رکھتی ہیں مگر کبھی اپنی بڑائی نہیں جتاتیں۔ان کے گھرانے میں کئی نامور ادیب گزرے ہیں۔اختر حسین رائے پوری بھی ان کے قریبی ہیں بعدازاں الطاف آپا نے اپنی رہائش کے لیے حبیب اللہ روڈ پر ایک کاٹج نما گھر بنایا ہے۔یہ گھر ''کنج گلی'' کے نام سے موسوم ہے۔ایک کشادہ گلی میں داخل ہوں تو تیسرا یا چوتھا گھر کنج گلی ہے۔جس کے مختصر سے پھاٹک پر پھولوں کی بیلیں چڑھی ہیں۔پورچ کے بائیں طرح تھوڑی سی جگہ پر پھول اُگائے گئے ہیں۔پورچ عبور کرتے ہی بائیں جانب قدرے کھلا سالاؤنج ہے اس کے ساتھ ہی نشست کا کمرہ۔سامنے ہی دیوار کے ساتھ ایک چھوٹا ساتخت بچھا ہے۔برابر میں چھوٹا صوفہ دھرا ہے اور تخت پر ایک دو کتابیں ہمہ وقت نظر آتی ہیں۔تخت پر دیوار کے ساتھ گاؤ تکیے لگے ہیں۔سامنے کی طرف پیٹیو (Patio) ہے۔جسے جالی سے ڈھانپ دیا گیا ہے کہ نشست کا کمرہ اور باقی گھر مکھی مچھروں کی یلغار سے محفوظ رہے۔پیٹیو (Patio) میں قسم قسم کے پھولوں کے پودے ہیں۔الطاف آپا کو روائتی اور خوشبو دار پودے اور بیلیں پسند ہیں۔

نشست کے کمرے کے بائیں ہاتھ پڑھنے کا چھوٹا سا کمرہ ہے۔ کتابوں کی الماریاں ہیں، ریکس ہیں، میز اور کرسی ہے۔ اس کمرے کی کھڑکیاں پورچ کے ساتھ والے پیٹیو (Patio) میں کھلتی ہیں۔ جہاں سے پھول اپنی بہار کی دلکشی دکھاتے اور خوشبو لٹاتے ہیں۔ نشست کے کمرے کے دائیں جانب پیٹیو کی سمت کچن ہے اور برابر میں سونے کا کمرہ ہے۔ کمرے سے اُدھر انگنائی میں پیڑ کھڑے ہیں اور وہی روایتی پھولوں کے پودے۔ اس گھر میں الطاف آپا اکیلی ہونے کے باوجود اکیلی نہیں رہتیں۔ ایک چھوٹا موٹا نوکر جس کو پڑھایا بھی جا رہا ہوتا ہے اور ایک دو شاگرد ہمیشہ رہتے ہیں۔ شاگردوں میں ان کے بھائی بھتیجوں اور بھانجے بھانجیوں کی اولادیں ہوتی ہیں۔ دوست احباب کے وہ بچے جو پڑھنے کے شوقین ہوتے ہیں اکثر ان کے پاس قیام پذیر رہتے ہیں۔ اور اسم با مسمیٰ الطاف آپا ان کے سب کے درمیان گھری بے حد مصروف رہتی ہیں۔

اسلامیہ کالج برائے خواتین سے سبکدوشی کے بعد انہوں نے اپوا کے ایک ادارے میں جاب کر لیا۔ ایک دفعہ مجھے ان سے ملنے کالج جانا پڑا۔ ان سے کچھ لینا تھا یا کوئی کتاب دینا تھی۔ میں اسلام آباد سے لاہور گئی تھی اور بہت تھوڑے وقت کی وجہ سے گھر نہیں جا سکتی تھی۔ انارکلی یا کہیں سے واپس آتے ہوئے سوچا کالج میں ہی ملتی چلوں۔ مجھے حیرت ہوئی کہ یہ جان کر کہ کالج کا ایک فرد بھی تخلیق کار، معروف ناول نگار، افسانہ نویس الطاف فاطمہ سے واقف نہیں تھا۔ میں اس حوالے سے ان کا پتہ پوچھتی پھری۔

میرے تعجب آمیز گلے پر حسبِ معمول ہنس دیں۔ کہنے لگیں۔

''تو کیا میں انہیں بتاتی پھروں کہ میں افسانہ نگار ہوں اور ہوں تو انہیں کیا۔ کیا کمال کیا ہے بھئی ہم نے۔ ارے بی بی لوگ تو بڑے ظالم ہیں۔ خود ہماری برادری والے ہمیں نظر انداز کرتے ہیں۔ اب دیکھو پچھلے دنوں بھارت سے نارنگ پاکستان آئے۔ لاہور میں وہ سب سے ہمارا پوچھتے پھرے۔ جانے کس نے کہہ دیا کہ الطاف فاطمہ تو معذور ہو چکی ہیں۔ کسی سے ملتی نہیں ہیں۔''

ایسے واقعات اکثر و بیشتر ان کے ساتھ پیش آتے رہتے ہیں۔ ناقدین نے بھی ان کے ساتھ ان کی شایانِ شان سلوک نہیں کیا۔ اس کی بنیادی وجہ صرف اور صرف ان کی سادہ مزاجی اور انکسار ہے۔ وہ پرانی اقدار کی امین اور روایت پسند خاتون ہیں۔ ان کی طرزِ زندگی پر بھی ان کے خاندانی روایات کی چھاپ ہے۔ کسی کا دل نہ دکھانا ان کے نزدیک کفر ہے تو تکبّر بہت بڑا گناہ۔ منکسر المزاجی ان کو وراثت میں ملی ہے۔ وہ خوش خو، بااخلاق، باکردار، بامروّت، خوش طبع، شائستہ اطوار اور بے حد مہذب خاتون ہیں۔ اسم با مسمیٰ۔ وضعدار اتنی کہ ایک مرتبہ حسبِ معمول میں انہیں ملنے گئی۔ واپس آنے لگی تو دروازے پر سبزی فروش انہیں روزمرّہ کی سبزی دینے کے لیے کھڑا تھا۔ آپا نے اس سے کھیرے، گاجریں اور مولیاں لیں اور لفافہ مجھے پکڑا دیا۔ میں نے کہا۔

''آپا میں تو خود شبہ کے گھر ٹھہری ہوں ان کا کیا کرونگی؟'' بصد اصرار بولیں۔

''شبہ کا گھر تو ہے نا۔ کیا یہ گھر کسی غیر کا ہے؟''

غالباً نذیر ناجی کے دور میں اکادمی ادبیاتِ پاکستان نے ''معمارِ ادب'' پر کتابیں شائع کرنے کا پروگرام بنایا۔ لکھنے والوں میں میرا نام بھی شامل ہوا۔ میں نے الطاف فاطمہ صاحبہ پر لکھنے کی خواہش کی۔ اس کے لیے مجھے موصوفہ سے باضابطہ طور پر اجازت لینا تھی۔ میں اسلام آباد سے لاہور گئی اور کتاب کے لیے اجازت چاہی۔ بولیں۔

''بھئی یہ کام زندگی میں زیب نہیں دیتے۔ جب ہم نہیں ہونگے تب کتاب لکھ لینا۔ ابھی اس کے لئے وقت مناسب نہیں ہے۔''

میں نے کہا ''آپا تب آپ کو کیا فائدہ ہوگا؟'' انہوں نے دلیل دی۔

''اور اب کیا فائدہ ہوگا؟''

''آپ کے کام کا احاطہ کیا جائے گا تو آپ کو خوشی نہیں ہوگی؟ آپ خود اسے دیکھیں گی۔ لوگ تو پیسے خرچ کر کے اپنے فن و شخصیت پر لکھواتے ہیں اور آپ۔۔۔؟''

مگر میری ہر منّت سماجت، دلیل اور جواز رائیگاں رہا۔ وہ کسی صورت رضامند نہیں ہوئیں۔ انہوں نے جس طرح اپنے گرد ایک چھوٹا سا لکھنؤ آباد کر رکھا ہے اسی طرح قدیم روایتوں کو بھی سینے سے چمٹا رکھا ہے۔ وہ اقدار، روایات اور وضعداریاں جو عہدِ موجود میں ناپید ہو چکی ہیں۔ محترمہ الطاف فاطمہ ان کی امین ہیں اور نادر نمونہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں صحت و زندگی دے۔ اگلے وقتوں کے یہ لوگ نسلِ موجود کے لیے باعثِ برکت و افتخار ہیں۔

''اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ......انہیں کچھ نہ کہو۔''

دعا

ہاتھ اٹھا کر کبھی، ہاتھ اٹھائے بنا
کبھی آواز میں، اور کبھی بے صدا
لب ہلائے بنا
روز و شب اے وطن
میں خدا سے دعا
مانگتا ہوں
سلامت رہے تو سدا

عبداللہ جاوید
(کینیڈا)

پانچواں موسم

یعقوب نظامی (برطانیہ)

صائمہ کامران......حال ہی میں برطانیہ تشریف لائیں تو اپنا تازہ مجموعہ کلام...... پانچواں موسم...... مجھے عنایت کیا......نام دیکھ کر میں چونکا...... چونکہ بچپن سے میں چار موسموں......سے واقف تھا......اور جب سے برطانیہ میں آباد ہوا تب سے صرف ایک ہی موسم سرما......دیکھ رہا ہوں......لیکن صائمہ کامران کے ہاں ایک دو اور چار کی بجائے پانچ موسم ہیں ...... یہ جان کر مجھے تجسس ہوا کہ...... بھلا یہ پانچواں موسم...... کہاں سے آ گیا۔ یہی سوچتے ہوئے کتاب کی ورق گردانی شروع کی تو ایک جگہ رک گیا...... جہاں میرے سوال کا جواب کچھ اس طرح موجود تھا:

چار موسم کا تسلسل تو بہت دیکھا ہے
میرے سرکار مرا پانچواں موسم ہو تم

یوں پانچواں موسم کا عقدہ کھلا کہ......میرے سرکار......یعنی ڈاکٹر کامران......صائمہ کے پانچواں موسم ہیں۔ مجھے تو ڈاکٹر کامران پانچواں موسم کی بجائے......سدا بہار موسم معلوم ہوتے ہیں......لیکن یہاں بات ہے بیگم کی اور وہ بھی شاعرہ......جن کا مستند ہے فرمایا ہوا......اس لئے ہم بیگم کامران سے اتفاق کرتے ہیں......لیکن یہ بات مزید تحقیق طلب ہے کہ صائمہ کے ہاتھ یہ پانچواں موسم کیسے آیا۔ ممکن ہے اس میں انسانی فطرت میں موجود پیار و محبت کا عنصر غالب ہو۔ مجھے اپنے اس نظریہ میں اس وقت حقیقت نظر آتی ہے جب صائمہ......ڈاکٹر کامران کو سامنے بیٹھا کر شعر سناتی ہیں تو ڈاکٹر صاحب کے انگ انگ سے محبت کے شرارے یوں پھوٹتے ہیں جیسے دونوں ابھی تازہ تازہ دام محبت میں گرفتار ہوئے ہیں۔ صائمہ پیار و محبت بانٹنے والی شاعرہ ہیں......وہ چاہتی ہیں کہ اُن کے گھر کے آنگن میں پیار و محبت کے جو پھول کھلے ہیں اس طرح ہر گھر کے آنگن میں پھول کھلیں اور مہکیں چونکہ......محبت کے ثمر سے دل سراپا نور ہوتا ہے......محبت کی آبیاری کے لئے صائمہ کہتی ہیں کہ......

ہمیں آباد کرنا ہے کئی بنجر زمینوں کو
محبت کے سبھی بیجوں کی افزائش ضروری ہے

یہ حقیقت ہے کہ میاں بیوی کے پیار میں بڑی شیرینی، لطافت، نزاکت، خلوص اور اپنائیت ہوتی ہے جس سے گھروں میں خوشیاں مہکتی اور چہکتی ہیں......جن گھروں تک یہ خوشیاں نہیں پہنچیں ہمیں چاہئے کہ پیار محبت کی نعمت ان بنجر زمینوں تک بھی پہنچائیں۔ یہ کام بہت ضروری ہے اور اہل دانش کو اس طرف بھرپور توجہ دینی چاہئے۔ چونکہ مشرقی معاشرے میں عورت کو کمزور اور ناتواں سمجھا جاتا ہے جبکہ مغرب میں یہی ناتواں عورت آئرن لیڈی مارگریٹ تھیچر کی شکل میں نظر آتی ہیں جس نے برطانوی مردوں کو......تگنی کا ناچ نچایا...... آج یورپی عورتیں زندگی کے ہر شعبہ میں مردوں کے شانہ بشانہ کام کرتی نظر آتی ہیں۔ صائمہ اس صورت حال کو جانتی اور مشرقی عورت کی صلاحیتوں سے بھی بخوبی واقف ہیں......اسی لئے وہ بڑے اعتماد کے ساتھ مشرقی عورت کی آواز بن کر کہتی ہیں کہ:

گمشدہ یادوں کے اندر در بنا سکتی ہوں میں
اینٹ پتھر کے بنا بھی گھر بنا سکتی ہوں میں

یوں صائمہ کے ہاں بات پانچویں موسم سے آگے بڑھتی نظر آتی ہے......جس میں طنطنہ، جرات، حوصلہ اور جدوجہد پورے آب و تاب کے ساتھ نظر آتا ہے۔ ایسے میں ہم اس حقیقت پر غور کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ گھر...... اینٹ اور پتھر سے نہیں بنتے...... بلکہ...... تازہ افکار سے نئی بستیاں......بستی ہیں۔ مٹی کے گھروندوں کی بجائے تازہ افکار سے پھوٹنے والے شیریں چشمے ہی بنی نوع انسان کیلئے سودمند ہیں۔ اس مقام پر لا کر ہمیں صائمہ کے ہاں ترنگ اور چیلنج کا ایک جذبہ نئے انداز میں نظر آتا ہے۔

بات گر اشک رواں کی چھڑ گئی تو یاد رکھ
وسعت صحرا تجھے ساگر بنا سکتی ہوں میں

صائمہ مشرق کی جس عورت کو ہمارے سامنے لا کھڑی کرتی ہیں اُس کے ہاں اس قدر ہمت ولولہ اور جرات ہے کہ وہ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس بات کو ایک چیلنج کے طور پر کہتی ہیں کہ......اگر میں چاہوں تو صحرا کو بھی سمندر میں بدل سکتی ہوں......معلوم ہوتا ہے کہ حکومت کے ایوانوں اور منصوبہ بندی کمیشن والوں کو علم و ادب سے کوئی دلچسپی نہیں......اگر ہوتی تو وہ صائمہ کا یہ شعر پڑھ کر......جنوبی پنجاب اور سندھ کے صحرا کو گل و گلزار میں بدلنے کی جامعہ حکمت عملی تیار کرتے......لیکن اس کی بجائے ہمارے حکمران طبقہ نے غریب عوام کے ساتھ کچھ اس طرح کا برتاؤ کیا۔

امیر شہر نے دیپک دیا تحفے میں یہ کہہ کر
تمہاری جھونپڑی میں آسائش ضروری ہے

صائمہ انسانی نفسیات سے اچھی طرح واقف ہیں جو آس اور امید کا دامن کبھی نہیں چھوڑتیں...... بلکہ ڈھارس باندھنے کی خاطر......خدا سچ نہ کرے ......جیسی امیدیں دل میں بسائے، مختلف حیلے بہانے تراشتی ہیں......لیکن آخر کار ان کا طنطنہ کچھ کمزور اور ہمت توڑتا نظر آتا ہے۔

کسی سبب تو لبوں پر یہ خامشی ہے نا !
تُو سچ بتا یہ ملاقات آخری ہے نا !
میں غم کو جلد بھلانے کی خود بھی قائل ہوں
مگر یہ بیچ میں کم بخت شاعری ہے نا !

اور پھر کہتی ہیں:۔

وہ رخت سفر باندھ کے تیار کھڑا تھا
میں حوصلے والی تھی مگر وقت کڑا تھا

اور پھر آخر کار ہتھیار ڈال دیتی ہیں کہ:

کھلی کھڑکی سے جو رستہ تراتکتی رہی شب بھر
وہ شمع آس کی میں نے ہتھیلی سے بجھا دی ہے

صائمہ جدید لہجہ کی غزل گو شاعرہ ہیں......جن کی شاعری میں مشرقی عورت کا حسن، مجبوریاں، ناز، نخرے اور صنفِ نازک کی تمام رعنائیاں موجود ہیں......ان کی شاعری میں گہرائی بھی ہے اور روانی بھی۔ لطافت بھی ہے اور چاشنی بھی۔ پیار و محبت بھی ہے اور دکھ الم بھی۔ اس میں محبت کی ادائیں، بے رخی، چاہت، بے قراری، طلب، آس اور تڑپ بھی ہے اور جدائی کی کسک بھی......اور ماں کی ممتا کا پیار بھی......سانحہ پشاور کے حوالے سے ان کی ایک نظم بہت ہی اثر انگیز ہے......لیکن ماں کے حوالے سے ان کا یہ شعر زندہ و جاوید ہے۔

صائمہ دیکھا ہے میں نے حالتِ سکرات میں
ماں کو اپنے لاڈلے کی فکر دامن گیر تھی

یہ شعر پڑھا تو میری نظروں کے سامنے وہ منظر گھوم گیا جب میری امی حالت نزاع میں تھیں کہ اس دوران میرے بڑے بھائی ایوب صابر ماں کی بیمار پرسی کیلئے کمرے میں داخل ہوئے تو ماں جی نے بیٹے کو دیکھتے ہی اپنی بہو سے کہا......میرا بیٹا آیا ہے اسے کھانا کھلاؤ......اس کے چند منٹ بعد ماں جی کی روح پرواز کر گئی۔ صائمہ کا ایک اور شعر ہے:

سلسلہ دیمک کا پیڑوں کی جڑوں تک آ گیا
رنجش دل کا سفر اب فیصلوں تک آ گیا

یہ شعر بڑا خیال انگیز ہے۔ اس کے کئی معنی اور رخ ہیں۔ اس کا ایک رخ مسلم امہ بھی ہوسکتا ہے جو اس وقت گوناں گو مسائل میں گھری ہوئی ہے......بلکہ دشمن نے دیمک کی طرح چاٹ کر اس کی بنیادیں کھوکھلی کر دی ہیں۔ آج مراکش، تیونس، لیبیا، مصر، شام، عراق، افغانستان، بھارت اور آسام میں آباد مسلمان بے کسی اور بے طاقتی میں امریکہ اور یورپ پر نظریں جمائے زندگی بسر کرنے پر مجبور ہیں......جبکہ اہل مغرب ان مظلوموں کی پروا کیے بغیر دنیا کے وسائل پر قابض ہونے کے اپنے ایجنڈے پر تندی سے کام کرنے میں مصروف ہیں......اور ہم سادہ دل مسلمان ان کے ایجنڈے کو سمجھے بغیر اُنہیں سے انصاف مانگتے ہیں......جنہوں نے یہ آگ لگائی ہوئی ہے......جسے ٹھنڈا کرنے کی بجائے اُس پر وہ مزید تیل چھڑکتے نظر آتے ہیں۔ جن مسلمانوں نے کبھی......نیل کے ساحل سے لیکر تا بہ خاکِ کاشغر......کو تسخیر کیا تھا آج......اپنی نادانیوں اور دشمنوں کی چالاکیوں کی بدولت اس قدر حواس باختہ ہو چکے ہیں کہ......آپس میں دست گریباں......مسلمان مسلمان کو قتل کر رہا ہے......ایسی صورت حال میں آپس کی رنجشیں ختم کر کے ان مسائل سے نجات حاصل کرنے کے راستے ڈھونڈنے ضروری ہیں......لیکن مشکل یہ ہے کہ اس وقت مسلم امہ مرکزی قیادت سے محروم ہے......ہم ماضی میں جھانک کر خالد بن ولید اور صلاح الدین ایوبی کو یاد تو کرتے ہیں......لیکن نئے دور کے تقاضے پورے نہیں کرتے......آج کی جنگیں قوت بازو......اور پدرم سلطان بود......کی بجائے اعلیٰ ترین دماغی صلاحیتوں اور علم کی روشنی سے لڑی اور جیتی جاتی ہیں......ان صلاحیتوں سے آج ہم مسلمان محروم بلکہ بہت پیچھے ہیں...... صائمہ اس صورت حال سے مایوس نہیں بلکہ کسی معجزے کی منتظر ہیں......معجزے اس دور میں بھی ممکن ہیں...... جرمن اور برطانیہ کل ایک دوسرے کے بدترین دشمن تھے اور آج دونوں شیر و شکر ہیں......

زندگی میں معجزے یوں رونما ہونے لگے
دشمن جاں تھے کبھی جو ہم نوا ہونے لگے

یورپی اقوام کے حوالے سے صائمہ کا ایک اور شعر بھی قابل غور ہے:

اک ذرا سا کام ان کی ذات سے کیا آ پڑا
دیکھتے ہی دیکھتے بُت بھی خدا ہونے لگے

پانچواں موسم کی حاصل غزل......جس میں دیوانگی کو ایک اچھوتے انداز میں اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ اس غزل کا ہر شعر دوسرے پر سبقت رکھتا ہے۔

دل دریچہ وا کئے کھڑکی میں یوں بیٹھی تھی وہ
اک مصور کی حسین تصویر سی لگتی تھی وہ
سن کے اک مخصوص آہٹ......شام ڈھلتے ہی سدا
رکھ کے سارے دُکھ کہیں پر بھول سی جاتی تھی وہ
بھولنے والا اُسے، پردیس میں اچھا تو ہے؟
ہر مسافر سے یہی بس پوچھتی رہتی تھی وہ
صائمہ جب سارے خط اُس نے جلا ڈالے تھے خود
ادھ بجھی سی راکھ میں کیا ڈھونڈتی رہتی تھی وہ

...... دھند بھری حیرانی ......

کچھ جذبوں کی تخلیق شاعر کرتا ہے، کچھ جذبے شاعر کو تخلیق کرتے ہیں۔ شاعر کو تخلیق کرنے والے جذبے خالص اور انکی شدتِ نمو سے جنم لینے والی شاعری بھی خالص ہوتی ہے۔ خاور وحید کی شاعری خالص جذبوں کی شاعری ہے یہی وجہ ہے کہ ان کی ہر ایک نظم اور غزل کے ایک ایک شعر میں صداقت، اخلاص اور شدتِ احساس کا گہرا شعور ملتا ہے۔

......ڈاکٹر طارق عزیز

اشاعت: ۲۰۱۵ء، قیمت: ۳۰۰ روپے، دستیابی: بک ہوم، مزنگ روڈ، لاہور۔

''صرف داستانِ حیات؟؟؟''

ڈاکٹر نعمانہ نجم رضوی
(کراچی)

''ہوا کے دوش پر'' ہوا جو ماڈے کی لطیف اقسام میں سے ایک ہے لیکن طاقتور اتنی کہ منزلوں کی سمت کا تعین کرتی ہے۔۔۔انسان میں زندگی کا ظہورہ ہے۔

مگر یہاں تو عجیب بات ہے۔۔۔مصنف نے ہوا کو شکست دے کر خود اپنی منزلوں کا تعین کیا ہے۔انہوں نے تو بادِ مخالف سے ایک کامیاب لڑائی لڑی ہے۔۔۔پھر یہ ہوا کے دوش پر کب ہوا یہ تو خود اپنے دوش پر ہوا نا! شاعر نے انہی کے لیے تو کہا ہے۔

تندیٔ بادِ مخالف سے نہ گھبرا اے عقاب
یہ تو چلتی ہے تجھے اونچا اُڑانے کے لیے

جہاں تک کتاب کے طرزِ بیان کا تعلق ہے تو بہت سی گہری گہری باتیں صاحبِ کتاب ہوا کی طرح نہایت لطیف پیرائے میں بیان کر گئے ہیں۔

یہ کسی ایک شخص کی داستانِ حیات کب ہے؟ یہ تو کئی لوگوں کی داستانِ حیات ہے۔۔۔اگر غور کریں تو مصنف نے اپنے خاندان کے کئی لوگوں کی مکمل اور جامع لیکن مختصر سوانح حیات اس میں قلمبند کی ہیں۔اور قاری غیر محسوس طریقے سے بغیر ربط ٹوٹے کئی سوانح عمریوں کا مطالعہ کر جاتا ہے۔

کیا واقعی یہ صرف ایک ''سوانح حیات'' ہے؟ یہ تو میر پور خاص اور راجستھان کی مختصر تاریخ اور جغرافیہ پر مبنی کوئی کتاب ہے۔میرا خیال ہے آج کل کے نوجوانوں اور اُن لوگوں کے لیے جنہوں نے کبھی میر پور خاص نہیں دیکھا اس کتاب کو پڑھ لینے کے بعد میر پور خاص شہر کی ایک مکمل ثقافتی، علمی، معاشی، جغرافیائی اور تہذیبی تصویر اُن کے سامنے آجاتی ہے۔کم از کم میر پور خاص کی تو یہ ایک مختصر مکمل اور جامع تاریخ ہے۔

آپ اب بھی سمجھتے ہیں کہ یہ صرف ایک سوانح حیات ہے؟ یا پھر اے۔آر خاتون کا کوئی ناول! جس میں بڑے بڑے اور اجتماعی خاندانی نظام کے پیار، محبت، چھوٹی چھوٹی چپقلشیں لیکن پھر بھی برقرار ہم آہنگی کو اجاگر کیا جاتا ہو۔یا پھر حسینہ معین کا کوئی ہلکا پھلکا آپس کی چھیڑ چھاڑ اور عورتوں کی مضبوطی کو مرکزِ نگاہ بنانے والا کوئی ڈرامہ۔۔۔

جہاں مصنف نے اپنی نوعمری کے دور میں عشق کی واردات کا حال نہایت ہی دلچسپ اور لطیف انداز میں بیان کیا ہے۔۔۔یا پھر کسی ایسے جفاکش اور مستحکم ارادوں کے شخص کی داستان ہے جنہیں تاریخ ہیرو بنا دیتی ہے اور آنے والی نسلوں کو اُن کی کہانیاں سنائی جاتی ہیں تا کہ اُن میں وہ اُمنگ اور ولولہ پیدا ہو سکے جو تقدیروں کو تبدیل کر دیا کرتے ہیں۔فرق صرف اتنا ہے کہ وہ نہایت خشک انداز میں بیان کی جاتی ہیں اور یہاں دلچسپی ٹوٹنے کا نام ہی نہیں لیتی۔

یا یہ ایک عظیم ماں کی شان میں بیان کیا جانے والا کوئی قصیدہ ہے جس میں بلاشبہ یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ماں کی تربیت، وسیع النظری، بلند حوصلہ، جفاکشی، مثبت سوچ اور ان سب سے بڑھ کر ''دعائیں'' ہی اولادوں کی قسمتیں بدل دیا کرتی ہیں اور ایک گھر کو ہزار مسائل کے باوجود جوڑے رکھتی ہیں کیونکہ اس تجربے سے نہ صرف مصنف بلکہ میں خود بھی گزری ہوں۔۔۔

پورے خاندان کا اتحاد اور یگانگت کس طرح مخالف حالات کو موافق بناتی ہے۔خوبصورتی سے بیان کیا گیا ہے۔تمام کتاب پڑھ لینے کے دوران نہ روانی ٹوٹتی ہے اور نہ دلچسپی اور تجسس۔مزے کی بات یہ ہے کہ آپ جتنی بار پڑھیں دلچسپی ختم نہیں ہوتی۔حالانکہ یہ ڈرامہ نہیں ہے لیکن پھر بھی آپ تمام مقامات اور اس وقت کے حالات کو اپنی آنکھوں کے سامنے فلم کی طرح چلتا ہوا پائیں گے۔اور یوں محسوس ہوگا جیسے آپ خود وہاں موجود ہوں۔غیر ضروری طوالت سے اجتناب اور سلاست شاید مصنف کی پہچان ہے۔

آخیر میں، میں بتاؤں کہ مصنف اور کوئی نہیں میرے سگے اور اکلوتے چچا ڈاکٹر فیروز عالم ہیں یہ کہانی میرے اپنے خاندان کی ہے جو شاید میں نے بچپن سے ہزاروں دفعہ سُنی ہوگی۔لیکن اتنے ربط اور مصدقہ طور پر ہر ہر واقعہ میں محسوس کروں گی یہ نہیں سوچا تھا۔

میں یہ تو جانتی تھی کہ میرے چچا نہایت باصلاحیت اور منفرد قسم کے انسان ہیں لیکن یہ نہیں جانتی تھی کہ اُن کی شخصیت اتنی ہمہ جہت ہے۔وہ نہ صرف ایک بہترین ڈاکٹر ہیں بلکہ ایک زبردست Fighter، راہ میں آنے والی ہر چٹان کو باآسانی اُڑ کر عبور کرنے والا، بلند حوصلہ، تحریر میں ادب کی ہر صنف کو تھوڑا تھوڑا چھونے کی صلاحیت رکھنے والے پھر بھی مبالغہ آرائی سے پرہیز کرنے والے اور قاری کو اپنے ساتھ لے کر چلنے والے ہیں۔

اندر سے نہایت مشرقی لیکن مغرب میں جا کر وہاں کے ماحول میں اپنی حدود و قیود کو برقرار رکھ کر رچ بس جانے والے ہی کا نام فیروز عالم ہوسکتا ہے۔

یہاں میں اپنے پیارے چچا جان سے اگر یہ فرمائش کروں تو یہ اُن کے قارئین بھی میرے ساتھ ہم آواز ہوں گے کہ چچا جان آپ نے اپنی ابتدائی زندگی کو قلم بند کر کے ایک طرح سے میر پور کی تاریخ رقم کی ہے۔اب امریکہ میں گزرے روز و شب کو ضابطہ تحریر میں لا کر اپنے تجربات سے قارئین کو مستفید کیجیے اور جلد ایک کتاب منظر عام پر لے آیئے جو امریکہ کے ترقی یافتہ معاشرے کی عکاسی کے ساتھ آپ کی زندگی کے رنگ و بُو سے آمیز ہونی چاہیے۔مجھے امید ہے کہ آپ میری خواہش ضرور پوری کریں گے۔انشاءاللہ

''شہرِ تمنّا''

میرے خوابوں کی رخشندہ دہلیز پر

غالب عرفان
(کراچی)

چادریں موسموں کی بدلتی رہیں
وقت کٹتا رہا، ہم گزرتے رہے
کم نگاہی کے غیظِ شر رخیز سے
منظرِ جسم وجاں، رقت انگیز سے
میں بھٹکنے لگا، میری آنکھوں میں شہرِ تمنا کا منظر جگا!
میری نظروں میں ماضی کا ظلمت کدہ، یوں اجاگر ہوا
جیسے لمحوں کی زنجیر تصویر ہو!
جیسے صدیوں کی تاریخ تحریر ہو!
جیسے باطن پہ ظاہر کی تاثیر ہو
جیسے اک خواب کی کوئی تعبیر ہو
اور پھر۔۔۔ناگہاں!
لمحہ لمحہ کئی نقش ابھرے مگر
پسِ زنداں دریچے کے اُس پار تک
گھپ اندھیرا ہی تھا
کوئی تارا نہ تھا
استعارہ نہ تھا
میرا چہرہ تھا اور تختۂ دار تھا!
میرے خوابوں کی رخشندہ دہلیز پر

○

فیصلہ

پروین شیر
(نیویارک)

آج پھر.....
مجھ سے ملنے مرے
دو عزیز آ گئے
اپنی روداد مجھ کو سنانے لگے
رنجشیں، الجھنیں، تلخیاں، کشمکش
سب بتانے لگے
میں نے دیکھا جو اُن کی طرف
دونوں بدحال تھے
بال بکھرے ہوئے
آنکھیں دہکی ہوئی
ہونٹ سوکھے ہوئے
اپنی اپنی ضدوں پہ اڑے
اپنی منطق سے ثابت یہ کرنے لگے
کون ملزم ہے اور کون مظلوم ہے
آج پھر فیصلہ میرے ہاتھوں میں تھا
ہتھکڑی کس کو پہناؤں میں
سن کے دونوں کی روداد میں
سوچتی رہ گئی
جرم کس نے کیا؟
کون کس کا خطا کار ہے؟
آخرش فیصلہ میں نے کر ہی دیا
اور اب..........
پابہ زنجیر تاریک زنداں میں بیٹھا ہے دل
ذہن روشن فضاؤں میں آزاد ہے!

○

نظم کا استقبال

علی محمد فرشی (راولپنڈی)

جب کوئی نظم
میرے دروازے پر دستک دیتی ہے
تو میں فوراً
کسی خوبصورت لفظ کا لباس پہن کر
اس کا استقبال کرتا ہوں
کبھی سرخاب کی شکل میں
اور کبھی کبوتر یا کونج کی صورت میں
لفظوں کے پرندے
میرے دل میں اترنا شروع ہو جاتے ہیں
مرغابیاں اور دیگر آبی پرندے
سنہری حوض میں تیرتے ہیں
اور مور اس کے کناروں پر رقص کرتے ہیں
میں پرندوں میں اس قدر محو ہو جاتا ہوں
کہ مجھے یاد ہی نہیں رہتا
میں ایک شاعر ہوں
پرندے مجھ سے بچھڑے ہوئے
پرانے دوستوں کی طرح ملتے ہیں
اور اپنی کہانیاں سناتے ہیں
میں سوچتا ہوں یہ کہانیاں لکھ لینا چاہیں
لیکن مجھے احساس ہوتا ہے
کہ میں لکھنا بھول چکا ہوں
جیسے بطخ زمین پر رہتے رہتے اڑنا بھول گئی
پھر یکا یک سارے پرندے اڑنا بھول جاتے ہیں
اور میری نظم کی شاخوں پر آ بیٹھتے ہیں
مجھے کچھ یاد نہیں آتا
کہ میں درخت کب بنا تھا
بس اپنی خوشبو کے بوجھ سے جھکا جاتا ہوں
ایک سایا میری شاخیں تراشتا ہے
پھر ایک شاخ سے قلم بناتا ہے
اور میرے سینے پر
مہمان پرندوں کے نام لکھتا ہے
آنکھ کھلنے پر
میں ان ناموں کو غور سے پڑھتا ہوں
اور درخت کو
تہ کر کے اپنی ڈائری میں رکھ لیتا ہوں

صاحبِ اقتدار، رہنے دو

غلام سرور
(کینیڈا)

صاحب اقتدار ، رہنے دے
میرے پروردگار، رہنے دے

جانتا ہوں تیری مشیّت کو
اس لیے اشک بار رہنے دے

ہر طرف چھائی گردشِ دوراں
کوئی تو غم گسار رہنے دے

دیدنی ہے خرابیٔ انساں
اس لیے شرم سار رہنے دے

شیخ صاحب سے دل لگی کے لیے
چند بادہ گسار رہنے دے

میں بھی تیرا ہی ایک مظہر ہوں
اس لیے راز دار رہنے دے

○

ٹھنڈی آگ

پروفیسر زہیر کنجاہی
(راولپنڈی)

نرم لہجہ
گرم باتیں
کون سنتا ہے زہیرؔ
یہ تیری کڑوی زباں پہ شعلہ ساماں حرف حرف
ذکرِ سیلِ انقلاب
آج کا انسان مطلب کے زماں میں قید ہے
آج گندے جسم جلی نکہتوں میں مست ہیں
اے قلم والو۔۔۔تمہاری صورتیں
اونچی اونچی کُرسیوں کی بھیک ہیں
یہ تمہارے لفظ بازاروں کی ننگی جنس ہیں
اے وفا والو
تمہاری روشنی
قصرِ استبداد کی تزئین ہے
کپکپاتے جسم
روتی آنکھ کی توہین ہیں
تُم میرے لفظوں کو پڑھتے ہو مگر ہنستے نہیں
تُم انہیں سُنتے ہو، سُن کر
سرد چہرہ آئینے کے روبرو لا کر دکھاتے ہو مجھے
میرے سارے لفظ اپنے سرد چہرے کو سُناتے ہو
ستاتے ہو مجھے!

○

زلزلہ

عارف نقوی (برلن)

پہاڑوں کی چٹانیں ٹوٹ کر
دھرتی پہ گرتی ہیں
زمیں ہلتی ہے
گھر مٹتے ہیں
جانیں تلف ہوتی ہیں
شگافِ کوہساراں
جب تباہی بن کے آتے ہیں
نشیمن جب اجڑتے ہیں
سبھی تنکے بکھرتے ہیں
ہزاروں آبگینے بن کے جب
ایواں چٹکتے ہیں
فضائیں کانپ جاتی ہیں
زمیں تھرّانے لگتی ہے
بھرے کھیتوں میں
بس اِک عالمِ شمشان ہوتا ہے
قیامت کا سماں ہوتا ہے
انساں گھٹ کے مرتے ہیں
تو عارفؔ
زندگی کی لذتوں پر
شرم آتی ہے

○

منٹو

شگفتہ نازلی

(لاہور)

منٹو کو سوچنے کی کئی راہیں ہیں کھلی۔۔۔
تخلیقی دریچوں سے پھر ہوائیں ہیں چلی۔۔۔
وہ اپنی نوع کے منفرد تخلیق کار تھے۔۔۔
مخلص معاشرے سے اور دوست دار تھے۔۔۔
محفلِ تھی گائیکی کی یا اربابِ ذوق تھے۔۔۔
غالب کی تھی غزل یا گیت نورِ جہاں کا۔۔۔
ملنے ملانے کا تو اِک رہتا تھا سلسلہ۔۔۔
احباب اور مداحوں کی آراء کا مرحلہ۔۔۔
مضمون مختلف لکھے تھے ، خاکے بھی جدا۔۔۔
اور سب سے بڑھ کر غیر معمولی کہانیاں۔۔۔
جو دیکھتے، سمجھتے اور محسوس کرتے تھے۔۔۔
اُنہی کے عکس تحریروں میں پیش کرتے تھے۔۔۔
تصویریں خوشگوار یا ناخوشگوار تھیں۔۔۔
سچائی سے قلم کی اُس میں رنگ بھرتے تھے۔۔۔
دارومدار اس کا اُس معاشرے پہ تھا۔۔۔
جس سے کہانی بننے کو کردار چُنتے تھے۔۔۔
''ہتک'' کہ ''سوگندھی'' تھی یا پھر ''ٹوبہ ٹیک سنگھ''۔۔۔
کردار تھے زمینی حقائق کے ترجماں۔۔۔
اظہار کے لیے جدا پیرایۂ بیاں۔۔۔
سرمد *نے منٹوفہمی کے ابواب کھولے ہیں۔۔۔
جیسے کہانیوں کے کچھ کردار بولے ہیں۔۔۔
ہونے لگا فضاؤں میں کوئی مکالمہ۔۔۔
اُڑنے لگا جوں ہاتھوں میں کوئی مراسلہ۔۔۔
منٹو پڑے ہیں سو رہے، یہ سوچتے ہوئے
کہ وہ بڑے کہانی کار یا کہ ہے خدا۔۔۔!

○

* فلم منٹو کے ہدایتکار اور مرکزی اداکار

Connection

بینا گوئندی

(لاہور)

اور۔۔تم نے بھی مجھے چھینٹ کی پھولدار قمیض سمجھ کر پہن لیا
جس کو گلی کے موڑ پر بیٹھے موچی کی بیوی۔۔۔سے سلوایا
اس کی اوقات ہی کیا ہے،
درزی کے پاس تو نت نئے فیشن۔
کے زرتار کپڑے آتے اور جاتے ہیں۔
یہ نگوڑی چھینٹ کی قمیض۔
کہ وہ یقیناً سینے کی حامی بھر لے گا
کل ہمارے غریب مامے کی بیٹی کی شادی ہے
چلو اس پر پہن جاتے ہیں
کیونکہ وہ تو ابھی تلک ان ہی چھینٹ کی قمیض کے
پھولوں میں ہی رہتے، بستے اور بستے ہیں
ان کو دنیا کے دلفریب رنگوں
نت نئی امنگوں
اور اپنوں سے ہی اپنوں کے حذن کے
رشتوں کو۔۔۔قتل کرنے کا سلیقہ ہی نہیں
کہ ان کو۔۔۔روحانی یا جسمانی
Connection کی تمیز کہاں ہے
چلو آج کا وار
ان پر کرتے ہیں۔۔۔اور چھینٹ کی قمیض کو پہن لیتے ہیں

○

جنتِ ارضی

ڈاکٹر ریاض احمد

(پشاور)

جسے ہم ارض کہتے ہیں ہمارا آشیانہ ہے — بطن میں اس کے پوشیدہ سبھی کا آب و دانہ ہے
ظہور اس کا ہوا تھا جب نہ تھا کچھ اسکے سینے پر — نظر آتا ہے اب جو یاں اُسی کا کارنامہ ہے

یہ لاکھوں سال حدت☆ میں رہی پر راہ نہیں بدلی — ازل سے ہی مدارِ شمس میں یونہی روانہ ہے
زمیں کے گردشِ اوقات کی بھی شان نرالی ہے — مسلسل روز و شب محور پہ اپنے گھوم جانا ہے

یہ سارے رنگ یہ خوشبو نظر آتے ہیں جو ہر سُو — یہیں تشکیل پاتے ہیں یہ نادر کارخانہ ہے
گل و گلزار یہ دُنیا شجر پھلدار بھی ہیں یاں — نظارہ دارِ فانی کا نہایت ہی سُہانا ہے

جہانِ بحر ہو یا خاک ہو یا باد ہو اس پر — سبھی کا رزق ہے اس میں جواہر کا خزانہ ہے
بنا ہے جن سے ہر انساں وہ ذرے خاک ہی کے ہیں — یہ انسان احسنِ تخلیق کا کامل نمونہ ہے

ہوائیں حرص و ظلمت کی رواں رہتی ہیں یاں ہر دم — جو برپا ہے فسادِ ارض اسی کا شاخسانہ ہے
اگر ہم سیکھ لیں رہنا زمیں پر امن و الفت سے — یہ خاکِ ارض پھر ہم سب کا جنت سا ٹھکانہ ہے

ہماری زندگانی بھی ہے ترکیبِ عناصر سے — اسی ترتیب کے مٹنے پہ سب نے لوٹ جانا ہے
عناصر کے بکھرنے سے وہ رشتہ ٹوٹ جائیگا — جو میرے جسم و میری روح کا بندھن سہانا ہے

وہ کیا ہستی ہے جس نے جان بخشی ان عناصر کو — وہ تھی اِک پھونک خالق کی روحِ جسم و جاناں ہے
میری جاں بھی عنایت ہے اُس کے اک اشارے کی — کہ جس کے ہر اشارے پر رواں سارا زمانہ ہے

بنی ہے ان عناصر سے ہی تمثیلِ ریاضؔ احمد
مگر ان سب عناصر کو زمیں میں لوٹ جانا ہے

○

☆ حِدت۔ زمین جب سورج سے علیحدہ ہو کر مدار میں گردش پذیر ہوئی تو وہ ایک دہکتے ہوئے گولے کی مانند تھی۔ کروڑوں سال گزرنے کے بعد اس کی بیرونی سطح زندگی کی نشو و نما کیلئے تیار ہوئی۔

حالی کے مخالفین

ڈاکٹر سید تقی عابدی
(ٹورنٹو، کینیڈا)

یہ سچ ہے کہ اس مختصر گفتگو میں حالی کے سارے مخالفین کا ذکر ممکن نہیں۔ حالی کے دوست بے شمار تھے لیکن دشمنوں اور مخالفوں کی کمی بھی نہ تھی۔ ان کے مخالفین میں مذہبی غیر مذہبی اور دوست نما دشمن شامل تھے۔ حالی کے مخالفت کی ایک خاص وجہ ان کی سرسید سے دوستی، علی گڑھ تحریک سے وابستگی اور سرسید کی سوانح، حیات جاوید کی تصنیف تھی۔ ہماری اس تحریر میں چند پردہ نشین مردوں کے نام بھی آئیں گے جو ظاہراً دوستی کا دم بھرتے تھے لیکن ان کے دل حالی سے صاف نہ تھے بقول میر انیس ''میں نے تو ایک دل بھی نہ دیکھا جو صاف ہو''۔ حالی کی مخالفت ادیبوں اور شاعروں کا مرغوب مشغلہ تھا۔ اگر چہ سرسید، شبلی نعمانی، ڈپٹی نذیر احمد اور علاّمہ اقبال کی طرح حالی پر کفر کا فتویٰ نہیں لگایا گیا مگر حالی کی شخصیت اور فن کو مسلسل نشانہ بنایا گیا۔ حالی کے دور کے سیاہ اوراق آج بھی موجود ہیں۔ مذہبی لوگ حالی کو سرسید کی بانسری اور نیچری کہتے تھے۔ حالی نے جو اُردو شاعری کی پاکیزگی کی مہم کو اپنا شعار بنایا تھا وہ بہت سے شاعروں اور ادیبوں کو کھلتا تھا کیوں کہ وہ حالی کو اہل دلّی اور لکھنو نہیں مانتے تھے وہ حالی کو پانی پت کا ایک معمولی شاعر جانتے تھے۔ ''دلّی دلّی کیسی دلّی = پانی پت کی بھیگی بلی''

حالی کی مخالفت ان کی موضوعاتی نظموں سے شروع ہو چکی تھی۔ مسدس حالی کی عوام میں پذیرائی ان کے مخالفین کے لیے خطرے کی گھنٹی محسوس ہو رہی تھی جو فن برائے فن وہ بھی بطور تفنن کے قائل تھے۔ حالی ایسی شاعری کو عفونت میں سنڈاس سے بدتر بتا رہے تھے اور ایسے شاعروں کی موجودگی یا غیر موجودگی سے متاثر نہ تھے جیسا کہ انھوں نے مسدس میں اعلانیہ کہا تھا۔

یہ ہجرت جو کر جائیں شاعر ہمارے
کہیں مِل کے خس کم جہاں پاک سارے

مقدمہ شعر و شاعری میں چوما چاٹی کی شاعری پر شدید ردّعمل نے لکھنو اور دلّی کے رومانی شعرا کو حالی کے مقابل کر دیا۔ درجنوں حالی کو دشنام اور نازیبا خطوط ملنے لگے۔ مختلف روزنامے اور رسالے مستقل طور پر حالی کے خلاف صف آرا ہو گئے جن میں حسرت موہانی کا اُردوئے معلّیٰ اور سجاد حسین لکھنوی کا اودھ پنچ پیش پیش تھے۔ حالی کے خلاف سوقیانہ ہجو لکھی جانے لگیں۔ اودھ پنچ کے سرورق پر کئی سال تک یہ شعر چھپتا رہا۔

ابتر ہمارے حملوں سے حالی کا حال ہے
میدانِ پانی پت کی طرح پائمال ہے

حالی کو خالی، جعلی، مالی، خیالی اور ڈفالی جیسے ناموں سے یاد کیا جانے لگا۔ لکھنو اور دلّی کے اہل زبان کہتے تھے یہ پانی پتی شخص کس جرات سے اہل زبان کے ہم زبان ہی نہیں بلکہ مسیحائے زبان ہونے کی کوششیں کر رہا ہے۔ حالی ان تمام حملات کا خاموشی سے جواب دے رہے تھے اور ہمہ تن دن رات چمنستان شعر کی پاکیزگی میں مصروف تھے۔

اردو دنیا اور دنیائے ادب کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو ہمیں معاصرین پر تخریبی تنقید نظر آتی ہے جیسے والٹیر کا حملہ شکسپیر پر گوئٹے کا حملہ ڈانٹے پر رشید وطواط کا حملہ خاقانی پر، فرخی کا حملہ فردوسی پر احراری کا حملہ سعدی پر، سودا کا حملہ میر پر شیفتہ کا حملہ نظیر پر رجب علی بیگ کا حملہ میرامن پر وغیرہ۔ چنانچہ ہر ادب اور ہر دور میں تخریبی تنقید نظر آتی ہے۔ یہاں ہم حالی کے چند معاصرین کی معاندانہ تنقید کو مستند حوالوں سے درج کرتے ہیں۔ حسرت موہانی اُردوئے معلّیٰ میں حالی پر سخت اعتراضات کرتے تھے۔ اسی قسم کا ایک واقعہ تذکرہ حالی میں شیخ اسماعیل پانی پتی نے یوں لکھا ہے۔

''علی گڑھ کالج میں کوئی عظیم الشان تقریب تھی۔ نواب محسن الملک کے اصرار پر مولانا حالی بھی اس میں شرکت کے لیے تشریف لائے اور حسبِ معمول سید زین العابدین مرحوم کے مکان پر فروکش ہوئے۔ ایک صبح حسرت موہانی دو دوستوں کے ساتھ مولانا کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ چندے اِدھر اُدھر کی باتیں ہوا کیں۔ اتنے میں سید صاحب موصوف نے بھی اپنے کمرے میں سے حسرت کو دیکھا۔ اُن میں لڑکپن کی شوخی اب تک باقی تھی۔ اپنے کتب خانے میں گئے اور اُردوئے معلےٰ کے دو تین پرچے اُٹھا لائے۔ حسرت اور اُن کے دوستوں کا ماتھا ٹھنکا کہ اب خیر نہیں۔ اور اُٹھ کر جانے پر آمادہ ہوئے مگر زین العابدین کب جانے دیتے تھے۔ خود پاس بیٹھ گئے۔ ایک پرچے کے ورق الٹنا شروع کیے اور مولانا حالی کو مخاطب کر کے حسرت اور اُردوئے معلےٰ کی تعریفوں کے پُل باندھ دیے..... کسی کسی مضمون کی دو چار سطریں پڑھتے اور واہ خوب لکھا ہے کہہ کر داد دیتے...... حالی بھی ہوں، ہاں سے تائید کرتے جاتے تھے...... اتنے میں سید صاحب مصنوعی حیرت بلکہ وحشت کا اظہار کر کے بولے:

''ارے مولانا یہ دیکھیے آپ کی نسبت کیا لکھا ہے اور کچھ اس قسم کے الفاظ پڑھنا شروع کیے۔ سچ تو یہ ہے کہ حالی سے بڑھ کر مخربِ زبان کوئی نہیں ہو سکتا اور وہ جتنی جلدی اپنے قلم کو اُردو کی خدمت سے روک لیں اُتنا ہی اچھا ہے۔ فرشتہ منش حالی ذرا مکدّر نہیں ہوئے اور مسکرا کر کہا تو یہ کہا کہ نکتہ چینی اصلاحِ زبان کا بہترین ذریعہ ہے اور یہ کچھ عیب میں داخل نہیں۔''

کئی روز بعد ایک دوست نے حسرت سے پوچھا اب بھی حالی کے خلاف کچھ لکھو گے؟ جواب دیا جو کچھ لکھ چکا اُسی کا ملال اب تک دل پر ہے۔ حالی کا یہ ضبط، وقار اور عالی ظرفی بڑے بڑے مخالفوں کو شرمندہ اور نکتہ چینوں کو پشیمان کر دیتی تھی۔''

جب حالی کی شہکار کتاب ''حیات جاوید'' شائع ہوئی تو شبلی نعمانی

نے اس کی سخت مخالفت کی ۔مولوی عبدالحق ''چند ہم عصر'' میں لکھتے ہیں۔ جب میں نے حیات جاوید کا ایک نسخہ ان کو دیا تو دیکھتے ہی فرمایا۔ ''یہ کذب وافترا کا آئینہ ہے'' یہ جملہ سن کر عبدالحق دم بخود رہ گئے کیوں کہ پڑھنے سے پہلے ایسی سخت رائے کیا معنیٰ رکھتی تھی۔

شبلی حبیب الرحمٰن خان شیروانی کے خط میں حیات جاوید کو کتاب المناقب لکھتے ہیں۔ایک اور خط میں شیروانی کو لکھتے ہیں وہ محض دعوے کرتے ہیں واقعات کی شہادت پیش نہیں کرتے بہر حال میں حیات جاوید کو مدلّل مدّاحی سمجھتا ہوں۔

شبلی اپنے شاگرد عبدالسمیع کو حیات جاوید پر منفی ریویو کرنے کے بعد لکھتے ہیں۔ ''میں کچھ مزید نہیں کہنا چاہتا تم مقلد نہیں مجتہد ہو پھر تقلید کیوں؟''

اب آئینہ کا دوسرا رخ حالؔی کا کریکٹر دیکھئے جسے عبدالحق نے اپنی کتاب چند ہم عصر میں دکھایا ہے۔

''ایک روز مولوی ظفر علی خاں مولانا حالؔی سے ملنے آئے اس زمانے میں وہ ''دکن ریویو'' نکالتے تھے کچھ عرصہ پہلے اِس رسالے میں ایک دو مضمون مولانا شبلی کی کسی کتاب یا رسالے پر شائع ہوئے تھے ان میں کسی قدر بے جا شوخی سے کام لیا گیا تھا۔مولانا نے اس کے متعلق ظفر علی خاں صاحب سے ایسے شفقت آمیز پیرائے میں نصیحت کرنی شروع کی کہ ان سے کوئی جواب نہ بن پڑا اور سر جھکائے آنکھیں نیچی کئے چپ چاپ سُنا کئے۔مولانا نے یہ بھی فرمایا کہ میں تنقید سے منع نہیں کرتا،تنقید بہت اچھی چیز ہے اور اگر آپ لوگ تنقید نہ کریں گے تو ہماری اصلاح کیوں کر ہوگی لیکن تنقید میں ذاتیات سے بحث کرنا یا ہنسی اُڑانا منصب تنقید کے خلاف ہے۔''

وحیدالدین سلیم پانی پتی جنھیں حالؔی نے دنیائے اُردو میں معروف کیا وہ بھی حیات جاوید کے بارے میں صدر یار جنگ حبیب الرحمٰن خاں شیروانی کو لکھتے ہیں۔ ''حالؔی نے دیباچہ میں جس امر کا وعدہ کیا ہے اس کو وہ ایک شمّہ بھی پورا نہیں کر سکے۔ جہاں انھوں نے سر سید کی تفسیر کی بحث کی ہے یہ کہتے ہوئے کہ بحث طولانی ہو جائے گی ادھورا چھوڑ دیا ہے۔''

بقول رشید حسن خان کہ حالؔی کو غالب کے بہت واقعات کا علم تھا وہ اگر اپنے طور پر ان کو لکھتے تو بعض ایسی باتیں ضرور بیان میں آجاتیں جو ان کے نزدیک وضاحت طلب نہیں تھیں۔ اس الجھن اور اس کشمکش سے چھٹکارا حاصل کرنے کا یہ طریقہ انھوں نے اختیار کیا کہ بعض اہم واقعات کے بیان میں اپنی طرف سے کچھ کہنے کے بجائے خود مرزا صاحب کے بیانات کو نقل کر دیا اس طور سے سوانح نگار کی حیثیت سے ان کے کسی بیان کا جائزہ نہیں لیا اس طریقۂ کار نے کئی واقعات کی واقعی شکل و صورت کو سامنے آنے نہیں دیا۔''

سچ تو یہ ہے کہ لعن وطعن، گالی، دشنام، طنز واعتراضات کے طوفان کو حالؔی نے ایک نرالے طریقے سے زیر کیا۔

کیا پوچھتے ہو کیونکر سب نکتہ چیں ہوئے چپ
سب کچھ کہا اُنھوں پر ہم نے دم نہ مارا

لیکن جیسا ہمیشہ ہوتا آیا ہے مخالفت کا یہ طوفان جو خس وخاشاک کی کائنات تھا، جلد ہی دب گیا اور حالؔی کی عظمت اور شان اپنی جگہ قائم رہی۔

''غل تو بہت یاروں نے مچایا پر گئے اکثر مان ہمیں''

اُردو تنقید پر یہ بھی الزام لگایا جاتا ہے کہ اس کے ناقدین عموماً سکّے کے دو رخ پیش نہیں کرتے یا تو سراسر مدح ہوگی یا پھر ہر لفظ میں ذم وقدح کا پہلو ہوگا۔ حالؔی کی حیات جاوید پر اعتراض کرتے ہوئے شبلی نعمانی نے کہا تھا یہ کتاب المناقب ہے مدلّل مدّاحی ہے جب کہ خود شبلی نے جب موازنہ انیؔس و دبیؔر لکھا تو انیؔس کی مدّاحی اور دبیؔر کی قدّاح لکھی۔ حالؔی نے اپنی تینوں سوانح عمریوں میں یعنی حیات سعدؔی، یادگار غالبؔ اور حیات جاوید ان تینوں بزرگوں کی مدحت آرائی کی ہے اور خود اس بات کا اقرار بھی کیا ہے کہ ابھی برصغیر میں کریٹکل بیوگرافی کا وقت نہیں آیا ہے۔ہم کہتے ہیں حالؔی سے تسامح ہوا ہے اگر وہ تذکرے دیکھ لیں تو معلوم ہوگا کہ تذکرہ نویس نے کس طرح تخلیق کار کی شخصیت اور تخلیق کا ناحق خون کیا ہے۔ کیا حالؔی کے استاد مصطفیٰ خان شیفتہؔ نے نظیرؔ اکبرآبادی کے ساتھ ظلم نہیں کیا؟ کیا گلشن بے خار خارداری کی وجہ سے گلشن بے کار نہیں ہوا؟ اصلی تخلیق کار ایک پہاڑ ہوتا ہے اگر ناقد اس سے سر ٹکرائیں تو سر پھوٹتا ہے پہاڑ نہیں ٹوٹتا۔ ہم نے حالؔی کی شاعری اور ان کے نثری کلام پر ناقدین کے دونوں رخ پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ جن نقّادوں نے رسمی طور پر ایک دو جملے تعریف کے لکھ کر منفی باقی کا دفتر کھولا ہے جس میں انصاف سے کام لینے کے بجائے ذاتی فکر و تجربہ سے اخذ کردہ تنقیص اور ذم کا پہلو دکھایا گیا ہے جو علمی عقلی اور منطقی حوالوں سے ثابت نہیں ہو سکتا ہے۔ ان ناقدین میں احسن فاروقی وحید قریشی اور کلیم الدین احمد سر فہرست ہیں۔ ان ناقدوں نے نوک خار سے گل تخلیق کو تار تار کرنے کی ناکام کوشش کی ہے۔

حالؔی کے منظوم اور نثری کلام پر کئی تبصرہ نگاروں نے کلیم الدین احمد کے تند و تیز جملے نقل کئے جنھیں بعض مقامات پر توڑ موڑ کر کچھ جوڑ کر اور کچھ چھوڑ کر اسی طرح بیان کیا کہ مسائل پر پوری روشنی نہیں پڑ سکی اس لئے ہم نے کلیم الدین احمد کے ایک طویل مضمون حالؔی سے جو ان کی کتاب ''اُردو تنقید پر ایک نظر'' میں شامل ہے اقتباسات بغیر کسی متن کی تحریف کے یہاں لکھ کر حالؔی کے مقدمہ اور شعر وشاعری کے بارے میں ان کا نظریہ پیش کر رہے ہیں جہاں وہ حالؔی کی معمولی سی مغربی شاعری اور تنقید کی سہل انگاریوں یا ان سے واقفیت کو جرم سنگین بتا کر ان کی شخصیت اور تصنیف کا بہیمانہ قتل کرتے ہیں۔ ان کی تنقید دیکھ کر یہ یقین کرنا مشکل ہے کہ انھوں نے حالؔی کے تمام تر کلام کا مطالعہ کیا ہے۔

کلیم الدین احمد حالؔی کو اُردو تنقید کے بانی، اُردو کے بہترین ناقد جن کی نثر بلند پایہ ہے بتاتے ہیں۔

''اُردو تنقید کی ابتدا حالؔی سے ہوتی ہے۔ ''پرانی تنقید'' محذوف و مقصود کے جھگڑوں، زبان ومحاورات کی صحت اسناد کی ہنگامہ آرائی تک محدود تھی۔ حالؔی نے سب سے پہلے جزئیات سے قطع نظر کی اور بنیادی اصول پر غور وفکر کیا

۔شعر وشاعری کی ماہیت پر کچھ روشنی ڈالی اور مغربی خیالات سے استفادہ کیا۔ اپنے زمانہ، اپنے ماحول اپنے حدود میں حالی نے جو کچھ کیا وہ بہت تعریف کی بات ہے۔ وہ اُردو''تنقید'' کے بانی بھی ہیں اور اُردو کے بہترین نقاد بھی ہیں یہاں جو کچھ لکھا جائے گا اس سے حالی کی تحقیر مقصود نہیں۔ ان کی تاریخی اہمیت اظہر من الشمس ہے۔ ان کی نثر بلند پایہ ہے، ان کا خلوص زبردست ہے۔''

پھر لکھتے ہیں۔

''شعر وشاعری کی اہمیت کا صحیح اندازہ حالی کے بس کی بات نہیں وہ کہتے ہیں ''شعر کی مدح وذم میں بہت کچھ کہا گیا ہے اور جس کی قدر اس کی مذمت کی گئی ہے وہ بہ نسبت مدح کے زیادہ قرین قیاس ہے۔'' وہ افلاطون کے ہم خیال ہیں اور شاعری کو غیر ضروری سمجھتے ہیں۔ یوں کہتے ہیں کہ شاعری کا ملکہ بے کار نہیں ہے لیکن ان کے خیال میں شاعری محض تفریح طبع کا ذریعہ ہے۔ شاعری کوئی دلچسپ کھیل نہیں، وہ تو انسان کی بہترین دماغی تحریکات کا آئینہ ہے۔ اس سے کامل سکون، ایک ابدی سرور ملتا ہے جو اور کسی چیز سے نہیں ملتا اور نہ مل سکتا ہے۔ یہ بہترین فن ہے جس کی برابری کوئی دوسرا فن نہیں کرسکتا ہے۔ اس کا مقام سائنس اور فلسفہ سے بھی بلند ہے بعض نقاد تو یہاں تک کہتے ہیں کہ مستقبل میں مذہب کی جگہ لے لیگی۔ افسوس ہے تو یہیں کہ آج بھی یہ کہنے کی ضرورت ہوتی ہے کہ شاعری تفنن طبع کا ذریعہ نہیں۔ اس کے آئینہ میں مادّی اور روحانی دنیا اور اس دنیا کے بنیادی اور پائیدار قوانین کا صاف، مکمل اور پرسکون عکس ملتا ہے حقیقت اور اس کی پراسرار کارفرمائیاں اسی آئینہ میں اپنی جھلک دکھاتی ہیں۔ اس نقطۂ نظر کی حالی کو خبر نہ تھی وہ شعر وشاعری کی اہمیت اور قدر وقیمت سے واقف نہ تھے اسی لئے دوسروں کو ان چیزوں سے آگاہ کرنا ان کے بس کی بات نہ تھی۔

جس شخص نے بھی حالی کا مقدمہ پڑھا ہے ان کے مسدس کا مطالعہ کیا ہے ان کی نظموں کا تاثیری اثر جذب کیا ہے کیا وہ کلیم الدین احمد کے ان گول مٹول جملوں سے مرعوب ہوسکتا ہے۔

شعر کی تاثیر کو ثابت کرنے کے لئے جو مثالیں حالی نے دیں کیا وہ آج بھی ضرب المثل نہیں ہیں۔ یہاں کون نا سمجھ ہے ذیل کی عبارت پڑھ کر فیصلہ کیا جاسکتا ہے۔

''شعر کی تاثیر کو ثابت کرنے کے لئے وہ بہت سی مثالیں بھی دیتے ہیں۔ چھ مثالوں سے ان کی نا سمجھی ظاہر ہوتی ہے لیکن اس نا سمجھی سے قطع نظر یہ حقیقت روشن ہو جاتی ہے کہ جس تاثیر کا وہ ذکر کرتے ہیں وہ اہم نہیں۔ شعر کا مقصد جذبات کو بھڑکانا نہیں ہے۔ شاعری جذبات کی تعلیم وتربیت کرتی۔ انھیں برانگیختہ نہیں کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شاعری کا اثر ہنگامی نہیں پائیدار ہوتا ہے۔ اس سے ہماری روحانی، جذباتی اور جسمانی زندگی خوشگوار ہو جاتی ہے۔ اچھے شعر جذبات کو بھڑکاتے نہیں ہیں اور جو شعر جذبات کو بھڑکاتے ہیں وہ اچھے نہیں ہوتے ہیں۔ اصل یہ ہے کہ حالی کا معیار مادی ہے۔ وہ شعر کو زیادہ اہم نہیں سمجھتے ہیں۔ اس غلط فہمی کا سبب یہی مادی معیار ہے وہ شعر کی تاثیر اور اس کے فائدہ کو تسلیم کرتے ہیں۔ اس خوش فہمی کا سبب بھی یہی مادی معیار ہے۔

شعر کی ماہیت سے بھی وہی بے خبری ہے جو شعر کی اہمیت سے تھی۔ حالی صرف میکولے کا قول نقل کرتے ہیں۔ میکولے کی نقاد کی حیثیت سے کوئی وقعت نہیں۔ اس کے قول کی بھی کوئی خاص اہمیت نہیں میکولے کے خیال میں (اور یہ خیال بھی ماخوذ ہے) شاعری ایک قسم کی نقالی ہے۔ یہ نقالی فن مصوری یا نقاشی کے مقابلہ میں نامکمل ہے لیکن اس کی دنیا وسیع ہے۔ ''خصوصاً انسان کا بطون صرف شاعری ہی کی قلمرو ہے۔''

میکولے کا یہ قول بھی صحیح نہیں کہ ''نقالی فنی مصوری یا نقاشی کے مقابلہ میں نامکمل ہے۔'' اگر آنکھوں کی تسکین کو معیار سمجھا جائے تو اس قول میں صحت ہو سکتی ہے لیکن آنکھوں اور کانوں کی تسکین کو کامل تسکین نہیں سمجھ سکتے ہیں۔ یہ تسکین ادھوری سی ہوتی ہے۔ اس میں کچھ کمی محسوس ہوتی ہے۔ ہماری دماغی اور روحانی زندگی، ہمارے جذبات اور احساسات کو جو تسکین شاعری میں ملتی ہے، وہ کسی دوسرے فن لطیف میں نہیں ملتی اور نہ مل سکتی ہے۔ میکولے کو اس حقیقت کا احساس نہ تھا اور حالی میں بھی اس احساس کی کمی نظر آتی ہے۔

شاعری کیلئے جو شرطیں حالی ضروری سمجھتے ہیں وہ بھی سطحی اور کورانہ طور پر اخذ کی گئی ہیں۔ یہ شرطیں تین ہیں۔ تخیل، کائنات کا مطالعہ اور تفحص الفاظ۔

کلیم الدین احمد کولرج کے مقلد ہیں وہ میکولے کے قائل نہیں اس لئے تمام غصّہ بچارے حالی پر نکالتے ہیں۔ مغربی ناقدوں کے نظریات میں مشرقی نقاد کی طرح اختلاف رائے موجود ہے۔ تنقید کا کھیل دو اور دو چار نہیں ہوتا۔ اگر تخیل، کائنات کا مطالعہ اور تفحص الفاظ سطحی شرطیں ہیں تو پھر اصلی شرطیں کلیم الدین احمد کیوں بیان نہیں کرتے۔

''حالی نے مغرب سے استفادہ کیا۔ اس استفادے کا نتیجہ جو ہوا ظاہر ہے شاعر فطرت کی خصوصیات اور شاعری کی اہم صفات پر حالی کی پوری بحث پر مجموعی نظر ڈالتے ہوئے ہمیں یہ نتیجہ نکالنا پڑتا ہے کہ جتنی زیادہ یہ بحث اہم ہے حالی اتنے ہی زیادہ اس پر طبع آزمائی کیلئے نااہل ہیں۔ جن علوم کی قابلیت اور جن فطری صلاحیتوں کی اس سلسلہ میں ضرورت تھی وہ ان میں نہ تھیں۔ وہ ایک بحر بیکراں میں بے خطر کود پڑے ہیں اور ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں۔ مگر ان کا کود پڑنا اور ہاتھ پاؤں مارتے رہنا ہی اہم ہے ان کی تمام بحث کی یہ نوعیت ہے جیسے کہ کسی بڑی مکمل اور مربوط تصنیف میں سے کوئی طالب علم کوئی اِدھر کی اور کوئی اُدھر کی بات نوٹ کرے اور یہ سمجھے کہ وہ پوری کتاب پر حاوی ہو گیا۔''

افسوس یہ ہے کہ یہ حالی ہی تھے جنھوں نے اُردو ادب کو مغربی قدروں اور لٹریچر سے روشناس کروایا۔ اگر آزاد اور حالی نہ ہوتے تو کلیم الدین احمد کا وجود نہ ہوتا جنھیں یہ غصّہ ہے کہ حالی اس مغربی دریا میں کیوں اترے اور اگر اترے تھے کیوں نہ پورا دریا پیرا کی کی۔ حالی نے کہیں یہ بات بالواسطہ یا بلاواسطہ نہیں کہی کہ

انھیں نے مغربی لٹریچر پر عبور حاصل کیا وہ تو صرف مغربی قدروں کی نشان دہی اور مختصر تعارف کر کے چلے گئے۔ کلیم الدین احمد کہتے ہیں حالی فینسی اور امیجینیشن میں امتیاز نہیں کر سکتے لیکن جو تعریف انھوں نے لکھی ہے وہ بھی نامکمل اور ادھوری ہے۔ وہ کہتے ہیں اگر مقدمے کو خضرِ راہ سمجھیں تو ترقی ممکن نہیں۔

''افسوس کی بات ہے کہ آج جب لکھنے والوں کا مطمحِ نظر حالی کی طرح محدود نہیں جب وہ بہترین مغربی ادب۔ تنقیدی ادب سے واقفیت رکھتے ہیں۔ اس کے باوجود کسی نے بھی ''مقدمہ شعر وشاعری'' سے بہتر تنقیدی کارنامہ پیش نہیں کیا۔ یہ خیال ہے کہ ''مقدمہ شعر و شاعری'' اُردو میں بہترین تنقیدی کارنامہ ہے نہایت حوصلہ شکن ہے۔

حالی کے کلام کے تابوت پر کلیم الدین احمد نے آخری کیل یوں ماری۔

خیالات ماخوذ، واقفیت محدود، نظر سطحی، فہم وادراک معمولی غور وفکر ناکافی تمیز ادنیٰ دماغ وشخصیت اوسط یہ تھی حالی کی کل کائنات۔ ہم صرف یہی کہیں گے کہ تنقید نگاری کو جذباتی نہیں ہونا چاہیے ورنہ اس کی ناقدانہ رائے قبول نہیں ہوتی۔ کلیم الدین احمد کی رائے کو اکثر اس لیے پیش کرتے ہیں کہ ان تمام عیوب کے باوجود حالی عمدہ ترین تنقید نگاروں میں شمار کئے جاتے ہیں اور مقدمہ شعر و شاعری علمی تنقید کی پہلی معتبر کتاب سمجھی جاتی ہے۔ اگر مرغ یہ سمجھیں کہ اس کے ککڑکوں نہ کرنے سے سورج طلوع نہ ہوگا تو مرغ کی خوش فہمی ہے۔ اُردو تنقید کا کاروان اپنی ارتقائی منازل پر گامزن ہے۔

وارث علوی ''حالی مقدمہ اور ہم'' میں لکھتے ہیں۔ ''نقاد جب حوالداروں کی طرح بات کرنا شروع کرتا ہے تو اس کا طرزِ گفتگو بھی کتنا غیر شریفانہ بن جاتا ہے۔ جوشِ تنقید میں انھیں یہ تک خیال نہیں رہتا کہ حالی جیسے نقاد پر قلم اٹھاتے وقت ہمیں آداب گفتگو کی پاسداری کرنی پڑتی ہے۔ حوالداری سے میرا کیا مطلب ہے اسے سمجھنے کے لئے محمد احسن فاروقی کے یہ جملے دیکھئے جو ان کی مقدمہ پر تنقید سے جستہ جستہ انتخاب کئے گئے ہیں۔

''ایسی باتیں پڑھ کر تو یہ کہنے کو جی چاہتا ہے کہ ایسا شخص کسی طرح شاعری کرنے اور شاعری پر رائے دینے کا اہل ہی نہیں ہوسکتا۔''

''اس اخلاق کی وکالت میں انھوں نے بڑے دھوکے کھائے ہیں اور تنقید نگاری کی بہت ہی غلط مثالیں قائم کی ہیں۔ اس کی بدترین مثال مقدمہ کا وہ حصہ ہے، جس میں مراثی کی اخلاقی نوعیت کو واضح کیا گیا ہے۔''

''یہاں وہ تنقید نگاری کے نقطۂ نظر سے ایسا جرم کررہے ہیں جس کی تلافی نہیں ہوسکتی۔''

''یہاں یہ معلوم ہوتا ہے کہ کم علم کس قدر پُر خطر ہوسکتا ہے۔''

''جتنی زیادہ یہ بحث اہم ہے، حالی اتنے ہی زیادہ اس پر طبع آزمائی کے لئے نااہل ہیں۔''

اگر احسن فاروقی مقدمہ کو ذرا غور سے پڑھتے تو حالی کا اسلوب نگارش انھیں آدابِ تنقید بھی سکھاتا۔ اس طرح کا طرزِ بیان صرف فاروقی تک محدود نہیں بلکہ کلیم الدین احمد کہیں مقدمے کی تعریف کرتے ہوئے حالی کی نثر کے بارے میں اُسے انفرادی خصوصیتیں عطا کرتے ہیں کہ حالی نے صاف اور سادہ طرز ایجاد کی لیکن اس طرز میں بے رنگی نہیں پھسپھا پن نہیں اس میں ایک لطافت ہے ایک جاذبیت ہے ایک رنگینی ہے اور یہ تنقیدی مسئلوں پر بحث کرنے کے لئے موزوں بھی ہے۔''

پھر حالی کی تنقید کے ہر جملے کو مغربی ترازو پر تولتے ہیں اور اس میں جو کچھ کم وکسر ہے اُسی کو سب کچھ بتا کر فتوے صادر کرتے ہیں۔ کلیم الدین کا فیصلہ سنئے'' خیالات ماخوذ، واقفیت محدود، نظر سطحی، ادراک معمولی غور وفکر ناکافی تمیز ادنیٰ دماغ وشخصیت اوسط یہ تھی حالی کی کل کائنات۔''

وحید قریشی لکھتے ہیں:

''ادبی مسائل میں جہاں کہیں بھی دو بزرگوں میں اختلاف کا موقعہ آیا حالی اپنے اعتدال کا ترازو لے کر آگئے۔ حالی کی دکان داری کا یہ انداز ان کی صلح جو طبیعت کا ترجمان اور ان کی شخصیت پرستی کا آئینہ دار ہے۔ لیکن ان ہی دوراہوں پر ان کا تنقیدی نظام متزلزل نظر آتا ہے۔ شاعری شائستگی کے زمانے میں ترقی پاتی ہے یا ناشائستگی کے زمانہ میں اس پر انہوں نے مقدمے میں طویل بحث کی ہے۔ مشکل یہ تھی کہ ہر دو آرا مغرب سے آئی تھیں۔ جس کی پیروی کی انھوں نے قسم کھا رکھی تھی۔ مرحلہ نازک تھا لیکن فیصلہ قطعی، اس لئے دونوں کو خوش کرنے کے خیال سے اور احترام کی خاطر انہوں نے درمیان کی راہ نکالی کہ پہلی بات بھی کسی قدر صحیح ہے اور دوسری بھی۔''

''چہارسُو''

مکالمہ

(روحِ اقبالؒ سے)

انتخاب: **آپا جمیلہ شبنم** (اسلام آباد)

دل کے ٹیلی فون پر اک آسمانی کال سے
اتفاقاً ہو گئی ''گل'' حضرتِ اقبال سے

آپ نے فرمایا ''کیا ارضِ وطن کا حال ہے؟''
عرض کی ''فی الحال تو ہڑ بونگ ہے، ہڑتال ہے''

پوچھا ''وہ برتری جو دی تھی شہپر شاہین کو
عرض کی ''شاہین ہے اب امریکنوں کی ''جبین'' میں''

بولے ''ملی اتحاد اور نظم اور جہد یقین''
عرض کی ''علامہ صاحب اتنی چیزیں ہیں نہیں''

بولے سنتا ہوں ''کہ جرنیلوں سے ہے یاری بہت''
عرض کی ''جمہوریت میں بھی تھی ''خرکاری'' بہت''

بولے ''میں نے حُریتِ آئین کی تلقین کی''
عرض کی ''ہم نے اُس شے کی بڑی توہین کی''

بولے ''ماشاء اللہ اب افراط مال و زر میں ہے''
عرض کی ''ہے تو مگر۔ بس لیڈروں کے گھر میں ہے''

بولے ''میں جو فقیرانہ خودی تعلیم کی''
عرض کی ''اُس میں ضیا نے آٹھویں ترمیم کی''

بولے ''سنتا ہوں مسلمان نامساواتی ہوا''
عرض کی ''سر! آپ کے بعد اور طبقاتی ہوا''

بولے ''صد افسوس وہ ضرب کلیمانہ نہیں''
عرض کی ''مرشد ہمیں اب جنگ پر جانا نہیں''

''مردِ مومن'' کا بھی پوچھا سبز ہے یا زرد ہے
عرض کی ''امریکہ کے نزدیک ''دہشت گرد'' ہے''

پوچھا ''پین اسلام ازم'' کے قافلے کی پیش رفت
عرض کی ''ہے گشت پر یہ اونٹ کچھ پٹرول مست''

پوچھا ''کیا آزاد ہیں اہلِ قلم ۔۔ ارباب تن''
عرض کی ''بولا نہیں وہ آپ کا مرغِ چمن''

پوچھا ''جذبہ جو جمال الدین افغانی میں تھا''
عرض کی ''کچھ دن تو دیکھا سندھ کے پانی میں تھا''

پوچھا ''کیا ہیں عالمِ اسلام کے شام و سحر''
عرض کی ''سارا علاقہ مضطرب تا کا شغر''

پوچھا ''ٹھوکریں ہونگیں چوٹیاں افلاک کی''
عرض کی ''اب تو بس اپنی قبا ہی چاک کی''

منکشف کرنے ہی والے تھے وہ کچھ اسرارِ دین
''گفتگو'' میں دفعتاً گھس آیا اک ایف سکسٹین ☆

کہہ گئے ایک بات لیکن عارفانہ شان سے
کوئی انساں کم نہیں ہے دوسرے انسان سے

عرض کی ''میرے لیے بھی ایک پسندیدہ سُخن''
بولے ''تو میرا نہیں بنتا نہ بن۔ اپنا تو بن''

○

☆ اسلام آباد کے پوش علاقے ایف سکس کا رہنے والا

ایک صدی کا قصہ

دیو آنند

دیپک کنول (ممبئی، بھارت)

کئی دہائیوں تک فلمی دنیا پر تین اداکاروں نے راج کیا۔تینوں نے اپنے لئے الگ الگ کردار چن لئے تھے۔دلیپ کمار کو Tragedy King یعنی بادشاہ الم کہا جاتا تھا۔وہ المیہ رول کرنے میں اسقدر ماہر تھا کہ ناظرین اسکی فلمیں دیکھ کر رو پڑتے تھے۔راجکپور اپنے چلبلے پن اور اپنی مذاقیہ اداؤں سے جانے جاتے تھے۔اُسے لوگ بالی وڑ کا چارلی چیپلن کہا کرتے تھے۔تیسرا دیو آنند تھا جو اپنی رومانٹک اداؤں سے حسیناؤں کے دلوں پر چھا جاتا تھا۔وہ بہت ہی خوبصورت تھا۔قدرت نے جیسے اُسے بڑی نزاکت سے تراشا تھا۔فلمی شائقین نے اُسے ایک رومانٹک ہیرو کے طور پر ہاتھوں ہاتھ لیا۔اُسنے جتنی بھی فلمیں کیں وہ تمامتر رومانٹک فلمیں تھیں۔

دیو آنند جس کا پورا نام دھرم دیو پشاوری مل آنند تھا 26 ستمبر 1923 کو ایک جانے مانے وکیل پشاوری لال آنند کے گھر پیدا ہوا۔تب یہ لوگ گورداسپور کے گاؤں شکر گڈھ میں رہتے تھے جو کہ تحصیل سیالکوٹ میں پڑھتا تھا۔پشاوری لال آنند کافی پڑھا لکھا آدمی تھا۔اُسے اُردو کے علاوہ فارسی اور عربی پر بھی دسترس حاصل تھی۔کہا جاتا ہے کہ پشاوری لال آنند اپنے گاؤں کے ان پڑھ مسلمانوں کو قران کے آیات اور اُنکا ترجمہ پڑھ کر سناتا تھا۔پشاوری لال کے کل ملا کر چار بچے تھے۔تین بیٹے اور ایک بیٹی۔سب سے بڑا بھائی من موہن آنند تھا جو اپنے باپ ہی کی طرح گورداسپور کا ایک جانا مانا وکیل تھا۔اسکے بعد چیتن آنند تھا۔پھر دیو آنند۔اُس کے بعد چھوٹا بھائی وجے آنند تھا اور ایک چھوٹی بہن شیلا کانتا جو کہ مشہور اداکار اور ہدایت کار شیکھر کپور کی ماں ہے۔دیو آنند نے اپنے بچپن کے ایام گورداسپور کے ایک قریبی گاؤں گھروٹا میں گزارے۔وہ بہت ہی شرمیلا بچہ تھا۔اُسکے والد نے اُسکی شرم وجھجک دور کرنے کے لئے اُسے گرلز اسکول میں بھرتی کرایا۔دیو آنند کے نین نقش اتنے نیارے تھے کہ کوئی بھی اُس کی طرف کھینچا چلا آتا تھا۔گرلز اسکول میں لڑکیاں اُسے ایک خوبصورت کھلونا سمجھ کر اُسکے پیچھے ہولیتی تھیں۔وہ لڑکیوں سے بھاگ کر اپنی ماں کے پہلو میں جا کر چھپ جاتا تھا۔اسنے میٹرک تک کی پڑھائی ڈلہوزی کے سیکرڈ ہارٹ اسکول سے پوری کی۔بعد میں اسے مزید پڑھائی کے لئے دھرمسالہ کے ایک کالج میں داخلہ ملا۔کالج کی پڑھائی پوری کرنے کے بعد اسنے انگریزی لٹریچر میں گریجویشن گورنمنٹ کالج لاہور سے پورا کیا۔ایک دن کالج کی ایک لڑکی نے اُسے یہ احساس دلایا کہ اُسے قدرت نے بے پایاں خوبصورتی سے نوازا ہے۔وہ تو اُسکی صورت پر مرمٹی تھی اور وہ ساری زندگی اُسکے ساتھ گزارنا چاہتی تھی۔کہا جاتا ہے کہ دیو آنند ایک لڑکی کے منہ سے اتنی ساری تعریفیں سن کر باتھ روم میں چلا گیا اور بار بار اپنا منہ آئینے میں دیکھنے لگا۔

1940 میں وہ روزگار کی تلاش میں لاہور سے بمبئی چلا آیا۔کئی ہفتوں تک بمبئی شہر کی دھول پھانکنے اور جوتیاں توڑنے کے بعد اسے چرچ گیٹ بمبئی کے ملٹری سنسر آفس میں 165 روپیہ ماہانہ پر ڈاک سنسر کرنے کی نوکری مل گئی۔اسے یہ نوکری زیادہ دنوں تک راس نہیں آئی۔اسنے یہ نوکری چھوڑ کر ایک چارٹرڈ اکاونٹنٹ کے یہاں پچاسی روپے کی نوکری کی۔اصل میں اسکے من میں ایکٹر بننے کی اُمنگ اندر ہی اندر انگڑائی لے رہی تھی۔وہ بہت ہی خوبرو تھا۔اونچا قد چھریرا بدن۔خمار آگیں آنکھیں معصوم سا چہرہ۔وہ اس خوابوں کے شہر میں بہت سارے خواب لے کر آیا تھا اور وہ ان خوابوں کی تعبیر پانا چاہتا تھا۔انہی دنوں دیو آنند نے اشوک کمار کی فلم ''اچھوت کنیا'' اور ''قسمت'' دیکھی تھی۔ان دو فلموں نے اس کے شوق کو جلا بخشی۔اسکا بڑا بھائی چیتن آنند بھی بمبئی پہونچ چکا تھا۔وہ اپٹا یعنی انڈین پیپولز تھیٹر ایسوسیشن کا روح رواں تھا۔کچھ دن دیو نے بھی اپنے بڑے بھائی کے ساتھ کام کیا مگر یہاں بھی اسے ٹھہراؤ نہیں ملا۔اسنے ایک بار پھر خاک چھاننے کا فیصلہ کرلیا۔

بہت جلد اسے احساس ہوا کہ اسکے پاس اب کچھ بھی نہیں ہے۔نہ سر پر چھت ہے نہ جیب میں پیسے ہیں۔وہ چرچ گیٹ کے باہر بیٹھا سوچ رہا تھا کہ پیٹ کی آگ کیسے بجھائی جائے تبھی اسے یاد آیا کہ اس کے پاس ایک پرانی ڈاک ٹکٹ بچی ہے۔اسے ڈاک ٹکٹیں جمع کرنے کا بڑا شوق تھا۔وہ جونہی وہ ٹکٹ بیچنے کے لئے اُٹھا تبھی اُسکی نظر ایک شخص پر پڑی جو کہ اُسکا دوست تھا۔دونوں دوست بیچ سڑک میں ایک دوسرے کے گلے ملے۔وہ اُسے اپنے ساتھ اپنے ٹھکانے پر لے آیا اور یہاں سے اُسکی جدوجہد کا دوسرا دور شروع ہوا۔وہ دن بھر اسٹوڈیوز کے چکر لگاتا رہتا تھا۔ایک دن وہ اپنی سوئی ہوئی قسمت سے ٹکرا گیا۔جس شخص کے دفتر میں وہ زبردستی داخل ہوا تھا وہ اور کوئی نہیں بلکہ پربھات اسٹوڈیو کا مالک بابورائے پائے تھا۔دیو آنند نے اپنے ایک انٹرویو میں کہا کہ وہ مجھے ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا۔اسنے اسی وقت اپنے دل میں یہ عہد کیا تھا کہ وہ اس لڑکے کو ہیرو بنا کر ہی رہے گا۔بعد میں اپنے ایک انٹرویو میں بابورائے پائے نے کہا کہ مجھے اس لڑکے کی خوبصورت آنکھوں اور اُسکی معصوم سی مسکراہٹ اور اُسکی خوداعتمادی نے بڑا متاثر کر دیا۔اس واقعے کے کچھ دن بعد ہی اسے پربھات فلمز کی طرف سے بلاوا آگیا۔اسے آڈیشن کے لئے پونے بلایا گیا تھا۔پربھات فلمز کی فلم ''ہم ایک ہیں'' بننے جا رہی تھی جس کے لئے اداکاروں کا انتخاب کیا جا رہا تھا۔اس فلم کے ڈائرکٹر پی ایل سنتوشی تھے۔سنتوشی نے دیو آنند کو آڈیشن میں پاس کیا اور اس طرح دیو آنند فلم کا ہیرو بن گیا۔اس فلم میں گورودت بطور اسسٹنٹ کام کر رہا تھا۔دونوں کی دوستی کی ابتدا بھی ایک دلچسپ واقعے سے ہوئی۔ہوا یوں کہ کمپنی کا دھوبی ایک

ہی تھا جو سارے اسٹاف کے کپڑے اکیلے دھوتا تھا۔ایک دن اس سے گورودت کی قمیص کھوگئی۔گورودت کے پاس دوسری قمیص نہیں تھی اسلئے وہ دھوبی کے سر پرسوار ہوگیا۔دھوبی نے اسے اٹھا کر کسی اور کی قمیص دیکر شانت کردیا۔جب گورودت یہ قمیص پہن کر سیٹ پر پہونچ گیا تو دیوآنند قمیص دیکھ کر چونک پڑا۔اسنے گورودت سے پوچھا کہ کیا یہ اسکی قمیص ہے تو گورودت نے نفی میں سر ہلایا اور پھر اسے ساری سچائی بتادی۔ پتا چلا کہ یہ قمیص دیوآنند کی تھی جو دھوبی نے گورودت کو پہننے کو دی تھی۔ بعد میں اس قمیص کی وجہ سے دونوں گہرے دوست بن گئے۔ دونوں نے ایک دوسرے سے یہ وعدہ کیا کہ جو جب بھی اپنی کمپنی کھولے گا وہ ایک دوسرے کو چانس دے گا۔دیو کھولے گا تو گورودت کو ڈائرکٹر کا چانس دے گا اور گورودت دیو کو ہیرو کا چانس دے گا۔

''ہم ایک ہیں'' کچھ خاص نہیں چلی البتہ دیوآنند کو فلمیں ملنے لگیں۔اسے تب یقین ہی نہیں آیا جب اسے ثریا کے ساتھ فلم ''ودیا'' میں کام کرنے کا چانس ملا ثریا اسوقت کی ٹاپ کی ہیروئن تھی۔ کہا جاتا ہے کہ وہ سب سے مہنگی ہیروئن تھی۔ جب کہ دیو ایک نوخیز ایکٹر تھا جس نے اب تک اپنی کوئی پہچان نہ بنائی تھی۔ایسے حالات میں اتنی بڑی ہیروئن کے ساتھ کام کرنا کوئی معمولی بات نہ تھی۔ دیوآنند اپنی قسمت پر ناز کرنے لگا۔مگر ساتھ ہی دل گھبرا بھی رہا تھا۔ پتا نہیں ثریا کا برتاو اسکے تئیں کیسا ہوگا۔شروع شروع میں دیوآنند ثریا سے دبا دبا سا رہتا تھا، دھیرے دھیرے وہ ثریا کے قریب آنیکی کوشش کرنے لگا۔وہ جب بھی اسکے قریب ہوتا تھا تو وہ اسکی تعریفوں کے پل باندھنے لگتا تھا۔کبھی اسکی اداکاری تو کبھی اسکی گلوکاری کو لیکر وہ آسمان زمین کے قلابے ملانے لگتا تھا۔اس میں شک نہیں کہ ثریا بہترین اداکارہ کے ساتھ ساتھ ایک بہترین گلوکارہ بھی تھی۔نورجہاں کے پاکستان منتقل ہونے سے ثریا کی مقبولیت میں اور بھی اضافہ ہوگیا تھا۔فلمی دنیا کے بہترین موسیقار ثریا کے ساتھ کام کرنے کے لئے بے تاب رہتے تھے۔ثریا جب دیو کے منہ سے اپنی تعریفیں سنتی تھی تو وہ خوشی سے پھولے نہیں سماتی تھی۔اب وہ بھی دیو کی تعریفیں کرنے لگی تھی۔ ایک دن کی بات ہے کہ وہ فلم ''ودیا'' کی شوٹنگ ایک جھیل کے پاس کررہے تھے۔ایک سین بوٹ میں فلمانا تھا۔جب دونوں ایک بوٹ میں سوار ہوگئے تو بوٹ جھیل کے بیچوں بیچ اچانک اُلٹ گئی اور وہ دونوں پانی میں گھر گئے۔ دیو کو تیرنا آتا تھا اسلئے وہ بوٹ سیدھا کرکے اس پر پھر سے سوار ہوا جب کہ ثریا بڑی بدحواسی کے عالم میں ادھر ادھر ہاتھ پاؤں مار رہی تھی کیونکہ ثریا کو تیرنا نہیں آتا تھا۔وہ جب پانی میں ڈوبنے لگی تب جاکے دیو کو احساس ہوا کہ وہ ڈوب رہی ہے۔ وہ اسے بچانے کے لئے پانی میں کودا اور اپنی جان کی پرواہ نہ کرکے اسنے ثریا کو بچالیا۔

ثریا نے دیو سے کہا۔''اگر تم مجھے نہ بچاتے تو میں مرگئی ہوتی'' تو دیو کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔''اس سے پہلے تو میں مرگیا ہوتا'' اس ایک جملے نے ثریا کی زندگی ہی بدل کے رکھ دی۔ وہ اس دبلے پتلے، تیکھے نین نقوش والے شرمیلے سے نوجوان کی محبت میں گرفتار ہوگئی۔ثریا جیسے دیو کی زندگی میں خوشیوں کی سوغات لے کر آگئی۔اشوک کمار فلم ''ضدی'' بنا رہے تھے جس کے ہدایت کار شاہد لطیف تھے۔ایک دن اشوک کمار نے دیوآنند کو بمبئی ٹاکیز کے اسٹوڈیو میں گھومتے ہوئے دیکھا۔اسے یہ نوجوان بھا گیا اسنے شاہد لطیف سے کہا کہ وہ دیو کو اس کے پاس لے کر آجائے۔شاہد لطیف دیوآنند کو اشوک کمار کے پاس لے آیا۔جب اسنے اپنے آئیڈیل اشوک کمار کو اپنے سامنے دیکھا تو اسے یقین ہی نہیں آیا۔اشوک کمار نے اسے فلم ''ضدی'' میں کام کرنے کی پیشکش کی جو دیو نے بنا کسی تامل کے قبول کی۔''ضدی'' 1948 میں ریلیز ہوئی اور بیحد کامیاب رہی۔ یہ پہلی فلم ہے جسمیں لتا اور کشور کمار نے پہلی مرتبہ ایک ساتھ ایک دوگانا گایا تھا ''یہ کون آیا کر کے سولہ سنگھار''

''ضدی'' نے دیو کو مقبولیت بخشی۔اب وہ ایک گم نام اداکار نہ تھا۔فلم بین اسکی من موہنی صورت پر فریفتہ ہوگئے تھے۔''ضدی'' کی کامیابی کے ساتھ ہی دیو آنند نے اپنے دیرینہ خواب کو عملی جامہ پہنایا۔اسنے اپنے بڑے بھائی کے ساتھ مل کر اپنی فلم کمپنی ''نوکیتن فلمز'' کی بنیاد رکھی۔''ثریا اور دیو ایک کے بعد ایک فلم سائن کرتے جارہے تھے۔1949 میں ان دونوں کی دو فلمیں ریلیز ہوئیں۔پہلی فلم ''جیت'' تھی اور دوسری فلم ''شاعر'' تھی۔ان دو فلموں کے ساتھ وہ ایک دوسرے کے اور قریب آتے گئے۔ دیو اور ثریا اس حد تک ایک دوسرے کو چاہنے لگے تھے کہ وہ سیٹ پر ہوں یا سیٹ سے باہر ہمیشہ ایک دوسرے کی آنکھوں میں ڈوبے رہتے تھے۔دیو نے اپنے ایک انٹرویو میں کہا کہ تھا کہ جب وہ اور ثریا اکیلے بیٹھے ہوتے تھے تو ثریا اُسکے لئے اپنے گانے گنگنایا کرتی تھی اور وہ ان گانوں کے سوز و گداز میں کہیں کھو کے رہ جاتا تھا اسی بیچ نوکیتن نے اپنی پہلی فلم بنانے کا فیصلہ کیا۔اس فلم کا نام تھا ''افسر''۔اس فلم کے مکھیہ اداکار دیو اور ثریا تھے جب کہ اسکے ہدایت کار چیتن آنند تھا۔اُن کے پیار کو اس فلم سے جلا ملی۔اس فلم کی فلمبندی کے دوران دیوآنند نے تین ہزار روپے میں ایک شادی کی انگوٹھی خریدی جو اُسنے ثریا کو پیش کی۔ثریا نے یہ انگوٹھی بخوشی قبول کی۔کہتے ہیں نا عشق اور مشک چھپائے نہیں چھپتے۔وہ پیار کے معاملے میں جتنی بھی رازداری برتتے جارہے تھے اتنے ہی انکے عشق کے چرچے پھیلتے چلے گئے۔اُنکے رومانس کی خبریں فلمی پرچوں کی شہہ سرخیاں بننے لگیں۔1950 میں انکی دو اور فلمیں ریلیز ہوئیں۔پہلی فلم ''افسر'' تھی جس کے ایک گانے نے سینما پریمیوں کو ثریا کا اور زیادہ دیوانہ بنا دیا تھا۔ وہ گانا تھا۔ایس ڈی برمن کا ترتیب دیا ہوا۔''من مور ہوا متوالا، یہ کس نے جادو ڈالا۔ارے کس نے جادو ڈالا''۔

دیو اور ثریا کے رومانس نے پورے دیش میں ہلچل مچادی تھی۔یہ خبر جب ثریا کے گھر والوں کے کانوں تک پہونچ گئی تو ایسا لگا جیسے گھر میں بھونچال آگیا ہو۔ثریا کے گھر والوں میں اسکی ماں، اسکے ماموں اور اسکی نانی تھی۔ ماں کی تو کچھ چلتی نہیں تھی۔ثریا کی زندگی پر ماموں اور نانی اس طرح حاوی ہوچکے تھے کہ

اُنکی مرضی کے بنا ایک پتا تک نہیں ہلتا تھا۔فلموں سے متعلق وہی سارے فیصلے لیتے تھے۔نانی ایک قدامت پسند مسلم خاتون تھی۔وہ ان دونوں کے ملن کے خلاف تھی۔وجہ صاف تھی۔ثریا مسلم تھی جب کہ دیو ہندو تھا۔نانی نے ثریا کو یہ کہہ کر ڈرا کے رکھا تھا کہ اگر اسنے دیو سے شادی کرنے کی بھول کی تو ملک میں ہندو مسلم دنگے پھوٹ جائیں گے۔ایکطرف نانی اُسے دنگوں کا ڈر دکھاتی رہتی تھی تو دوسری طرف اسکا ماموں دیو کو جان سے مارنے کی دھمکی دیکر اُسے خوفزدہ کرتا رہتا تھا۔ثریا دیو کو اسقدر ٹوٹ کر چاہتی تھی کہ وہ اُسے مرتے ہوئے دیکھ نہیں سکتی تھی۔ اسلئے وہ نانی اور کے اشاروں پر ناچتی رہتی تھی۔وہ کیا کرے اسے کچھ سوجھ نہیں رہا تھا۔ایکطرف دیو اسے کائر اور بزدل ہونے کے طعنے مارتا تھا تو دوسری طرف نانی نے اسکے پر پوری طرح سے کتر کے رکھ دئے تھے۔اب نانی سیٹ پر خود موجود رہتی تھی۔کوئی بھی پیار و محبت کا سین فلمانا ہوتا تھا تو اگر دیو ثریا کو چھو بھی لیتا تھا تو نانی سیٹ پر ہنگامہ کھڑا کر دیتی تھی۔کئی مرتبہ اسنے شوٹنگ رکوائی۔ثریا کی ماں کو دیو پسند تھا مگر وہ دیو اور ثریا کے لئے کچھ نہیں کر سکتی تھی کیونکہ وہ اپنے آپ کو ماں اور بھائی کے سامنے لاچار پاتی تھی۔نانی اور ماموں نے ثریا اور دیو کے ملنے جلنے پر روک لگا دی تھی۔دیو اپنے پریم پتر اپنے کیمرہ مین دوست کے ہاتھ ثریا تک پہونچاتا تھا۔ایک دن نانی کو شک ہوا۔اُسکے بعد کیمرہ مین کی آوا جاوی پر بھی پابندی عائد کر دی گئی تھی۔

دیو ثریا سے ملنے کے لئے بن آب مچھلی کی طرح تڑپ رہا تھا۔وہ ثریا سے ملنے اُس کے گھر پر پہونچ جاتا تھا تو وہاں پر اسکی ملاقات ثریا سے نہیں بلکہ ثریا کی نانی اور ماموں سے ہو جایا کرتی تھی جو کہ اسے دروازے سے ہی ڈانٹ ڈپٹ کر بھگا دیتے تھے۔وہ اپنا من مسوس کر رہ جاتا تھا۔جتنا دیو ثریا سے ملنے کے لئے تڑپ رہا تھا اس سے کہیں زیادہ ثریا اُس سے ملنے کے لئے تڑپ رہی تھی۔جب بھی دیو ثریا کے گھر میں فون کرتا تھا تو فون ہر مرتبہ بڑھیا ہی اٹھاتی تھی۔دیو کی آواز سن کر اسکے تن بدن میں آگ لگ جاتی تھی اور وہ دیو کو متنبہ کر دیتی تھی کہ وہ ثریا سے دور رہے نہیں تو وہ اسکے خلاف پولیس میں شکایت درج کرا دیں گے۔دیو ان دھمکیوں سے بھلا کہاں ڈرنے والا تھا۔ایک دن اتفاق سے فون ثریا کی ماں نے اٹھایا۔دیو نے ثریا سے ملنے کی خواہش ظاہر کی تو ثریا کی ماں نے اسے رات کے ساڑھے گیارہ بجے انکی بلڈنگ کے چھت پر ملنے کے لئے کہا۔جس بلڈنگ میں ثریا رہتی تھی وہ چھ مالہ عمارت تھی اور اسکے گراونڈ فلور پر ثریا اور اسکا پریوار رہتا تھا۔اسکی ماں نے اسے اسی بلڈنگ کے چھت پر ملنے کے لئے کہا تھا۔دیو کو لگا کہ یہ اسے پھانسنے کی کوئی چال ہے۔وہ شاید اسے گرفتار کروانا چاہتے ہیں پر وہ ڈرا نہیں ۔اسکا پیار تو سر چڑھ کے بول رہا تھا۔وہ بھلا کہاں رکنے والا تھا۔اسنے ملنے کا فیصلہ کر لیا۔اسکا ایک پنجابی دوست تھا جسکا نام تارا تھا اور جو بمبئ پولیس میں کام کرتا تھا۔وہ اسی کو ساتھ لے کے چلا۔تارا کے پاس ایک پستول ہمیشہ جیب میں رہتا تھا۔اسنے دو ٹارچ لے لئے۔ایک خود رکھا اور ایک دیو کو یہ کہہ کر تھما دیا کہ جب بھی اسے کچھ گڑ بڑ لگے تو وہ فوراً بیٹری آن کر دے وہ فوراً اسکی مدد کے لئے دوڑ پڑے گا۔

وہ حسب وعدہ چھت پر پہونچا۔چھت پر پہلے سے ہی ثریا کھڑی تھی۔دونوں ایک دوسرے سے گلے مل کر بہت دیر تک روئے اور پھر دیو نے ثریا سے کہا کہ اگر وہ اُس سے سچ مچ پیار کرتی ہے تو اُسے اسی وقت اُسکے ساتھ چلنا ہوگا۔آدھے گھنٹے کی اس ملاقات میں دیو نے پایا کہ ثریا اتنی کمزور اور لاچار ہے کہ وہ اس گھیرے کو توڑ کر باہر نکلنے کی ہمت ہی نہیں کر سکتی۔اسی وقت دیو نے فیصلہ لیا کہ یا تو وہ اس کے ساتھ ابھی چل کر شادی کرے یا پھر دونوں کبھی نہ ملیں۔ثریا نانی اور ماموں کے نرغے سے باہر نہ نکل پائی اور اسطرح وہ دونوں ایک دوسرے سے الگ ہو گئے۔جب دیو ثریا سے بچھڑ کے گھر پہونچا تو اسکا دل ٹوٹ چکا تھا۔چیتن آنند کو دیو کے اس معاشقے کا پوری طرح سے علم تھا۔جب دیو چیتن کے پاس پہونچا تو وہ اسکے شانے پر سر رکھ کر بچے کی مانند پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔

1951 دیو آنند کی زندگی کا سب سے شاندار سال تھا۔اسی سال اسکے بینر ''نوکیتن فلمز'' کی دوسری فلم ''بازی'' ریلیز ہوئی جسے دیو کے دیرینہ دوست گورو دت نے ڈائرکٹ کیا تھا۔اس فلم میں دیو آنند مرکزی کردار میں تھا جب کہ اس مد مقابل شملہ کی ایک دبلی پتلی سی حسینہ مونا سنگھ (جسکا فلمی نام کلپنا کارتک رکھا گیا) کو پیش کیا گیا۔گیتا بالی ایک ویمپ کے رول میں تھی۔اُسنے اس کردار میں غضب ڈھایا تھا۔اس فلم کا سنگیت ایس ڈی برمن نے ترتیب دیا تھا۔ اس فلم نے ہر طرف کامیابی کے جھنڈے گاڑ دئے۔اسی سال دیو اور ثریا کی دو اور فلمیں ریلیز ہوئیں۔''دوستارے'' اور ''صنم''۔ان دو فلموں کے بعد وہ پھر کبھی ساتھ کام نہ کر سکے۔

دیو ثریا کی یادوں کی تمام تر زنجیروں سے اپنے آپ کو آزاد کرنا چاہتا تھا اسلئے وہ رات دن اپنے آپ کو کام میں مصروف رکھتا تھا۔''بازی'' کی کامیابی کو دیکھ کر کئی سارے پرڈیوسرس نے دیو اور کلپنا کارتک کو اپنی اپنی فلم کے لئے سائن کیا تھا۔دیو نے کلپنا کارتک کے ساتھ کئی ساری فلمیں کیں جن میں سے بیشتر بیحد کامیاب رہیں۔ان میں ''آندھیاں''''ہاوس نمبر 44''''نو دو گیارہ''''ٹیکسی ڈرائیور''۔دیو آنند کامیابی کی معراج کو پا چکا تھا۔وہ لاکھوں کروڑوں فلمی شائقین کے دلوں کی دھڑکن بن چکا تھا۔اسکی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ لوگ اُسکے بالوں کا اسٹائل کی نقل کرتے تھے۔اُسکی طرح بات کرتے تھے۔اسی کی طرح چلتے تھے۔فلم ''ٹیکسی ڈرائیور'' کی فلمبندی کے دوران اسے کلپنا کارتک سے پیار ہو گیا۔ایک دن اسنے کلپنا سے اپنے پیار کا اظہار کر دیا اور دوسرے دن انہوں نے شوٹنگ کے دوران ہی شادی کر ڈالی۔کسی کو کانوں کان خبر تک نہ ہوئی سوائے انکے کیمرہ مین کے جس نے دیو کی انگلی میں شادی کی انگوٹھی دیکھی تو دیو نے فوراً جا کر اسکا منہ بند کر لیا۔

دیو آنند کئی دہائی تک باکس آفس کی کھڑکی پر راج کرتا رہا۔وہ ہر فلم

کے ساتھ کامیابی کی نئی منزلوں کو چھوتا جا رہا تھا۔ادھر دیو پر قسمت کی دیوی مسکرا رہی تھی ادھر ثریا کا جادو دم توڑ رہا تھا۔لتا منگیشکر کے آنے سے ثریا کو اب کام ملنا کم ہوگیا تھا۔دیو سے الگ ہونے کے بعد اسکی دو تین فلمیں ہی ریلیز ہوئیں جو زیادہ چل نہ سکیں ادھر دیو کی ہر جگہ طوطی بولتی تھی۔اُسکی فلم کا اعلان ہوتے ہی ڈسٹری بیوٹر اُس فلم کے نمائشی حقوق خرید لیتے تھے۔

کہا جاتا ہے کہ جب دیو اور ثریا عشق کے دور سے گزر رہے تھے تو وہ گھنٹوں اکیلے بیٹھے رہتے۔ثریا اپنے پیار کا اظہار اپنے گانوں کے زریعے کرتی تھی ۔دیو اپنی محبوبہ کی آواز سے تروتازہ ہو جایا کرتا تھا۔یہ دونوں پریمی دنیا و مافیہا کو بھول کر کسی اور دنیا میں پہونچ جاتے تھے جہاں نہ کوئی دین دھرم کی بندش تھی اور نہ کسی سماج کی پرواہ۔ایک دن ثریا نے دیو سے کہا کہ جب انکا پہلا بچہ ہوگا چاہے وہ لڑکا ہو یا لڑکی وہ اسکا نام دیو یا نہ رکھیں گے۔برسوں بعد جب یہ دونوں ایک فلمی تقریب میں ملے تو ادھر ادھر کی باتوں کے بعد ثریا نے دیو سے اُسکے بچوں کے نام پوچھے تو دیو نے ثریا سے کہا کہ اُسے تو بچوں کے نام یاد ہونے چاہیں۔اُسنے اُسے یاد دلایا کہ اُسنے اپنی بیٹی کا نام دیویانا ہی رکھا ہے جو اُس نے کبھی تجویز کیا تھا۔یہ تھی اُس پیار کی شدت اور معصومیت۔افسوس کہ اُنکا پیار تشنہ طلب ہی رہا۔دیو آنند نے اپنا گھر سنسار بسا لیا جب کہ ثریا نے تاعمر کنواری رہنے کا فیصلہ کیا۔اُسنے اپنے عہد کو پوری طرح نبھایا۔جب اُس کا انتقال ہوا تو وہ اکیلی تھی۔ایکدم اکیلی۔

دیو آنند نے اپنے زمانے کی ہر ٹاپ کلاس ہیروئن کے ساتھ کام کیا۔کامنی کوشل سے لے کے تبو تک۔اُسنے چیتن آنند کی کھوج کلپنا کارتک کے ساتھ کئی ساری فلمیں کیں جن میں پہلی فلم ''بازی'' تھی۔''بازی'' کی کامیابی کے بعد اُنہوں نے ایک ساتھ کئی اور کامیاب فلمیں کیں جن میں ''آندھیاں''،''ٹیکسی ڈرائیور''،''گھر نمبر 44''اور''نو دو گیارہ'' قابل زکر ہیں۔کلپنا سے شادی کرنے کے بعد کلپنا کارتک نے فلمی دنیا کو الوداع کہا اور وہ دیو کی ازدواجی زندگی سنوارنے میں لگ گئی۔کلپنا کارتک کے بعد نوتن کے ساتھ دیو کی جوڑی کافی کامیاب رہی۔ان دونوں نے ایک ساتھ کئی کامیاب فلمیں کیں جیسے''پینگ گیسٹ''،''پاکٹ مار''،''منزل''اور''تیرے گھر کے سامنے'' یہ ان دونوں کی کچھ ایسی یادگار فلمیں ہیں جن کی مقبولیت میں چھ دہائیاں گزر جانے کے باوجود کوئی کمی نہیں آئی۔ان فلموں کی مقبولیت میں دیو کے اسٹائل،نوتن کی اچھوتی اداکاری اور موسیقی کا بہت بڑا ہاتھ رہا ہے۔دیو کا اپنا ایک اسٹائل تھا جسنے فلم بینوں کو دیوانہ بنا دیا تھا۔دیو نے وحیدہ رحمان کے ساتھ کئی فلمیں کیں۔پہلی فلم ''سی آئی ڈی'' میں اُسے دیو کے مدمقابل پیش کیا گیا تھا۔اس فلم میں اُسکا رول ایک ویمپ کا تھا جب کہ اس فلم کی ہیروئن شکیلہ تھی۔پھر ایک زمانہ ایسا بھی آگیا جب وحیدہ رحمان کی گنتی ٹاپ کی ہیروئنوں میں ہونے لگی۔دیو کے ساتھ اُسنے ''سولہواں سال'' اُسکے بعد نوکیتن فلمز کی ''کالا بازار''''بات ایک رات کی''اور' دیو کی سب سے کامیاب فلم ''گائیڈ'' کی جس نے دیو آنند کو کامیابی کی معراج پر لا کر کھڑا کر دیا۔اُسنے سچترا سین کے ساتھ دو فلمیں کیں۔''راہی'' اور ''بمبئ کا بابو''۔مینا کماری کے ساتھ اُسنے فلم ''کنارے کنارے'' کی۔مالا سنہا کے ساتھ اُسنے ''مایا'' کی۔اسی طرح سادھنا کے ساتھ اُسنے ''اصلی نقلی'' کی۔آشا پاریکھ کے ساتھ دو فلمیں کیں۔ناصر حسین کی کامیاب فلم ''جب پیار کسی سے ہوتا ہے'' اور ''محل''۔وجینتی مالا کے ساتھ اُسنے وجے آنند کی ہدایت میں بننے والی کامیاب ترین سسپنس تھرلر ''جیول تھیف'' میں کام کیا۔ہیما مالنی کے ساتھ اُسنے فلم ''امیر غریب''''تیرے میرے سپنے'' اور ''جانی میرا نام'' کیں۔یہ دونوں فلمیں بھی بیحد کامیاب رہیں۔

دیو کی عمر ڈھلتی جا رہی تھی۔اب دیو جوان فلم بین طبقے کی پسند نہ رہا تھا۔وہ نئے نئے ہیروز کی طرف مائل ہو گئے تھے۔دیو نے سوچا کہ کیوں نہ ہدایت کاری میں ہاتھ آزمایا جائے۔اپنی پہلی فلم ''ہرے راما ہرے کرشنا'' میں اُسنے ایک نئی لڑکی زینت امان کو پیش کیا۔یہ فلم بیحد کامیاب رہی۔اُسکے بعد دیو نے کئی ساری فلمیں بنائیں جن میں ''دیس پردیس'' کو چھوڑ کے باقی ساری فلمیں باکس آفس پر ناکام رہیں۔ان میں ''پریم پجاری''،''عشق عشق عشق''،''جان من''،''لوٹ مار''،''سوامی دادا''،''آنند اور آنند'' جسمیں اُسنے اپنے بیٹے سنیل آنند کو لانچ کیا مگر یہ فلم بھی باکس آفس پر اوندھے منہ گری۔اسکے بعد ''اول نمبر''،''سچے کا بول بالا''،''سو کروڑ''،''گینگسٹر''،''میں سولہ برس کی''،''سنسر''،''لو ایٹ ٹائمز سکیر''،''مسٹر پرائم منسٹر'' اور ''چارج شیٹ'' ہیں جو کوئی کمال نہ کر سکیں۔

دیو آنند ایک پڑھے لکھے، روشن دماغ اداکار تھے جنہوں نے فلمی شائقین کو نہ صرف بھرپور تفریح فراہم کی بلکہ جو کچھ فلم انڈسٹری سے کمایا اُس سے محل دو محلے بنانے کے بجائے اسی انڈسٹری کی بہتری کے لیے خرچ کیا اور لاتعداد نئے چہروں کو متعارف کرانے کے ساتھ سینئر اداکاروں کو بھی بھرپور عزت اور کام کے مواقع فراہم کیے۔کام سے دیو آنند کی کمٹ منٹ اس بات سے اندازہ لگا لیجیے کہ ستر کی دہائی کے وسط میں اُن کے ادارے کی فلم ''پریم پجاری'' کی بیرونِ ملک عکس بندی کا شیڈول جہاز میں بروقت سیٹیں نہ ملنے کے باعث متاثر ہوا رہا جس کا حل دیو آنند نے یہ نکالا کہ کثیر سرمایے سے اپنے ادارے کے لیے ایک ہوائی جہاز خرید ڈالا تاکہ اداکاروں کی دستیابی کے مطابق یونٹ کو لے کر باہر جایا جا سکے۔

دیو آنند زندگی کے آخری سانسوں تک مصروفِ کار رہے۔وہ بڑے بجٹ کی ایک فلم بنا رہے تھے جس کا اُن کی بڑھتی عمر اور گرتی صحت کے باعث مکمل ہونا ممکن نظر نہ آتا تھا۔جب اُن کے ایک دوست نے بھاری خسارے کی طرف دیو آنند کی توجہ دلائی تو اُنہوں نے یہ کہہ کر دوست کا منہ بند کر دیا کہ میں جب بمبئ آیا تھا تو میری جیب میں ایک روپیہ بارہ آنے تھے۔جب تک میری جیب میں اتنی رقم موجود ہے میں خسارے میں نہیں ہوں۔

3 دسمبر 2011 کو بالی وڈ کا یہ رومانٹک ہیرو اور ثریا کا گریگری پیک اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔وہ اپنے پیچھے یادوں کا ایک انمول خزانہ چھوڑ کر چلا گیا۔

''دھرتی دامان''

ہُن ۔۔۔ہُن تاں میں

حنیف باوا (جھنگ)

مری زندگی دی اوہ ساتھی
جیہدا ائیں
پہلی راتیں
گھنڈ چکیا سی
اوس ویلےاوہ مینوں
چن دا اک۔۔۔
ٹوٹا لگی سی
اوہدے متھے دے ٹِکّے
اتے نکّ دے کوکے نیں
مرے تن من دے وِچ جیویں
چانن کردتا سی
جداوہ رنگلے پلنگ تے
ریشم دے پٹولے وانگوں
سنگڑ کے انج بیٹھی سی
جیویں اوہ کوئی
چھوئی موئی دی۔۔۔
معصوم جہی۔۔۔
اک لچکیلی لگر ہووے
اوہ دن سوہنا
اوہ رات سلکھنی
ڈھیراں خوشیاں دے نال لنگھی
مُڑ دِن آوندے رہے
تے لگدے رہے

انج ای سجنوں
ہولی ہولی حیاتی دی
اوس سُندر جھولی وچوں
اِک اِک کر کے اوہ خوشیاں وی
ڈُھلدیاں گئیاں
اوڑک جد
اوس جھولی دا اندر۔۔۔
سکھنا ہویا
تاں سجنوں
اوہندے چہیڑے سوہنے مکھ چوں
خوشیاں بھنّے پھُل رَکر دے سن
تکھیاں سُولاں ورگے
نخصے بول۔۔۔نکلن لگ پئے
میں دوسی ساں شائد
اس سارے کجھ دا
جاں پھیر
ویلے دے اُلٹ پھیر نیں
سانوں رجّ کے
جھاڑیا جھمیا سی
گُجھ وی سی
اوڑک اوہ
بولاں دے۔۔۔
تکھے تیرورہاوندی

اگّے ٹرگئی۔۔۔بہت ای اگے
امبراں دے ول
میں کلّا رہ گیا
ہُن جدوی میں
اکلاپے دی اگ چ
سڑدا بلدا
سوچناں واں
تاں اوہدے اوہ
تکھیاں سُولاں ورگے بول وی مینوں
پیارے لگن لگ پیندے نیں
اس لئی کہ بیتے ویلے
سدا اوہ
میرے سنگ تاں رہندی سی
تتّوں ویلے
گرما گرم اک چپاتی
کوسی چاہ دا۔۔۔
بھریا اِک وڈا کپ
باہیاں دے وچ کدی کرائیں
اک نمی جہی مسکان سجا کے
میرے کول تاں دھرجاندی سی
پر ہُن
ہن تاں میں؟؟؟

رس رابطے

جستجو، ترتیب، تدوین

وقار جاوید (راولپنڈی)

گلزار صاحب، آداب۔

میں آپ کا بہت مشکور ہوں کہ آپ نے مجھے چہارسو کے تازہ شمارے میں اتنی نمایاں جگہ دی۔ اتنے اچھے اور اہم لکھنے والوں کی موجودگی میں یہ اعزاز پانا میرے لیے یقیناً باعثِ افتخار ہے۔ پاکستان سے باہر رہنے والے لکھاریوں کے لیے اپنی شناخت بنانا ایک کارِ مہم ہے۔ اس میں یقیناً چہارسو کا بہت اہم کردار ہے کہ وہ بیرونِ ملک مقیم لکھنے والوں کو اتنی نمائندگی دیتا ہے۔ یہ آپ ہی کا حوصلہ ہے کہ اس مستقل مزاجی سے اتنا اچھا جریدہ نکال رہے ہیں اور اس کا معیار قائم رکھے ہوئے ہیں۔ اللہ آپ کی توفیقات میں اضافہ کرے۔ سرِ ورق نہایت خوش کُن اور محنت سے بنایا گیا ہے مجھے تو ظاہر ہے کہ اچھا ہی لگا۔ اب دیکھئے دوسرے پڑھنے والے کیا کہتے ہیں۔

حسن منظر صاحب کا شمار صفِ اوّل کے لکھنے والوں میں ہوتا ہے۔ انتظار حسین اور اسد محمد خان کے ساتھ انہوں نے بھی کہانی گوئی کا اپنا ایک الگ اسلوب بنالیا ہے۔ ان کی یہ تحریر ''ناشکرے'' اس کی ایک عمدہ مثال ہے۔ حسن منظر بھی میرے شہر حیدرآباد کے ہیں اور میرے ہم پیشہ بھی۔ ان کے افسانے پڑھ کر ہم جیسوں کی بھی تربیت ہوجاتی ہے۔ رینو بہل کا افسانہ ''قیدی نمبر ۲۳۴'' بھی ایک نیا موضوع ہے۔ قیدی خواتین اور پھر ان کے بچے انہوں نے ایک اہم موضوع پر قلم اٹھایا ہے۔ کہانی کے اختتام کا انداز نئی مغربی کہانیوں کا سا ہے، اچھی کہانی ہے۔ رینو بہل ایک منجھی ہوئی کہانی کار ہیں۔ آپ کے انداز اس بار ذرا بدلے بدلے ہیں۔ ''تیسرا محلّہ'' ایک مشکل موضوع ہے۔ خصوصاً ہمارے معاشرتی سیٹ اپ میں اس کہانی کے لیے بہت مہارت کی ضرورت ہے اور آپ نے اسے خوب نبھایا ہے۔ کرداروں کے منہ میں بہت مناسب زبان رکھی ہے۔ بیانیے میں لطف آ گیا۔ مجھے نہیں یاد میں نے آپ کی اس طرز کی کوئی کہانی پہلے پڑھی ہو۔

ڈاکٹر فیروز عالم نے تراجم کا نیا اچھا سلسلہ شروع کیا ہے۔ دنیا کے عظیم نثر نگاروں کی تحریروں سے فکر وفن کو وسعت ملتی ہے۔ ہمیں ان کا شکر گزار ہونا چاہیے۔ ان کے تراجم میں روانی اور سلاست ہے، ترجمے کا احساس نہیں ہونے دیتے۔ دیپک کنول کا سلسلہ ''ایک صدی کا قصہ'' دلچسپ ہے۔ ہر ماہ کسی سے ملاقات کرا دیتے ہیں۔ منظومات میں اعتبار ساجد اور غالب عرفان کا تغزل اور عبداللہ جاوید کی نظم تو صورت اور ہو جاتی سے بہت لطف آیا۔ وہ اپنی ذات میں ایک مفکر ہیں۔ حال ہی میں ان کی کتاب ''آیئے میر کو پڑھیے'' زیر مطالعہ رہی۔ جن حضرات کو اچھی کتابیں پڑھنے کا شوق ہے انہیں ضرور اس کتاب کو پڑھنا چاہیے۔

سید سعید نقوی (نیویارک)

بھائی گلزار جاوید، سلام۔

چہارسو کا شمارہ نومبر، دسمبر ۲۰۱۵ء ڈاکٹر سعید سید نقوی کے گوشے سے مزین ہے۔ اس میں میری تحریر بعنوان ''عصری زندگی کی تصویر کشی'' شامل ہے اس سبب سے میں اس پر اظہارِ خیال کرنے سے گریز کروں گا۔ ان کی ناول ہنوز میں نے نہیں پڑھی۔ منظومات میں آپ نے میری نظم ''تو صورت اور ہو جاتی'' کو شاملِ اشاعت کیا۔ اس مرتبہ شاعری کا حصہ بھی بڑا وزن دار ہے۔ نظمیں، غزلیں ایک سے بڑھ کر ایک، انور سدید کے دوہے بھی خوب ہیں۔ عظمت کی اذان کے فوری بعد فکشن کے حصے میں حسن منظر کا افسانہ + سیاحت نامہ + علم الانسان (Anthropology) سے متعلق معلومات کا خزینہ + مارگریٹ میڈ۔ اور جم کوربٹ کے سفر اور سیاحت نامے + حاصلِ مطالعہ۔ + فیمینزم کا کڑکا۔ اس لفظی آمیزے میں ایک نسائی کردار عجوزہ ہے جو قصہ گو (Narator) بھی ہے اور موضوع اور مرکز بھی۔ حسن منظر کی تحریر اپنی صنف کا آپ ہی تعین کرنے والی تحریر ہے۔ اور خاصے کی چیز ہے۔ انتھروپولوجی کا موضوع سائنس اور فلسفہ دونوں سے متعلق ہے اس کو دو بڑے گروہوں میں تقسیم کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ۱۔ بایولوجیکل / فزیکل انتھروپولوجی ۲۔ سوشل / کلچرل انتھروپولوجی۔ حسن منظر نے ایک اور گروہ کی نشاندہی کی ہے جس کو ادب اساسی انتھروپولوجی کہا جا سکتا ہے۔

گلزار جاوید کا افسانہ ''تیسرا محلّہ'' افسانے کا افسانہ ڈرامے کا ڈرامہ ہے۔ کردار اساسی ہے کہ گرفتار اساسی۔ (نسائی کرختداری زبان) حقیقت نگاری ہے کہ سفاک نویسی۔ محلّہ وہ بھی تیسرا، گلی وہ بھی چوتھی، گھر وہ بھی پانچواں یعنی تین، چار، پانچ کا حقیقت پسندانہ امتزاج۔ بے لباس لفظوں سے لکھی ہوئی ایک تحریر۔۔۔ تیسری دنیا میں تیسرا محلّہ بھی تو ہوگا۔ آگے تمت بالخیر۔

عبداللہ جاوید (کینیڈا)

پیارے گلزار جاوید صاحب، السلام علیکم۔

''چہارسو'' کا اپنا ہی مزہ ہے۔ آتا رہے تو مزہ ہی مزہ ہے۔ پردہ کر جائے تو دل ڈوب جاتا ہے۔ تازہ ''چہارسو'' کے ''لطف وکرم'' سے مستفید ہوا جاتا ہوں۔ ''قرطاسِ اعزاز'' کے احترامات نہایت خوش آتے ہیں۔ سید سعید نقوی کی تحریریں خوش گوار ہیں اور خوش اطوار بھی۔ عبداللہ حسین کے خصوص میں فخر زمان کا ''اردو ناول کا دیو'' کچھ عجیب سا ہے تاہم یہ بہت اہم ہے۔ فخر زمان اردو اور پنجابی ادبوں کے دیوتا ہیں ان کا قلم خوش رنگ اور ''خوش بو'' ہیولائی تصورات کا آئینہ بن کر ان کی تختی مدھر مدھر موسیقیوں کی پریوں کا اُتارا ہے۔ وہ جب اکادمی ادبیات پاکستان کے چیئرمین تھے ان کی یادوں میں بوئی گاؤں رہتا تھا بلاتے تھے اور سلیقے سے اٹھاتے بٹھاتے تھے۔ لاہور جا کے ''رخِ روشن'' پھیر لیا۔ میری پنجابی جانتے

ہیں پنجابی میں بلاتے نہیں۔اللہ رکھے بڑے جی دار بندے ہیں۔رسالے کی نثر اور شاعری خوب ہے۔یہ شعر دیکھئے:

رفیقوں میں جو اپنا پن نہیں ہے
کوئی محفل میں کیا دشمن نہیں ہے
(نوید سروش)

آپ تو ماضی کہتے ہیں
لیکن میں آئندہ ہوں
(تصور اقبال)

آصف ثاقب (بوئی، ہزارہ)

گل وگلزار۔پُر بہار،تمہارے لیے دعاؤں کا معطّر ہار۔

ہلکی ہلکی بارشوں نے اسلام آباد کو شفاف اور شاداب کر دیا ہے۔ چہار سو رنگین لہلہاتے پھول، درختوں سے بچھڑنے والے زرد پتوں کا انوکھا حُسن ۔ لیموں اور مالٹوں کی بھینی بھینی خوشبو یہ رنگینی کائنات میرے تن بوسیدہ کے لیے روحانی سرور۔اس پر مستزاد تمہارے پروردہ چہارسو کی مہکار (ادبی) نے بہار آفریں سماں باندھ دیا۔نمازِ فجر اور تلاوتِ کلامِ پاک کا مقدس فریضہ ادا کر کے تمہاری ان تھک کاوشوں سے مزین چہارسو اپنے ہاتھوں میں تھام لیتی ہوں۔اور بلند پایہ تخلیق کاروں کی سجی سجائی محفل سے خوب لطف اندوز ہوتی ہوں۔

سید سعید نقوی کا پُر وقار ''قرطاسِ اعزاز'' نوستاروں کی ثروت مند تحریروں سے جگمگا رہا ہے۔طوالت تحریر پابہ زنجیر ہے ہر تحریر ایک صحیفہ ہے۔ایک انسان دوست،ادیب، شاعر، ناول نگار اور مترجم کو دل کی گہرائیوں سے جو خراجِ تحسین پیش کیا گیا ہے اس نے مجھے ''بن دیکھے لکھاری'' کا گرویدہ بنا دیا ہے۔

''براہِ راست'' کا کیا کہنا۔۔۔سینۂ کائنات کے دلکش راز کو تم نے نہایت سلیقے، قرینے اور دلی چاہت سے فاش کیا ہے۔''یادوں کی پگڈنڈی'' پر چلتے چلتے کیسے کیسے چاند ستاروں سے قاری کے دل و دماغ کو چراغاں کیا ہے۔ سید سعید نقوی کے سراہنے والوں کا انتخاب خاصے کی چیز ہے۔

''خود کلامی'' پروفیسر مامون ایمن، ''دلچسپی کا عنصر'' شہزاد نیرؔ، ''بشر نوازی'' عقیل روبی، ''پھول ہی پھول'' طاہر نقوی، ''مشرق و مغرب کی آویزش'' شمیم حنفی، ''زندگی کا عکاس'' رضیہ فصیح احمد ''نفیس افسانے'' الطاف فاطمہ۔

ادب کے بحرِ ذخار میں ڈوب کر تم نے یہ تابدار تحریریں برآمد کی ہیں۔ اس کاوشِ قلبی کی جتنی بھی داد دی جائے کم ہے۔علی اکبر ناطق، میرا پسندیدہ ادیب ''اللہ دین کی چار پائی'' ان کا شاہکار افسانہ کئی بار پڑھا۔سید سعید نقوی کی غزل:

تمہارے زعم و تفاخر پہ کچھ نکھار آیا
میں جتنی بار گیا اور جتنی بار آیا

پڑھنے کا جو مشورہ آپ نے دیا اس پر عمل کیا اور بے بہا نشاط و سرور سے مالا مال ہوئی ''آپ کی دعا میرے دل کی آواز'' سعید صاحب جیتے رہیے اور ہمیں اسی طرح شاعری سناتے رہیے۔کاش۔۔۔پاکستان کا ہر ذی شعور نوجواں سعید نقوی کے اس مخلصانہ پیغام پر عمل پیرا ہو۔

''اگر آپ اپنے ملک میں کامیاب ہیں تو بیرون ملک جانا عقل مندی نہیں۔تربیت، تعلیم اور تحقیق کے لیے ضرور جائیں اور مکمل کر کے واپس آجائیں۔''

یہ چندی گڑھ والی لڑکی جسے ایوارڈ بھی ملا ہے۔رینو بہل مجھے اس لیے پیاری لگتی ہے کہ اس کے افسانوں میں انسانیت کے درد وغم سانس لیتے ہیں۔ قیدی نمبر ۲۳۴ بھی اپنی طرز کی منفرد کہانی ہے معاشرے کو آئینہ دکھانے والی۔

''تیسرا محلّہ'' ہمارے معاشرے کا بھرپور عکس۔کھل ڈھل بے باک گفتگو۔''اداس رنگوں کی بارش'' پیاری دوست منیرہ احمد شمیم کی دلگیر تحریر۔۔۔لکھتی ہیں ''وہ مجھ سے روشنیوں، خوشبوؤں اور محبتوں کی باتیں کرتا۔اپنی زندگی اور گھٹن کے قصے سناتا۔وہ ایک ایسا انسان تھا جس نے مجھے درد، خوشی، اُمید، ناامیدی اور بہت سے دوسرے گھمبیر جذبوں میں گم اور مست کر رکھا تھا۔''منیرہ کی اثر انگیز تحریر نے میرے سراپا کو اداسی کی بارش میں بھگو دیا۔

رہے نام اللہ کا

رس رابطے تمہارے مداحوں، چاہنے والوں کی ''ادبی پارٹی'' دن دونی رات چوگنی ترقی کر رہی ہے۔چشم بددور۔مالکِ دو جہاں تمام تخلیق کاروں پہ اپنی لازوال رحمت کی برکھا برساتے رہنا اور ان کے قلم کی حرمت و لطافت کو سدا بہار رکھنا۔آمین۔مہندر پرتاپ چاند ادب کا ''کوہِ نور'' ہیں۔مزاحیہ نظم کی پسندیدگی پہ محبت بھرا شکریہ۔

آپا جمیلہ شبنم (اسلام آباد)

برادرِ محترم گلزار جاوید، السلام علیکم۔

''چہارسو'' کا نیا پرچہ ملا۔سید سعید نقوی صرف افسانہ نگار ہی نہیں شاعر بھی ہیں۔اور پھر ''براہِ راست'' میں سوالات کے جوابات پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ادب کی نسبت سعید نقوی صاحب کو سیاست سے زیادہ دلچسپی ہے ''براہِ راست'' کافی طویل اور پُر از معلومات ہے مگر سیاست ہی کا زور زورہ ہے۔غالب عرفان کی نعت کا یہ شعر بہت اچھا لگا:

اللہ کے حبیبؐ تھے لیکن زمین پر
گزرے بشر کے روپ میں ہر امتحان سے

آٹھ کے آٹھ افسانے پڑھ ڈالے لیکن یقین جانیے جو مزا ''تیسرا محلّہ'' میں آیا وہ کسی سے نہیں ملا۔میں طرفداری یا جانبداری نہیں کر رہا دل کی بات کہہ رہا ہوں۔نظموں میں شگفتہ نازلی کی نظم ''خاکی وردی'' اچھی لگی۔ڈاکٹر انور سدید کے دوہے بھی کئی بار پڑھے۔جناب فخر زمان نے ''اردو ناول کا دیو'' مضمون لکھ کر عبداللہ حسین کو دوبارہ زندہ کر دیا۔

دیپک کنول نے ''ایک صدی کا قصہ'' کے تحت شاہد لطیف کی زندگی

زیرِتحریر لائی ہے اور خاصی کامیابی سے لکھا ہے مگر مزا نہیں آیا۔ بات تو دیوآنند سے شروع ہوئی تھی لیکن ختم شاہد لطیف پر ہوئی ہے۔ اور ساری تحریر میں شاہد لطیف کا ہی ذکر رہا ہے۔ سرِ ورق پر سید سعید نقوی کی تصویر خوب جچتی ہے۔ جمیلہ شبنم نے ''جی آیاں نوں'' لکھ کر محکمہ واپڈا والوں کو خوب طنز کا نشانہ بنایا ہے۔

پروفیسر زہیر کنجاہی (راولپنڈی)

جنابِ گلزار جاوید صاحب، السلام علیکم۔

ہمیشہ کی طرح چہارسو (شمارہ نومبر، دسمبر ۲۰۱۵ء) اپنے صحیح وقت پر میرے سامنے موجود ہے۔ سرِ ورق کا رنگ ذرا مختلف سا ہے لیکن اچھا ہے۔ ڈاکٹر سعید سید صاحب کی مسکراتی ہوئی تصویر اور تصویر کے پیچھے اس کا عکس سرِ ورق پر چھائے ہوئے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کا گوشہ دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہو رہی ہے۔ ان کو بہت مبارک ہو۔ میں نے ڈاکٹر صاحب کے جتنے افسانے پڑھے ہیں ان میں تنوع اور مقصدیت ہوتی ہے اور Massage بھی۔ وہ قاری کو ساتھ لے کر چلتے ہیں یہی ان کا فن ہے۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ ان کے افسانوں میں موقع کی مناسبت کے لحاظ سے فیمینزم کی پرچھائیاں بھی پڑتی رہتی ہیں۔۔۔ پرچے کے بارے میں کیا کہوں فکشن اور شاعری دونوں کے مندرجات صفحہ اول کے ہیں۔ وقت اور فرصت میسر نہیں کہ اپنے فیلڈ یعنی فکشن کا جائزہ پیش کرسکوں۔ کیونکہ ہر افسانہ پڑھنے کے لائق بھی ہے اور مناسب تحسین کا طالب بھی۔

شہناز خانم عابدی (کینیڈا)

گلزار جاوید صاحب، السلام علیکم۔

''چہارسُو'' کا تازہ شمارہ نومبر دسمبر ۲۰۱۵ء ڈاکٹر سید سعید نقوی صاحب کے نام منسوب ہے جو بیک وقت میڈیکل ڈاکٹر، افسانہ نگار، ناول نگار اور شاعر کی کثیر الجہات خوبیوں کے مالک ہیں اور مصروف مغربی ماحول میں حیران کن حد تک اردو ادب سے لگاؤ کی بنا پر داد کے مستحق ہیں۔ دیگر زبانوں کے افسانوں اور ناول کے اردو میں ترجمہ کرکے اُنہوں نے اردو کے قارئین کی مزید خدمت کی ہے۔ اُن کے افسانے مثلاً ''پُتلی تماشا'' اور ناول ''گرداب'' منفرد انداز رکھنے کے ساتھ بہت دلچسپ ہیں۔ ''براہِ راست'' میں آپ کا سعید نقوی صاحب سے مکالمہ اعلیٰ ادبی نوعیت کا حامل ہے جسے پڑھ کر بہت سی معلومات سامنے آتی ہیں جو آپ کے خوبصورت سوالات کا کمال ہے اور جوابات بھی خوب ہیں۔

نسیم سحر کی ''حمدِ باری تعالیٰ'' غالب عرفان صاحب کی ''نعت رسولؐ'' اور نظم خوب ہیں۔ نیز مہندر پرتاپ چاند، مامون ایمن، پروفیسر زہیر کنجاہی، شگفتہ نازلی، سلیم ناز، یوگیندر بہل تشنہ اور ابراہیم عدیل نے خوبصورت نظمیں تحریر کی ہیں۔ عبد اللہ جاوید کی نظم کے مطابق کاش عزازیل وہ الفاظ ادا کرتا تو شاید ''صورت اور ہو جاتی'' دیگر نظمیں بھی اعلیٰ معیار کی ہیں۔ جناب حسن منظر کا سیاحت نامہ ''ناشکرے'' عجیب وغریب رسم ورواج اور واقعات کے تذکرے کے ساتھ کافی دلچسپ ہے۔ جلتی ہریائی میں شمع خالد نے بہت دلچسپ انداز میں بدھ مت اور تاریخی مذہبی اور اخلاقی قدروں کے ساتھ انسانی حقوق کا ذکر کیا ہے اور موجودہ شدت پسندی پر روشنی ڈالی ہے۔ منیرہ احمد شمیم کا افسانہ ''اداس رنگوں کی بارش'' میں وفا کی پیکر ساتھی کا اپنے محبوب سے بے وقت بچھڑ جانا اور گزرے ہوئے خوبصورت لمحات کے مقابلے میں اداس شب وروز کے ذکر سے دیر تک دل اداس رہا۔ ''رفتارِ وقت'' میں شاہد جمیل صاحب نے زمان ومکان میں دو انتہاؤں کا خوبصورت انداز میں منظر پیش کر کے بات کو بلیک ہول Black Hole تک پہنچا دیا ہے جہاں وقت کی رفتار کروڑوں گنا زیادہ تیز ہے۔ عثمان عالم صاحب کے افسانے ''حاملہ آوازیں'' کا نام (یا عنوان) اور بیان سمجھنا کافی مشکل لگا جس میں انہوں نے ایک غریب گھرانے کی جوان لڑکی کے خیالات ایک مفروضہ کے طور پر کھلے طور سے بیان کیے ہیں جو کسی نے کبھی نہیں سنے۔ اس کا مقصد سمجھ میں نہیں آسکا۔ آپا جمیلہ شبنم نے خوبصورت صاف ستھرے ادبی انداز میں طنز ومزاح کے ساتھ ''جی آیاں نوں'' تحریر کر کے واپڈا کو پیش کی ہے قابلِ داد ہے اس سے پہلے اُنہوں نے اسی حوالے سے ''لوڈ شیڈنگ میں سہاگ رات'' کے عنوان سے بھی واپڈا کو جگانے کی خوبصورت کوشش کی تھی۔

آپ نے اپنے افسانہ ''تیسرا محلّہ'' میں بہت دلچسپ انداز میں معاشرے کے ایک خاص رُخ کی خوبصورت عکاسی کی ہے اور اپنے منفرد انداز میں افسانے کا اختتام ایسے الفاظ سے کیا ہے کہ اشاراتی ہونے کے باوجود واضح طور پر بات کی سمجھ آجاتی ہے جو قابلِ تعریف انداز ہے۔ ڈاکٹر رینو بہل کے افسانے ''قیدی نمبر ۲۳۴'' میں معاشرے میں ظلم وحسد کا شکار معصوم افراد کی داستان موثر انداز میں بیان کی گئی ہے۔ گذشتہ شمارے میں میری نظم ''لغزشوں کا حال'' میں کمپوزنگ کی ایک غلطی کی تصحیح فرما دیجیے۔ اصل شعر یوں ہے:

خود کو پایا روزِ محشر میں نے یوں تنہا ریاضؔ
دست وپا بولے مخالف بند پائیں ساری راہیں''

ڈاکٹر ریاض احمد (پشاور)

محترمی گلزار جاوید! تسلیمات۔

چہارسو حسبِ معمول علمی وادبی رنگ بکھیر کے طبعِ پژمردہ کے لیے موجبِ فرحت وانبساط بن کر موصول ہوا۔ سیم بات کہ سید سعید نقوی کو مختلف رسائل میں گاہے بہ گاہے پڑھا لیکن قرطاسِ اعزاز میں ان کے قد کاٹھ کو دیکھ کر اپنی کوتاہ قامتی پہ شرمندگی کا احساس ہوا کہ جس شخص کو عام سا لکھاری جانا وہ کتنا اہم وبلند پایہ تخلیق کار ہے بہرحال اپنی کم مائیگی کے باوجود ''براہِ راست'' سے لے کر دیگر اہلِ قلم کا ان کے بارے تحریر کردہ ہر ہر لفظ اپنے اوپر قرض جان کر پڑھا اور دیارِ غیر میں مقیم نقوی صاحب کی صحت اور ان کے قلم کے لیے دل سے بے شمار دعائیں نکلیں۔

منیرہ شمیم صاحبہ کے سینے میں پنہاں وچھوڑے اور تنہائی کا آتش

فشاں دہکتا رہتا ہے۔ ان کا اظہار قلم کے ذریعے لاوا بن کر باہر کو نکلتا ہے۔ اس کے سوز وتپش میں سب کچھ راکھ ہو جاتا ہے اور افسانے کے آخر میں قاری راکھ کے ڈھیر پہ بیٹھا آنکھیں خشک کر رہا ہوتا ہے۔ "اداس رنگوں کی بارش" اسی تاثر کو ابھارتا ہے اور یہی ان کے بہترین افسانہ نگار ہونے کا ثبوت ہے۔ محمد سعید شیخ صاحب نے اپنی کہانی "فرار" میں بڑی چابکدستی سے ہمارے سماج میں معذور بچوں کے والدین کے کرب و بے چارگی اور کسمپرسی کی تصویر کشی کی ہے۔ مغربی ممالک میں ریاست ایسے بچوں کی کفالت اپنے ذمے لے کر بوڑھے اور نادار والدین کو ایسے جگر پاش آزار سے چھٹکارا دلواتی ہے۔ "حاملہ آوازیں" عثمان عالم صاحب کی بہترین تحریر ہے۔

شاہد جمیل ایک صاحبِ مطالعہ اور زیرک لکھاری ہیں۔ سائنسی علوم اور جدید ایجادات کی روشنی میں فلسفہ زمان کے پس منظر میں "رفتارِ وقت" کو ایک تجرباتی، علامتی کہانی میں کامیابی کے ساتھ ڈھالا جس میں قاری کے لیے دلچسپی کے سامان موجود ہیں۔ لیکن "تیسرا محلّہ" شمارے کا ازحد دلچسپ، جامع اور منفرد افسانہ ہے۔ اس مختصر مگر لاجواب افسانے میں زبان کو جس سلیقے اور ہنرمندی کے ساتھ استعمال کیا گیا ہے وہ کچھ آپ ہی کا خاصہ ہے۔ قاری کہانی کی لذت کو چٹخارے کی صورت میں اپنے منہ میں محسوس کرتا ہے۔ گلزار صاحب! کہانی کی بُنت میں زبان کا استعمال آپ کی فنی پختگی اور آپ کا طرہ امتیاز ہے۔ "شہہ چھتک" کی مانند تیسرے محلے کی کھٹاس طویل عرصہ تک مجھے کھٹے میٹھے ذائقے کا احساس دلاتی رہے گی۔

فخر زمان کا "اردو ناول کا دیو" جمیلہ شبنم صاحبہ کی "جی آیاں نوں" دیپک کنول کا "لطیف شاہد" اور فیروز عالم کا ترجمہ "بوسہ" جناب انورسدید، حنیف باوا، شہباش گپتا شفق، شریف شیوہ، خورشید انور رضوی، اعتبار ساجد، نوید سروش اور محمد انعام الحق کی "معرکۂ ذات" بہت شاندار ادبی تحریریں ہیں۔

نیر اقبال علوی (لاہور)

مدیرِ محترم، سلام ورحمت۔

حسبِ خواہش مطالعہ نہ کر پانے کے باوجود جس قدر "چہارسو" دیکھا اور پڑھا گیا وہ اسے ترتیب وتزئین کے اعتبار سے تابدار اور باوقار شماروں کی صف میں کھڑا کیے دیتا ہے۔ سالِ رواں کا موجودہ شمارہ بنام سید سعید نقوی صاحب خوشگوارایت کا تاثر لیے ہوئے ہے کہ دنیائے افسانہ نگاری کی ایک اور مقبول و معروف شخصیت کو تمام تر فنی زاویوں اور افسانوی پہلوؤں کے ساتھ منظرِ عام پر لایا گیا ہے جبکہ "براہِ راست" کا رنگِ بیاں "قرطاسِ اعزاز" کو اپنے اوصاف و امتیازات کے ساتھ دھنک رنگ میں تبدیل کیے دیتا ہے بلکہ یوں کہنا بھی بجا ہوگا کہ چہارسو مسائل کی کاربن ڈائی آکسائیڈ میں ذہنی تسکین کی آکسیجن فراہم کرتا ہے۔۔۔

تیسرے محلے کی کردار سازی کے لیے مکالماتی چابکدستی سے فضا ہموار و سازگار رہی جس سے تاک جھانک کے رنگ کچھ اور بھی گہرے ہوتے چلے گئے۔ شاہد لطیف صاحب نیز محترمہ عصمت چغتائی کے بارے پڑھنا اور جاننا اچھا لگا۔ عالمی ادب کی شمولیت بلاشبہ قارئین کے لیے باعثِ اہمیت وافادیت ہے اور دُوررس اثرات کی حامل رہے گی۔ ڈاکٹر انور سدید صاحب کی نظم کے بعد اپنی نظم کے لیے حرفِ خیر کسی اعزاز سے کم نہیں پروفیسر صاحب۔

کرامت صاحب کی اُردو زبان سے وابستگی نیز سپریم کورٹ کے فیصلے سے سبھی اہلِ قلم متفق ہیں۔ نظم "پاکستان" پسند آئی۔ ابراہیم عدیل صاحب کی اہلیہ محترمہ کے لیے دعائے مغفرت اور صبرِ جمیل۔ "سالِ نو" کے لیے نیک خواہشات کے ساتھ۔

شگفتہ نازلی (لاہور)

جاوید صاحب، تسلیمات۔

چہارسو کا تازہ شمارہ نیویارک میں مقیم سید سعید نقوی سے منسوب ہے۔ جو ہر لحاظ سے دیدہ زیب اور بھرپور کہا جائے تو زیادہ مناسب ہے۔ یوں تو چہارسو بجائے خود لاجواب ادبی جریدہ ہے مگر اس کی سب سے بڑی خوبی اردو دنیا کی بھرپور نمائندگی ہے۔ مدیرِ چہارسو کے اس عمل سے نہ صرف پاکستانی ادب کا وقار بڑھتا ہے بلکہ وہاں کے اہلِ قلم پر علامات کے استعمال کا تاثر بھی زائل ہوتا ہے۔ زیرِ نظر شمارے میں بہت کچھ لائق توجہ ہے مگر رینو بہل کی کہانی "قیدی نمبر ۲۳۴" اس شمارے کی لاجواب تخلیق ہے۔ کہانی پڑھ کر زاہدہ حنا کی "تتلیاں پکڑنے والی" کی یاد تازہ ہوگئی۔ میری دعا ہے "چہارسو" اسی طرح چہار جانب خوشیاں بکھیرتا رہے۔

مسرور جہاں (لکھنؤ، بھارت)

محترم محمد گلزار جاوید، السلام علیکم۔

نومبر، دسمبر ۲۰۱۵ء کا چہارسو موصول ہوا، ممنون ہوں۔ قرطاس اعزاز کے لیے شخصیت کا انتخاب اگرچہ انتہائی مشکل ہے لیکن آپ کر گزرتے ہیں۔ اس بار آپ نے سید سعید نقوی کو کھوجا، قرطاس کی تہذیب میں توجہ طلب مرحلہ "براہِ راست" سوالات کا ہے جس سے آپ ہمیشہ سرخرو گزرے ہیں۔ نو(۹) مقالہ نگاروں نے قارئین کو صاحبِ قرطاس کی شخصیت سے روشناس کرایا۔ سید سعید نقوی کے دو افسانے "فریبِ نظر"، "پتلی تماشہ" ایک غیر مطبوعہ کہانی "عید قربان سے پہلے" اور اُن کے ناول "گرداب" سے ایک باب شاملِ اشاعت ہے۔

دونوں افسانوں نے مجھے بہت دیر اپنی گرفت میں رکھا اور میں ایک سرشاری کی کیفیت میں رہا۔ کہانی اسلوب اور زیب داستان نے یکجا ہو کر افسانوں کو شاہکار بنا دیا ہے۔ "عید قربان سے پہلے" میں دہشت گرد/گردی کو موضوع بنایا گیا، اس ناسور پر کئی قلموں کے نشتر چل چکے ہیں۔ "گرداب" کا ایک باب ورلڈ ٹریڈ سنٹر کی تباہی کے حوالے سے ہے جس میں نقوی صاحب کے قلم کی روانی جوبن پر ہے۔ سید سعید نقوی ناول لکھیں یا شاعری کریں شناخت افسانہ ہی رہے گی۔

"حمد باری تعالیٰ" اور "نعت رسولؐ" بالترتیب نسیم سحر اور غالب

عرفان لکھیں اور بخدا خوب لکھیں۔ ''اردو ناول کا دیو'' فخر زمان کی تحریر ہے جو ناول ''اداس نسلیں'' کے خالق عبداللہ حسین کی یاداشتوں پر مشتمل ہے۔ عبداللہ حسین غیر معمولی تخلیقی صلاحیت رکھتے تھے۔ لفظ وقلم کے پاسبان تھے، اردو ادب کی تاریخ عبداللہ حسین اور اداس نسلیں کے ذکر کے بغیر قطعی نامکمل ہوگی۔

احسان بن مجید (اٹک)

گلزار جاوید بھائی، آپ سلامت رہیں!

''چہارسُو'' مل گیا۔ جستہ جستہ دیکھ بھی لیا۔ معمول کے مطابق دوسرے ادبی جرائد سے الگ اور ہر لحاظ سے منفرد ہے۔ سید سعید نقوی کو آپ نے خوب ڈھونڈ نکالا۔ دُور دراز اردو ادب کے لیے کتنا معتبر کام ہو رہا ہے؟ یہ چہارسو اکثر اپنے شماروں میں پڑھنے والوں کو بتا دیتا ہے۔ کہانیوں میں ایک از حد جداگانہ تحریر حسن منظر کی ملی۔ حصہ غزل ونظم بھی دلفریب ودلکش ہیں۔

طفیل اختر (لاہور)

محترم گلزار جاوید، السلام علیکم۔

''چہارسُو'' کا تازہ شمارہ یومِ اقبال کے موقع پر نظر نواز ہوا۔ موجودہ شمارہ میں سید سعید نقوی کو قرطاس اعزاز بخشا ہے۔ اس ناچیز نے پہلی بار چہارسو ہی میں سید صاحب کی تحریریں پڑھی تھیں۔ ڈاکٹر سید رضی محمد کی ایک غزل کی اشاعت کے بعد ان سے رابطہ بھی ہوا کہ ڈاکٹر سید رضی محمد اور سید سعید نقوی پبلک اسکول میں ہم جماعت رہے ہیں۔ ''براہِ راست'' میں آپ کے سوالات کے جوابات سید صاحب نے بڑی تفصیل اور انکسار کے ساتھ دیے ہیں۔ سعید نقوی صاحب نے نہ صرف اپنے ادبی نظریات کی تفہیم کی بلکہ اردو اور مغربی افسانے کی تکنیک، اسلوب اور بدلتے ہوئے رجحانات کا اچھا تجزیہ کیا ہے۔ دنیا بھر میں کسی بھی سطح پر مذہبی، لسانی، علاقائی، نسلی، جنسی اور دیگر تعصّبات کا ذکر بھی حقیقت پسندی سے کیا ہے۔ اب تو بین الاقوامی ادارے بھی ''زبان'' کی مقبولیت اور پھیلاؤ کے حوالے سے تعصب کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی مرضی کا سروے کروا کے اُس کی تشہیر کر رہے ہیں۔ سعید نقوی کا افسانہ ''پتلی تماشا'' انسانی نفسیات اور احساسات کے اظہار کا کامیاب نمونہ ہے جسے مصنف نے بڑی توجہ اور کہانی کے کرداروں سے گہری وابستگی کے ساتھ تحریر کیا ہے۔ اختتام بھی لاجواب ہے۔ سعید نقوی صاحب کی غزلوں کے مطالعے سے ایک خوش گوار حیرت ہوئی۔ عبداللہ جاوید نے سعید نقوی کے افسانوں کی مثالوں سے اپنی بات کی ہے اور انہیں منفرد اور نئے نئے تجربوں کا راستہ دکھانے والا افسانہ نگار قرار دیا ہے۔ ڈاکٹر آصف فرخی نے انہیں باشعور اور حسّاس فنکار کہا ہے جو اردو افسانے کے لیے مغربی معاشرے میں جی رہا ہے۔ محترمہ الطاف فاطمہ نے بڑے خلوص سے نفیس کہانی کار کا اعزاز عطا کیا ہے۔ محترمہ سلمیٰ اعوان نے مختصراً اُن کی کہانیوں پر بات کرتے ہوئے کہا کہ ایلوگری اُن کے افسانوں کا مؤثر ہتھیار ہے۔

چیخوف کے افسانے کا اردو ترجمہ بعنوان ''بوسہ'' میں ڈاکٹر فیروز عالم کی زبان دانی (انگریزی اردو) کا علم بخوبی ہوتا ہے اور اُن کے انتخاب کی بھی داد دینی چاہیے۔ ''ریابووچ'' کے کردار کی نفسیاتی کیفیت اور خود کلامی اس کہانی کا حُسن ہے۔ ''ریابووچ'' کے تخیل کی طاقت بھی افسانے میں دلچسپی کا سبب ہے۔ ایک صدی کا قصہ میں دیپک کنول نے شاہد لطیف کی فلمی خدمات کا ذکر اپنے خاص انداز سے کیا ہے۔ موجودہ شمارے میں سینئر اور بہت اچھے لکھنے والوں کے اچھے افسانے شامل ہیں ڈاکٹر حسن منظر، محمد سعید شیخ، شمع خالد، ڈاکٹر رینو بہل کے افسانے پیش کش، اسلوب اور موضوع کے اعتبار سے اہم اور پُر اثر ہیں۔ آپ کا افسانہ ''تیسرا محلّہ'' میں ہماری سماجی زندگی کی کمزوریوں اور جاہلانہ سوچ کو اُسی معاشرت کے انداز اور لب ولہجہ میں کمالِ مہارت سے بیان کیا ہے۔

پروین شیر ''چند سیپیاں سمندروں سے'' کی موجودہ قسط اہلِ دنیا کو انسانی روّیوں پر سوچنے پر مجبور کرتی ہیں۔ ''نور کی کہانی ڈسٹرکٹ 6'' میں میری زندگی نور ابراہیم کی کتاب کے پس منظر میں دنیا میں کسی بھی سطح پر تعصبات کا شکار ہونے والے انسانوں کی پُر درد داستان ہے۔ olive schrcincer کی تخلیقات کا ذکر ضرورت کے تحت کیا ہے۔ سفر نامے میں، محترمہ نے خود کو سفر نامہ نگار کے بجائے ایک الگ کردار کے طور پر پیش کیا ہے ایسا کیوں ہے یہ پروین شیر ہی بتا سکیں گی۔ تحریر میں نظمیں سونے پر سہاگے کا کام کر رہی ہیں۔

آصف ثاقب صاحب نے چھوٹی بحر میں خوب صورت نظم کہی ہے نقشبند نقوی بخاری، مہندر پرتاپ چاند، حسن عسکری کاظمی، پروفیسر صدیق شاہد، ڈاکٹر رؤف خیر اور صبا اکرام کی غزلوں کے بعض اشعار انفرادیت، تازگی اور پختگی کی علامت ہیں۔

نہ جا اے شیشہ صفت اس گلاب چہرے پر
دورنِ ذات ذرا دیکھ سنگ باری بھی

(صبا اکرام)

لبوں پہ حرفِ وفا ہے دلوں میں بیر مگر
کہوں میں کیا اسے یاروں کی اک ادا کے سوا

(مہندر پرتاپ چاند)

شگفتہ نازلی، کرنل (ر) مقبول حسین، کرشن پرویز اور شبھاش گپتا شفیق کی غزلوں کے کچھ اشعار اپنی گرفت میں لے لیتے ہیں ان میں جدید احساس فکر کی صدا سنائی دیتی ہے۔

جو لوگ گاؤں چھوڑ کر شہروں میں بس گئے
مٹی کی سوندھی خوشبو ہوا کو ترس گئے

(کرشن پرویز)

ڈاکٹر انور سدید صاحب کے دوہوں، عبداللہ جاوید، ابراہیم عدیل، مجیب شہزر اور حنیف باوا کی نظموں نے متاثر کیا۔

نوید سروش (میر پور خاص)

عزیز از جان، گلزار جاوید، دعائیں۔

آج کل زندگی کینیڈا، امریکہ اور ہندوستان کے درمیان بٹی ہوئی ہے اگر کوئی چیز نہیں بٹی تو وہ تم اور تمہاری محبت کا پیامبر ''چہارسُو'' ہے۔ تمہاری تلاش ہمیشہ کی مانند اس بار بھی ثمر آور رہی۔ سید سعید نقوی (ڈاکٹر) کمال کے قلم کار ہیں۔ سوچنا یہ ہے کہ وہ مریضوں کے لیے وقت کیسے نکالتے ہوں گے۔ شاید اُن کے مریض اس کے اُلٹ سوچتے ہوں۔ بلا کا ذہین، جہاندیدہ قلم کار اتنی کم عمر میں کام کے کُشتوں کے پشتے لگا کر بھی تازہ دم ہے۔ میری تمام دعائیں تم اور تمہاری تلاش کے نام۔ میری طرف سے ''پتلی تماشا'' جیسے افسانے پر سعید نقوی صاحب کو اضافی مبارکباد۔

تمہاری بابت اتنا قریب ہوتے ہوئے اندازہ لگانا مشکل ہے کہ تم اس قدر رنت نئے تجربات اور نئی نئی لفظیات کہاں سے تلاش لیتے ہو۔ ''تیسرا محلّہ'' بھی اس خوبی سے مالا مال ہے۔ اس بار ''قیدی نمبر ۲۳۴'' نام قدرِ مختلف ہے مگر کہانی مصنفہ کے مزاج سے کافی ہم آہنگ ہے۔ جیل کے ماحول کی جس طرح عکاسی کرتے ہوئے اہم موضوع کو اچھے ٹریٹمنٹ کے ساتھ پیش کر کے رینو بہل نے اردو ادب میں ایک عمدہ کہانی کا اضافہ کیا ہے۔ حسن منظر (ڈاکٹر) کے عمیق مشاہدات بہت سی زندہ حقیقتوں کی جانب خوش اسلوبی سے اشارہ کر رہے ہیں۔ شمع خالد نے ایک اہم مسئلے کو بہت عمدگی سے پیش کیا ہے جسے پڑھ کر محترمہ کی وسیع المشربی کا اندازہ ہوتا ہے۔

پروین شیر کا سفرنامہ، فیروز عالم (ڈاکٹر) کا ترجمہ اور اپنے اہلِ ٹھکّر کے ناول کا باب ایسی بولتی تخلیقات ہیں جنہیں کسی بھی ترقی یافتہ ملک اور علاقے کے ادب کے روبرو فخر سے پیش کیا جاسکتا ہے۔ شاعری میں بہت سی آوازیں توانا اور نیاپن لیے ہوئے ہیں۔ طبیعت تفصیل کی اجازت دیتی تو ضرور درج کرتا۔

یوگیندر بہل تشنہ (محوِ سفر)

مکرمی، محترمی گلزار جاوید صاحب، السلام علیکم۔

چہارسو بابت ماہ نومبر دسمبر نظر نواز ہوا۔ آپ جانیں میں نے پورا پرچہ لفظ بہ لفظ پڑھ لیا ہے۔ آپ کی محنت شاقہ صفحاتِ چہارسو سے بخوبی عیاں ہے۔ نثری اور منظوم تحریریں آپ کے انتخاب اور ادارتی اوصاف کی ازخود ترجمان اور آئینہ دار ہیں۔ نامی گرامی لکھاریوں اور تخلیق کاروں کے ہوتے چہارسو اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ میری ناقص رائے میں چہارسو ایسا محبوب اور مقبول ادبی جریدہ پوری اردو دنیا میں کوئی نہیں۔ اللہ عزوجل آپ کو اچھی صحت کے ساتھ طویل عمر عطا کرے تاکہ آپ اپنے مشن کو جاری وساری رکھیں۔

تصور اقبال (پنڈی گھیپ)

گلزار جاوید صاحب، آداب۔

سید سعید نقوی صاحب کے گوشے سے متعلق تمام تر مضامین جریدے کے پہلے سے قائم دائم معیار و وقار کے ہی بموجب ٹھہرتے ہیں اور شمارہ کلی طور پر قابلِ ستائش ہے۔ نقوی صاحب بلاشبہ اعلیٰ پائے کے ادیب، شاعر، ناول نگار اور مترجم ہیں اُن کی جتنی بھی سراہنا کی جائے کم ہے۔

مشرقی پنجاب کے حال ہی میں 'شرومنی اردو ساہتیہ کار' کے اعزاز سے نوازی گئیں ڈاکٹر رینو بہل کا اافسانہ زیرِ عنوان 'قیدی نمبر ۲۳۴' لاجواب افسانہ ہے جس میں عزیزہ نے ایک اہم مسئلے کی طرف بڑی عمدگی سے اشارہ کیا ہے۔ جناب شاہد جمیل اور منیرہ شمیم کے افسانے بھی اپنی طرز اور بیان کے حساب سے عمدہ افسانے گردانے جائیں گے۔

گلزار جاوید کا افسانہ زیرِ عنوان 'تیسرا محلّہ' بطور ایک قاری اس خاکسار کی 'تیسری آنکھ' ہی کھول گیا ہے۔ اس کا مطالعہ کرتے ہوئے ہمہ وقت عظیم افسانہ نگار و فنکار سعادت حسن منٹو کی روح ہی گویا میرے ساتھ مشافہہ (مصافحہ، مصاحبہ) کرتی رہی ہے۔ یہ افسانہ مطلق فحش نہ ہو کر ہوش رہا ہے۔ مستزاد علاوہ ازیں اس کا کسی چشم دید شاہد کی مانند بیان کردہ حقیقی ماحول ہندی کے دو بلند پایہ و مایہ ناز فکشن نگاروں شری کملیشور اور شری بھیشم ساہنی کی، طوائفوں کی حیات پر مبنی کہانیوں بالترتیب، 'مانس کا دریا' اور 'ابھی تو میں جوان ہوں' کی یاد کرانے والا قابلِ موازنہ ٹھہرتا ہے۔ مفلوک الحال کسبیوں کا لائق رحم رہن سہن اور انکی کارکردگی شہوت کو مہمیز کرنے کی بجائے محولہ تیسرے محلے کی روزمرہ کی حیات کو ہی شہرۂ آفاق منٹو جیسے عظیم افسانہ نگار کی روح کی ہی مانند ہمارے روبرو برہنہ لا کھڑا کرتی ہے۔ کردار نگاری و مختلف کرداروں ہی کے بموجب مکالمہ بندی و گفتگو وغیرہ سبھی کچھ لائقِ تحسین واقع ہوئی ہیں۔ ساحر لدھیانوی کی مشہورِ زمانہ نظم 'چکلے' کی بھی یاددہانی کرانے والا ہے یہ افسانہ۔

جناب گلزار جاوید، السلام علیکم۔

نومبر دسمبر ۲۰۱۵ء کا چہارسو ارسال فرمانے کا بے حد شکریہ۔ سعید نقوی دنیائے ادب کے سینئر قلم کاروں میں تو شامل نہیں ہوتے مگر اُن کی تخلیقات سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ایک باصلاحیت فنکار ہیں۔ چہارسو میں اُن کے نام قرطاسِ اعزاز اس بات کی دلیل ہے کہ ہمیشہ زرخیز زمینوں کی تلاش میں رہتے ہیں۔ انہیں اہلِ ادب سے متعارف کروانے میں آپ بڑی کشادہ دلی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ یہ بات باعثِ تسکینِ دل ونگاہ ہے۔ چہارسو کا ہر شمارہ ایک ادبی دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔ نسیم سحر کی حمد اور غالب عرفان کی نعت شریف عقیدتوں اور محبتوں میں ڈوبی ہوئی تخلیقات ہیں جو روحانی سکون کا باعث ہیں۔ افسانے سبھی کمال کے ہیں حسن منظر، محمد سعید شیخ، شمع خالد، ڈاکٹر رینو بہل، شاہد جمیل سب بے پناہ داد کے مستحق ہیں۔ آپ کا افسانہ ''تیسرا محلّہ'' ایسا افسانہ ہے جو سب سے مختلف رنگ ڈھنگ لیے ہوئے ہے۔ آپ نے جو زبان استعمال کی ہے وہ اسے ایک اچھوتے اسلوب کی تخلیق بناتی ہے۔ غزلیات کے دونوں حصوں میں قابلِ داد تخلیقات شامل ہیں۔ جناب نوید سروش کا غزل پسند کرنے کا شکریہ ادا کرنا بہت ضروری ہے۔

ابراہیم عدیل (جھنگ)

......غالب عرفان اور تخلیقی وجدان ......

نہ جانے یہ کس مفکر کا قول ہے کہ یہ دنیا محض اتفاقات سے وجود میں آئی اور اس کے اختتام تک محض اتفاقات پر ہی اس کا سفر جاری رہے گا، کوئی اتفاق اگر حسنِ اتفاق میں بدل جائے تو آدمی ذرّے سے آفتاب بھی بن جاتا ہے۔ بطور مسلمان اگرچہ میں اس دلیل کو نہیں مانتا لیکن اس حسنِ اتفاق کو کیا نام دوں جب مجھ سے محبت کرنے والے میرے نادیدہ ہمدم ودمساز محترم سید مسعود اعجاز بخاری سے شناسائی میرے ایک اور نادیدہ دوست مشہور افسانہ نگار محمد الیاس کے ذریعے صرف میری جواں سال بیٹی کی جواں مرگی کے سبب ایک بہانہ بن گئی۔ ۲۰۔اگست ۱۹۹۳ء کو ثمینہ غالب مجھ سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جدا ہوگئی تو مرحوم شبنم رومانی نے سہ ماہی ''اقدار'' (کراچی) میں دعائے مغفرت کی صورت یہ خبر شائع کی۔ خبر محمد الیاس (جو اُن دنوں میر پور آزاد کشمیر میں مقیم تھے) تک پہنچی تو ان کے ذریعے بخاری صاحب نے سنی اور مجھ کو ہمدردی اور غم گساری کا خط لکھتے ہوئے یہ بھی اطلاع دی کہ وہ میری شاعری کے ذریعے مجھے پہلے سے جانتے ہیں بس وہ دن اور آج کا دن ان کی نگاہِ باریک بیں نے میری شاعری کے ذریعے مجھے پہچانا۔ ان بیس برسوں کے دوران، پہلے مراسلت اور پھر موبائل کے ذریعے شناسائی دوستی میں تبدیل ہوئی پھر ایک انسان میں چھپے ہوئے جوہر کو بخاری صاحب نے ایک کتاب کا روپ دیا جو آج آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

......**غالب عرفان**

اشاعت: ۲۰۱۵ء، قیمت: ۴۰۰ روپے، دستیابی: الحمد پبلی کیشنز، کراچی۔

...... آدم اور خدا ......

امین الدین کے افسانوں کا ایک وصف یہ بھی ہے کہ وہ بیانیہ پر یقین رکھنے کے باوجود نرے سادہ بیانیہ سے بچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ محسوس ہوتا ہے کہ کوئی بھی کہانی جب ان کے بطون میں راہ پاتی ہے تو فوراً کاغذ پر منتقل نہیں ہو جاتی، بلکہ پہلے وہ اپنے تخلیقی اپچ سے کسی بھی واقعے کے گرد ایک دائرہ بنا کر اس کی حد بندی کرتے ہیں، اپنی فن کاری سے کردار میں رنگ بھرتے ہیں، پیش منظر اور پس منظر کی مدد سے واقعے میں کشمکش پیدا کرتے ہوئے اسے قدرے پیچیدہ بناتے ہیں اور پھر زبان کے استعاراتی نظام کے سہارے سماج میں بکھرے ہزاروں واقعات میں سے چنے ہوئے اس واقع پر اپنے رنگ برنگی پینٹ کی ہوئی شکلوں کے نقوش اُبھارتے ہیں۔ یعنی امین الدین افسانے کو کیمرے سے کھینچی ہوئی تصویر سے زیادہ مصور کی بنائی ہوئی پینٹنگ کے درجے پر لے جاتے ہیں۔

......**سلمان صدیقی**

اشاعت: ۲۰۱۵ء، قیمت: ۲۰۰ روپے، دستیابی: دراک (ادبی نشست) کراچی۔

...... سیماب ......

دنیا میں ظہور پذیر ہونے والے کارہائے نمایاں کبھی بھی بلند قامتی کے محتاج نہیں رہے جس کی ایک مثال اس وقت ہمارے روبرو قریب پانچ سو صفحات پر مشتمل گورنمنٹ ڈگری کالج بوائز، میر پور آزاد کشمیر کا سالانہ مجلّہ ''سیماب'' پیشِ نظر ہے۔ دیدہ زیب طباعت، نفیس کاغذ اور قیمتی جلد کے ساتھ پیشکش کا معیار بھی انتہائی اعلیٰ ہے۔ ہر چند اس طرح کے مجلّے ادارے کے طلبہ کی قلمی صلاحیتوں کے اجاگر کرنے کے لیے اشاعت پذیر ہوتے ہیں مگر کالج کے پرنسپل اور سیماب کے مدیرِ اعلیٰ پروفیسر غازی علم الدین صاحب نے اردو اور انگریزی ادب کے ہر فکر، مزاج اور معیار کی تخلیقات کو شاملِ اشاعت کر کے ''سیماب'' کی اس خاص اشاعت کو اُس بلند مقام پر پہنچا دیا ہے جسے دیکھ کر آپ کی طبیعت باغ باغ ہو جائے گی۔

......**صاعقہ انعام**

اشاعت: ۲۰۱۵ء، قیمت: ؟؟؟، دستیابی: گورنمنٹ ڈگری کالج (بوائز)، میر پور آزاد کشمیر۔

ماہنامہ
چہارسو
راولپنڈی
اقبال سیمینار
HASSAN ABEDI
Pak Shamaa School